www.KitaboSunnat.com
مکتبۃ الفہیم
MAKTABA AL-FAHEEM-MAU
60 باکمال خواتین
تالیف
مولانا محمد اسحاق بھٹی
مکتبۃ الفہیم
مئوناتھ بھنجن یوپی

60 باکمال خواتین

تالیف

مولانا محمد اسحاق بھٹی

مکتبۃ الفہیم
مئوناتھ بھنجن یوپی
MAKTABA AL-FAHEEM
Raihan Market, 1st Floor, Dhobia Imli Road
Sadar Chowk, Maunath Bhanjan - (U.P.) 275101
Ph.: (O) 0547-2222013, Mob. 9236761926, 9889123129, 9336010224
Email: faheembooks@gmail.com
WWW.faheembooks.com

نام کتاب : 60 باکمال خواتین

تالیف : مولانا محمد اسحاق بھٹی

طابع وناشر : مکتبۃ الفہیم مئوناتھ بھنجن یوپی

تعداد اشاعت : ایک ہزار ایک سو

سال اشاعت : اپریل ۲۰۱۲ء

صفحات : 288

باہتمام

شفیق الرحمٰن، عزیز الرحمٰن

مکتبۃ الفہیم
مئوناتھ بھنجن یوپی

MAKTABA AL-FAHEEM
Raihan Market, 1st Floor, Dhobia Imli Road
Sadar Chowk, Maunath Bhanjan - (U.P.) 275101
Ph.: (O) 0547-2222013, Mob. 9236761926, 9889123129, 9336010224
Email: faheembooks@gmail.com

فہرست

کلمۃ الناشر

تاریخ کے ہر دور میں لوگوں نے اپنے آباء واجداد کے اچھے کارناموں، ان کی شجاعت وسخاوت، عادات واخلاق اور فضائل کو یاد کیا ہے اور اسے فخریہ بیان کرتے ہوئے دوسروں پر انہیں فوقیت دی ہے۔ مشہور عربی شاعر فرزدق نے اپنے آباء واجداد کے کارناموں پر فخر کرتے ہوئے کہا تھا:

اولٰئك آباء ی فجئني بمثلهم　　　　اذا جمعتنا یا جریر المجامع

مذہب اسلام کے ماننے والوں کی بھی ایک عظیم اور مثالی تاریخ ہے اور اس تاریخ میں نہ صرف یہ کہ مردوں کے کارنامے ہیں بلکہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کے بھی حیرت انگیز وقابل ذکر کارنامے ہیں۔

مسلم خواتین نے نہ تو ترکِ دنیا کیا ہے نہ رہبانیت اختیار کی ہے نہ ننوں (عیسائی راہبہ) کی طرح فرائض نسل سے اپنے آپ کو بیزار رکھا ہے نہ ہی دیوداسیوں کی طرح پتھر کی مورت کے ساتھ رشتہ زوجیت میں منسلک ہوئی ہیں۔ بلکہ کامیاب ازدواجی زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ شجاعت وسخاوت، تقویٰ وپرہیزگاری، حق گوئی وخدمت خلق کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔ ان کے اندر اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ سارا نسلی غرور خاک میں مل گیا اور دین پسندوں کی وہ عزت ان کے دل میں سما گئی کہ صرف غلام ہی نہیں بلکہ غلام ابن غلام کی زوجیت میں رہنا ان کے لئے باعث افتخار بن گیا۔

اسلامی تاریخ اس بات پر بھی شاہد ہے کہ کسی عام عورت نے نہیں وقت کی ملکہ نے وہ کام کیا ہے جس کی مثال دنیا کی کوئی تاریخ پیش نہیں کر سکتی ہے۔ جو شخص میدان احد تک اپنی علمی نگاہ وسیع کرے گا وہ دیکھے گا کہ بادشاہ وقت کی بیوی، چہیتی ملکہ اور تمام مومنوں کی ماں کندھے پر مشک اٹھائے ہوئے ہے ہر ایک مجاہد کو پانی پلا رہی ہے اور زخمیوں کے منھ میں قطرہ قطرہ پانی ٹپکا رہی ہے۔ کیا کسی دنیوی بادشاہ کی ملکہ نے کبھی تاریخ کے کسی دور میں ایسا عملی نمونہ پیش کیا ہے۔

اسلامی تاریخ میں ایسی خواتین بھی گزری ہیں جن کے سامنے اچھے سیاستداں اور حرب وضرب کے ماہر اپنے آپ کو بے بس پاتے تھے ان کی زبان کی کاٹ تلوار سے تیز تھی اور بعض کے اشعار دشمن کے لئے شمشیر برہنہ سے کم نہ تھے۔ایک بہادر خاتون نے بنوامیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ خلافت کے حق دار نہیں ہیں اور اتنا بڑا اعزاز انہیں زیب نہیں دیتا۔تاریخ میں ایسی خواتین کا بھی ذکر ملتا ہے جنھوں نے شاہی غیظ و غضب کی بھی پرواہ نہیں کی ہے اور شاہی خاندان کے بعض خودسر افراد کے غرور وتمکنت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ایک خاتون نے بادشاہ کے شادی کے پیغام کو ٹھکرا دیا تھا اور جب اس نے اپنے آپ کو بے بس محسوس کیا تو بادشاہ کو اس اقدام سے باز رکھنے کے لئے اپنے تمام دانت اکھڑوا ڈالے اور سر کے بال کٹوا دیے اور بادشاہ کے دربار میں ایک بدصورت عورت کی شکل میں حاضر ہوگئی۔بعض خواتین نے ملکی سیاست میں بھی حصہ لیا ہے اور اپنی عقل ودانش سے مملکت کی بہت سی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا ہے۔فتنوں کی سرکوبی اور باطل فرقوں کے سرگرمیوں کی مخالفت وتردید میں بھی عورتوں کی کارکردگی سے تاریخ کے صفحات خالی نہیں ہیں۔ایک جنگ میں تنہا ایک خاتون نے نو رومی عیسائیوں کو قتل کیا ہے۔

زیر نظر کتاب میں ایسی ہی چند باکمال خواتین کا تذکرہ ہے۔یہ دراصل کوئی مستقل تالیف نہیں ہے بلکہ مورخ شہیر اور عالم کبیر مولانا محمد اسحاق بھٹی کی ایک شہرۂ آفاق کتاب کا منتخب حصہ ہے۔جسے ''ساٹھ باکمال خواتین'' کے نام سے شائع کیا جارہا ہے کتاب کو مزید بہتر اور جاذب بنانے کے لئے معمولی سا اضافہ ہے جو دراصل مولانا ہی کی تحریر سے مستفاد ہے۔

مکتبہ الفہیم.مئو کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ کتاب طباعتی نقائص سے پاک ہو اور ہدیہ کم سے کم ہوتا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہوسکیں۔اسی لئے اس نے مطول کتابوں کے ساتھ ساتھ مختصر کتابوں کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا ہے جسے طلبہ ایڈیشن بھی کہا جاسکتا ہے۔یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے امید کہ اسے بنظر تحسین دیکھا جائے گا اور بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔

مدیر

مکتبہ الفہیم.مئو

20-07-2012

حضرت خنساء رضی اللہ عنہا

وہ خاتون شاعرہ جس کے مرتبہ کی نہ کوئی شاعرہ پیدا ہوئی ہے نہ ہوگی۔

''جب تم دیکھو کہ لڑائی پورے زور سے شروع ہوگئی ہے، آتشِ جنگ کے شعلے چاروں طرف بھڑکنے لگے ہیں اور اس کے خوفناک شرارے پوری طاقت سے میدانِ محاربہ میں پھیل گئے ہیں تو لڑائی میں کود پڑو، بے جگری سے لڑو، شمشیر خاراشگاف کو ہاتھ میں تھام کر دشمنانِ اسلام کی بیخ کنی کرتے ہوئے مسلسل آگے بڑھتے جاؤ اور فتح و کامرانی کے لئے آخری سہارا اللہ کی ذاتِ اقدس کو سمجھو، ان شاء اللہ ضرور کامیابی سے ہم کنار ہوگے۔ دشمن کے مقابلے میں میدانِ جنگ میں جیت جانا بھی کامیابی ہے اور درجۂ شہادت پر فائز ہوجانے کو بھی فتح و نصرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جاؤ ان دو نعمتوں میں سے جو بھی حاصل کرسکتے ہو کرلو، میں تمہاری وجہ سے اسلام کی سربلندی کی خواہاں ہوں''۔

یہ وہ الفاظ ہیں جو عرب کی مشہور شاعرہ خنساء نے اپنے چاروں بیٹوں کو قادسیہ کے محاذِ جنگ پر روانہ کرتے ہوئے کہے۔

خنساء کا اصلی نام تماضر تھا، چونکہ بڑی چست، بڑی مستعد، تیز طرار اور ذہین وخوب رو خاتون تھیں، اس لئے خنساء کے لقب سے معروف ہوئیں جس کے معنی ہرنی کے ہیں، نجد کی رہنے والی تھیں۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: خنساء بنت عمرو بن الشرید بن رباح بن یقظہ بن عصبیۃ بن خفاف بن امراء القیس، قبیلہ قیس کے خاندان بنو سلیم سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس خاتون کے دو نکاح ہوئے۔ پہلا بنو سلیم کے ایک شخص رواحہ بن عبدالعزیز سے ہوا۔ اس کے انتقال کے بعد دوسری مرتبہ مروان بن ابوعامر کے عقد میں

آ ئیں۔ پہلے شوہر سے ایک لڑکا عبداللہ پیدا ہوا۔ دوسرے شوہر سے دو لڑکے یزید اور معاویہ اور ایک لڑکی عمرہ پیدا ہوئی۔

عرب کی اس نامور اور مشہور شاعرہ کا سلسلۂ نسب ساتویں پشت سے عرب کے شہرۂ آفاق شاعر امراء القیس سے جا ملتا ہے۔ خنساء کی شاعری کی بڑی دلچسپ داستانیں تاریخ وسیرت کی مستند کتابوں میں مرقوم ہیں اور بڑے بڑے جلیل القدر شاعروں نے اس کی عظمتِ شعری کا لوہا مانا اور فصاحت وبلاغت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ جریر عہدِ بنوامیہ کا مشہور شاعر تھا جو ۱۱۰ ہجری میں فوت ہوا۔ اس سے جب پوچھا گیا کہ عرب کا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا، اگر خنساء کے اشعار میری نظر سے نہ گزرتے تو میں عرب کا بہت بڑا شاعر ہونے کا دعویٰ کرتا۔

اسد الغابۃ میں لکھا ہے کہ ناقدانِ سخن کا یہ فیصلہ ہے کہ خنساء کے مرتبے کی نہ کوئی عورت شاعرہ پیدا ہوئی ہے نہ ہوگی۔

بشار عرب کا ایک عظیم شاعر گزرا ہے، اس کا کہنا ہے کہ میں عورتوں کے اشعار غور سے پڑھتا ہوں تو ان میں کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور پاتا ہوں، لوگوں نے پوچھا کیا خنساء کے اشعار میں بھی کمزوری پائی جاتی ہے؟ کہا نہیں۔ وہ تو مردوں سے بھی بلند درجے کے شعر کہتی ہے۔

لیلیا ءاخیلیہ کو شعراء عرب نے متفقہ طور پر فن شعر گوئی میں تمام عورتوں پر ترجیح دی تھی، لیکن جب خنساء کے اشعار سامنے آئے تو یہ درجہ فضیلت خنساء کو حاصل ہو گیا۔

دورِ جاہلیت میں اہلِ عرب میں یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ مختلف مقامات پر شعر وشاعری کی مجلسیں آراستہ کرتے تھے۔ ان مجلسوں میں مرد اور عورتیں برابر کی سطح پر حصہ لیتے تھے۔ ربیع الاول کے مہینے میں جب کہ موسم بہار کا آغاز ہوتا تھا، یہ مجلسیں جمنا شروع ہو جاتی تھیں۔ اس ضمن کی پہلی مجلس دولۃ الجندل میں ہوتی، اس کے بعد سوق ہجر میں،

پھر عمان میں، حضر موت میں، پھر صنعا میں اور پھر جب ذیقعدہ کا مہینہ شروع ہو جاتا اور لوگ حج کے لئے مکہ مکرمہ کی طرف آنا شروع ہو جاتے تو مکے سے چند میل کے فاصلے پر سوقِ عکاظ میں آخری مجلس آراستہ ہوتی۔ اس میں تمام عرب قبائل کے سردار اور سرکردہ لوگ حاضر ہوتے اور اگر کسی وجہ سے کوئی سردار حاضری دینے سے معذور ہوتا تو اپنا نمائندہ بھیج دیتا۔ اس میں اہلِ عرب کے بڑے بڑے فیصلوں کو آخری شکل دی جاتی تھی اور تمام شعراء عرب اپنا کلام سناتے تھے، جس میں اپنی شجاعت و بسالت، فیاضی و سخاوت اور اپنے آباء واجداد کے کارنامے بیان کئے جاتے تھے۔ یہاں شعراء کو ان کی قابلیت کے مطابق انعامات دیے جاتے اور ان کے درجات و مراتب مقرر کئے جاتے تھے۔

خنساء بھی ہر سال باقاعدہ ان مجالس میں شریک ہوتی تھی اور اس کے مرثیے بے نظیر سمجھے جاتے تھے۔ جب وہ اپنے اونٹ پر سوار ہو کر آتی تو تمام شعراء اس کے گرد حلقہ باندھ لیتے اور اس کے اشعار سننے کے لئے بے قرار ہو جاتے۔ وہ اپنے شعر سناتی اور مرثیے پڑھتی تو لوگ جھوم جھوم جاتے اور خوب داد دیتے۔ خنساء کو اس مجلس شعراء میں یہ امتیاز اور فخر حاصل تھا کہ اس کے خیمے کے دروازے پر ایک علم نصب کیا جاتا، جس پر ارثی العرب لکھا ہوتا تھا۔ یعنی یہ عرب کی سب سے بڑی مرثیہ گو شاعرہ ہے۔

عرب کا ایک بہت مشہور شاعر زیاد بن معاویہ گزرا ہے، جس کی کنیت ابوامامہ تھی اور وہ نابغہ ذبیانی کے نام سے مشہور تھا۔ کثرتِ شعر گوئی اور نکتہ رسی کی وجہ سے اسے نابغہ کہا جاتا تھا۔ وہ خنساء کے اشعار بہت پسند کرتا اور اسے کھل کر داد دیتا۔ اس نے خنساء سے کہا تم اس وقت جنوں اور انسانوں کی مخلوق میں بہت بڑی شاعرہ ہو۔ تمہارے جیسی سخن ور آج تک پیدا نہیں ہوئی۔

خنساء کے دو بھائی تھے جو اس سے عمر میں بڑے تھے۔ ایک کا نام معاویہ تھا، ایک کا صخر، ان کے والد کا نام عمرو تھا جو قبیلہ بنو سلیم کا رئیس تھا اور اپنے قبیلے میں بڑی

وجاہت وعزت کا مالک تھا۔ وہ خنساء کے عالم جوانی کو پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے بھائیوں نے اپنی اس چھوٹی بہن کی اس طرح تربیت کی کہ باپ کی وفات کا صدمہ اس کے دل سے نکل گیا۔

والد کی وفات کے بعد اس کی شادی اس کے قبیلے کے ایک شخص عبدالعزیٰ (ایک روایت کے مطابق رواحہ بن عبدالعزی) سے ہوئی۔ اس سے خنساء کا ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام ابوشجرہ، عبداللہ رکھا گیا تھا۔ عبدالعزی شادی سے تھوڑا عرصہ بعد فوت ہو گیا تھا۔ پھر وہ اسی قبیلے کے ایک شخص مرواس بن ابوعامر کے عقد میں چلی گئی۔ اس سے تین بیٹے پیدا ہوئے، ان کے نام علی الترتیب یہ تھے: عمرو، زید اور معاویہ۔ ایک لڑکی پیدا ہوئی، اس کا نام عمرہ تھا۔ اس کے بعد خنساء نے شادی نہیں کی، شعروشاعری ہی کو اس نے اپنا مشغلہ قرار دے لیا۔

پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ وہ عرب کی بہت بڑی مرثیہ گو ہو گئی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عکاظ کے میلے میں اس کے بھائی معاویہ کا، قبیلہ بنومرہ کے ایک شخص ہاشم بن حرملہ سے جھگڑا ہو گیا۔ اس نے ہاشم سے انتقام لینے کے لئے اپنے چند ہم نواؤں کے ساتھ بنومرہ کے قبیلے پر حملہ کر دیا۔ فریقین میں لڑائی ہوئی تو ہاشم کے بھائی درید نے معاویہ کو قتل کر دیا۔ پھر معاویہ کے بھائی صخر نے اس کا بدلہ لینے کا عزم کیا اور نتیجۃً درید کو قتل کر دیا۔ اس سے کچھ عرصہ بعد اس نے درید کے بھائی ہاشم کو بھی موت کا لقمہ بنا دیا۔ ان کے قتل کے بعد صخر کا غصہ ختم نہیں ہوا، وہ برابر قبیلہ بنومرہ کے لوگوں پر حملے کرتا رہا۔ بنومرہ کا حلیف قبیلہ بنواسد تھا۔ موقع پا کر بنواسد کے ایک شخص فقعس نے صخر پر حملہ کر کے اسے شدید زخمی کر دیا۔ خنساء نے بھائی کا بہت علاج کرایا۔ مگر کوئی علاج کارگر نہ ہو سکا اور وہ مر گیا۔ خنساء کو بھائی کی موت کا شدید صدمہ پہنچا اور اس صدمے نے مرثیہ گوئی کی شکل اختیار کر لی۔ پھر اس کی مرثیہ گوئی نے بے حد شہرت پائی۔ معاملہ یہاں تک

پہنچا کہ اس دور کے تمام عرب شعراء نے اس کی فصاحت و بلاغت کا لوہا مانا اور اس کی قادرالکلامی کے آگے سر عجز جھکا دیا۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ بھائی کی موت پر خنساء کے جذبات کا بند ٹوٹ گیا اور شدتِ غم نے ایسے مرثیے کی شکل اختیار کرلی کہ اسے سن کر تمام عرب میں اس پر اظہارِ افسوس کیا گیا۔ جب خنساء کی دردناک آواز فضا میں گونجتی تو سننے والوں پر سکتے کا عالم طاری ہوجاتا۔ وہ صخر کی قبر پر کھڑے ہوکر ایسے دل سوز اور جاں گداز لہجے میں مرثیہ پڑھتی کہ معلوم ہوتا دنیا کی ہر شے غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ مرثیے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اعینی جودا و لا تجمدا — الا تبکیان الصخر الغدی
الا تبکیان الجری الجمیل — الا تبکیانالفتی السیدی
طویل النجاد عظیم الرماد — وساد عشرته امردا
اذا القوم مدوا بایدھم — الی المجد مد الیه یدا
فنال الذی فوق ایدیهم — الی المجد ثم مضی سعدا

اب ان اشعار کا ترجمہ سنئے:

اے میری دونوں آنکھو! خوب سخاوت کرو، بخیل نہ بن جاؤ، کیا تم صخر پر نہیں روؤ گی جو بہت بڑا سخی تھا۔

کیا تم ایک دلیر اور خوب صورت شخص پر ماتم نہیں کروگی۔
کیا تم اس سردار پر آنسو نہیں بہاؤ گی جو بلند و بالا تھا اور اونچے مرتبے کا مالک تھا۔
وہ چھوٹی عمر ہی میں اپنے قبیلے کا رہنما اور قائد مقرر ہوگیا تھا۔
جب اس کے قبیلے نے ہاتھ دراز کیے تو اس نے بھی کردیئے
پھر اس نے وہ عزت حاصل کرلی جو ان لوگوں کے ہاتھوں سے بلند تر تھی۔

اور وہ اسی سعادت وعزت کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ایک طویل مرثیے کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

الا یا صخر ان ابکیت عینی فقد اضحکتنی زمنا طویلا

اے صخر! اگر تو نے میری آنکھوں کو رلایا ہے تو کیا ہوا، ایک عرصہ دراز تک تو نے ان کو ہنسایا بھی تو ہے۔

یہاں ایک دلچسپ واقعہ سنتے جایئے۔ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے عکاظ کے میلے میں اس دور کا بہت بڑا شاعر نابغہ ذبیانی بڑی شان سے آیا کرتا تھا، وہ عرب کے تمام شاعروں میں انفرادیت میں مشہور تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ سرخ رنگ کا شان دار خیمہ اس کے لئے نصب کیا جاتا تھا۔ بڑے بڑے شعراء اس کے سامنے سر جھکا کر بیٹھتے اور اپنا کلام سنانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ خنساء پہلی دفعہ اس میلے میں آئیں اور اسے اپنا کلام سنایا تو نہایت متعجب ہوا، اور کہا بلاشبہ تو عورتوں میں بہت بڑی شاعرہ ہے۔ اگر میں نے اس سے پہلے ابو بصیر (یعنی اعشیٰ) کے اشعار نہ سنے ہوتے تو تمہیں اس عہد کے تمام شعراء سے بہتر قرار دیتا۔

منقول ہے کہ اس وقت حضرت حسان بن ثابت بھی وہاں موجود تھے، جنھیں دورِ جاہلیت میں بھی عرب شعراء نے عظیم شاعر گردانا تھا اور پھر زمانۂ اسلام میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی مداحی میں جو اشعار کہے، ان کا تو اسلامی تاریخ کی شاعری میں کوئی جواب ہی نہیں۔

انھوں نے نابغہ ذبیانی کی زبان سے خنساء کے اشعار کی تعریف سنی تو طیش میں آ گئے اور کہا: ''میں خنساء سے بہتر شعر کہتا ہوں''۔

نابغہ ذبیانی نے یہ الفاظ سن کر حسان سے تو کچھ نہیں کہا، البتہ خنساء کی طرف دیکھا۔

خنساء نے حسان سے کہا: ''آپ اپنے قصیدے کے جس شعر کو سب سے زیادہ

بہتر قرار دیتے ہیں، وہ پڑھئے''۔

حسان نے فوراً شعر پڑھا جو ان کے نزدیک سب سے اچھا تھا۔

لنا الجفنات الغر یلمعن فی الضحی
و اسیافنا یقطرن من نجدة دما

یعنی ہمارے پاس بڑے بڑے صاف شفاف برتن ہیں جو چاشت کے وقت چمکتے ہیں اور ہماری تلواریں بلندی سے خون ٹپکاتی ہیں۔

شعر سن کر خنساء نے کہا: ''یہ شعر سات مقامات پر بلندی سے گر گیا ہے'' اب وہ مقامات کی نشاندہی کرتی ہیں۔

۱۔ ''جفنات'' کا لفظ دس سے کم پر بولا جاتا ہے، اس کی جگہ مناسب لفظ ''جفان'' تھا۔

۲۔ ''غر'' کے معنی ہیں، پیشانی کی سفیدی، اس کے بجائے ''بیض'' ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔

۳۔ ''یلمعن'' عارضی چمک کو کہا جاتا ہے۔ یہاں ''یشرقن'' ہوتا تو بہت مناسب رہتا، اس لئے کہ ''لمعان'' کی بہ نسبت ''اشراق'' زیادہ دیرپا ہے۔

۴۔ ''الضحیٰ'' سے ''الدجیٰ'' زیادہ موزوں تھا، کیونکہ روشنی، سیاہی میں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔

۵۔ ''اسیاف'' کا اطلاق جمع قلت پر ہوتا ہے۔ اس کے بجائے ''سیوف'' استعمال کرنا چاہئے تھا۔

۶۔ ''یقطرن'' میں وہ خوبی نہیں پائی جاتی جو ''یسلن'' میں پائی جاتی ہے۔ لہٰذا یقطرن کے بجائے یسلن زیادہ مناسب تھا۔

۷۔ ''دم'' کی جگہ ''دماء'' ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ اس میں ''کثرت'' کے معنی پائے جاتے ہیں۔

حضرت حسان نے خنساء کے یہ اعتراضات سنے اور خاموش رہے۔

خنساء کے ادب وشعر کے بارے میں بہت سی باتیں اسلامی تاریخ کی کتابوں میں مرقوم ہیں، جن میں بعض پہلے گزر چکی ہیں، کچھ ذیل میں بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ جریر جو ۱۱۰ ہجری میں فوت ہوا دورِ بنوامیہ کا معروف وممتاز شاعر تھا۔ اس سے کسی نے پوچھا:

''اس وقت عرب کا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟''

جواب دیا ''اگر خنساء نہ ہوتی تو عرب کا سب سے بڑا شاعر میں تھا''۔

۲۔ بشار بن بردنہ ایک عظیم شاعر تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ میں عورتوں کے اشعار دیکھتا ہوں تو ان میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور پاتا ہوں۔ اس سے پوچھا گیا:

''کیا خنساء کے اشعار میں بھی کوئی نقص پایا جاتا ہے؟''

بولا: وہ تو شعر گوئی اور حسنِ کلام میں مردوں سے بھی بازی لے گئی ہیں۔

۳۔ عبد بنوامیہ کا ایک شاعر اخطل تھا جسے نابغہ ذبیانی کے مرتبے کا شاعر سمجھا جاتا تھا۔ وہ خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دربان میں حاضر ہوا اور ان سے قصیدہ مدحیہ پیش کرنے کی اجازت طلب کی۔ عبدالملک نے کہا: تمہارا مقصد بہادری اور بے خوفی میں مجھے شیر مار، سانپ اور چیتے وغیرہ سے تشبیہ دینا ہے تو میں اس قسم کے شعر سننا نہیں چاہتا۔ البتہ اگر خنساء کی طرح کے اشعار سنانا چاہتے ہو تو ضرور سناؤ۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خنساء کب پیدا ہوئیں؟ کہاں پیدا ہوئیں؟ عرب کے کس قبیلے اور علاقے سے ان کا تعلق تھا اور کب مسلمان ہوئیں؟

ان سوالات کا جواب یہ ہے کہ خنساء نبی ﷺ کی ہجرت سے کم وبیش پچاس برس قبل پیدا ہوئیں۔ قبیلہ بنوسلیم کی رکن تھیں جو علاقہ نجد میں واقع تھا اور سخاوت وجودت اور شجاعت وبسالت میں عرب کا مشہور قبیلہ تھا اور بنوقیس بن عیلان کی شاخ تھا۔ قبیلہ

بنو قیس بن عیلان کے بارے میں نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

ہر قوم کی ایک پناہ گاہ ہوتی ہے، عرب کے پناہ گاہ قیس بن عیلان ہے۔

آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا مطلب بالکل واضح ہے کہ عرب کے جن لوگوں کو کسی قسم کی کوئی ضرورت پیش آئے وہ مالی ضرورت ہو یا امداد و نصرت کے لئے افراد کی ضرورت ہو، وہ قبیلہ قیس بن عیلان کے پاس چلے جائیں اور ان سے اپنی ضرورت بیان کریں وہ لازماً ان کی امداد کرتے ہیں۔

اسلام کی آورد جب علاوہ نجد میں پہنچی اور خنساء کو نبی ﷺ کی بعثت کا پتا چلا اور معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے ہیں تو انھوں نے اپنے قبیلے کے کچھ لوگوں سے بات کی اور مدینہ منورہ پہنچ گئیں۔ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ آپ سے گفتگو کی۔ وہ بولتی گئیں اور آنحضرت سنتے رہے۔ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آنحضرت ان کی ہر بات پر خوش ہوتے، انھیں داد دیتے اور ان کے اندازِ کلام کی تحسین فرماتے۔

آنحضرت سے بات چیت کے بعد انھوں نے اسلام قبول کرلیا اور واپس اپنے قبیلے میں چلی گئیں۔ وہاں کے لوگوں کو قبولِ اسلام کی ترغیب دی اور وہ لوگ مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد بھی مدینہ منورہ میں ان کی آمد و رفت رہی اور انھوں نے آنحضرت کی خدمتِ اقدس میں حاضری دی۔

حضرت خنساء رضی اللہ عنہا اسلام لے آئیں اور اس کے احکام پر عمل کرنے لگیں، لیکن بھائی کی یاد ان کے دل میں بہ دستور رہی۔ زمانۂ جاہلیت میں عورتیں کسی کا سوگ کرتیں تو سر پر بالوں کا گچھا باندھ لیتی تھیں۔ حضرت خنساءؓ بھی اپنے بھائی صخر کے سوگ میں اس طرح کا گچھا باندھے رکھتیں۔ ایک مرتبہ وہ بیت اللہ کا طواف کر رہی تھیں کہ حضرت عمر کی نظر ان کے گچھے پر پڑی۔ انھوں نے ان کو بلایا اور فرمایا:

اسلام اس قسم کے سوگ اور افسوس کی اجازت نہیں دیتا۔

عرض کیا: امیر المومنین جس غم اور افسوس میں میں مبتلا ہوں، اسے میں ہی جانتی ہوں: خدا کرے کوئی عورت اس قسم کے شدید غم میں مبتلا نہ ہو، حضرت عمر نے اسے تسلی دی اور فرمایا لوگوں پر بڑی بڑی مصیبتیں آئی ہیں اور انھوں نے برداشت کی ہیں۔تم بھی برداشت کرو، لیکن افسوس کے اس طریقے سے اسلام نے منع فرمایا ہے، اسے ترک کردو۔اس کے بعد انھوں نے بالوں کا گچھا اتار دیا اور بھائی کے افسوس کا دوسرا طریقہ اختیار کرلیا۔وہ بھائی کو یاد کرکے روتی بھی تھیں اور ساتھ ساتھ یہ شعر بھی پڑھتی تھیں۔

کنت ابکی له من الثار و انا الیوم ابکی له من النار

یعنی میں پہلے اپنے بھائی صخر کو بدلہ لینے کے لئے رویا کرتی تھی اور اب اس لئے روتی ہوں کہ وہ قتل ہوگیا۔لیکن اسلام نہ لا سکا، اب وہ جہنم کی آگ میں جلتا ہوگا۔

خنساء ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا کرتی تھیں۔

انھوں نے بھی ان کو سر پر بالوں کا گچھا باندھنے سے منع فرمایا۔بہر حال انھوں نے اسے ترک کردیا تھا اور اللہ کی رضا کو تمام معاملات میں مقدم اور اصل قرار دے لیا تھا۔

خنساء صرف شاعرہ اور مرثیہ گو ہی نہ تھیں۔بہت بڑی بہادر اور جرأت مند بھی تھیں اور شجاعت و دلیری کی وہ تمام صفات اس میں جمع ہوگئی تھیں جو عربوں کا طرۂ امتیاز ہے۔چنانچہ ۱۶ ہجری میں حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جب قادسیہ کا معرکہ کارزار گرم ہوا تو خنساء اپنے چاروں بیٹوں کو لے کر میدان جنگ میں پہنچیں اور انھیں محاذ پر روانہ کرتے ہوئے نہایت شجاعانہ اور پر جوش تقریر کی جس کے چند جملے یہ ہیں۔

میرے پیارے بیٹو! تم اپنے دل کی گہرائیوں سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے ہو اور اپنی رضا مندی سے راہِ خدا میں ہجرت کرکے آئے ہو، تم پر کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں کیا گیا۔یاد رکھو اللہ کے سوا کوئی دوسرا لائقِ عبادت نہیں، جس طرح تم ایک ماں کے بیٹے ہو

اسی طرح ایک ہی باپ کے فرزند ہو۔ میں نے نہ کبھی تمہارے باپ سے خیانت کی اور نہ تمہارے ننھیال کو رسوا کیا۔ تمہارا نسب بے داغ اور تمہارا حسب بے عیب ہے۔ تم خوب جانتے ہو کہ مسلمانوں پر اللہ کی طرف سے مخالفینِ اسلام کے خلاف جہاد کرنا فرض ٹھہرایا گیا ہے۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ عالمِ جاودانی کے مقابلے میں یہ دنیائے فانی ہیچ ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: مسلمانو اللہ کی راہ میں تمہیں جو پیش آئے انھیں برداشت کرو اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو۔ آپس میں مضبوط رابطہ قائم رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو، تا کہ تم کامیابی کی دولت بے پایاں سے بہرہ ور ہو جاؤ۔

میرے دل کے ٹکڑو! دشمن سے پنجہ آزمائی کرنے اور اس سے تیغ زن ہونے میں صرف ایک رات کا فاصلہ باقی ہے۔ جوں ہی چہرۂ شب سے یہ پردۂ سیاہ اترا، تم دشمن کے مقابلے میں کھڑے ہوگے۔ سورج کی روشن اور تابناک کرنیں تمہاری شمشیر خارا شگاف کے جوہر دیکھنے کے لئے بے تاب ہیں۔ تمہارے اندر پاکیزہ خون گردش کناں ہے، بہادری تمہارا شیوہ اور لڑائی تمہارا پیشہ ہے۔

جب دیکھو کہ معرکۂ کارزار پورے جوبن پر آ گیا ہے، لڑائی کے ہولناک شعلے چار سو بھڑک اٹھے ہیں اور میدان جنگ میں آگ برسنے لگی ہے اور خون کے فوارے چھوٹنے لگے ہیں تو پورے زور سے لڑائی میں گھس پڑو۔ انتہائی بے جگری سے لڑو اور بے دریغ تیغ زنی کرو۔ لڑائی میں کود کر فتح وشکست پر نظر مت رکھو۔ نتائج اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اسی سے فتح کے طالب رہو۔

میرے جگر گوشو! اسلام کی حمایت تمہارا فرض اولین ہے۔ یہ زندگی عارضی ہے۔ بہادر کے لئے بستر کی موت عار ہے اور میدان جنگ کی موت اس کا زیور ہے۔

ایک بات اور یاد رکھو! جب تم میدان جنگ میں اترو تو کسی بزدل سے مقابلہ نہ کرو، اس سے لڑنا یا اسے مار دینا شجاعت نہیں، کسی بہادر اور جنگ جو کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈالنا اور اس کے سامنے اپنی تیغِ آب دار کے جوہر کا مظاہرہ کرنا ہی بہادری ہے۔اس لئے مقابلے کے لئے بہادر دشمن کا انتخاب کرو۔

جاؤ میرے دودھ کی لاج اور اپنے خاندان کے خون کی آبرو رکھنا۔مسلمان کے لئے شہادت کی موت افضل ترین موت ہے۔

حضرت خنساء کے یہ بیٹے جنگ قادسیہ سے پہلے بھی کئی جنگوں میں حصہ لے چکے اور دادِ شجاعت دے چکے تھے، اب جنگ قادسیہ میں یہ شہید ہو گئے تھے۔ان کی شہادت کی خبر خنساء کو پہنچی تو کہا: **الحمد لله الذی شرفنی بقتلهم۔**

اللہ کا شکر ہے، جس نے مجھے ان کی شہادت کے شرف سے نوازا۔

حضرت خنساء نے جنگ قادسیہ کے سات سال بعد ۲۴ ہجری کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں وفات پائی۔ایک روایت کے مطابق بہ عہد حضرت معاویہ کسی بادیہ میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔

☆☆☆

حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیقؓ

وہ بہادر خاتون جس نے جنگ یرموک میں اکیلے نو رومی عیسائیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

"اے میرے لختِ جگر! تم اپنے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہو، اپنے دل سے پوچھ کر فیصلہ کرو، اگر تمہیں یہ یقین ہے کہ تم حق پر ہو اور حق و صداقت ہی کی دعوت دیتے ہو تو اسی جادۂ مستقیم پر گامزن رہو۔ تمہارے رفقاء نے اسی راہ حق پر چلتے ہوئے اپنی جانیں قربان کی ہیں۔ تم ذلیل چھوکروں کو اپنی گردن سے کھیلنے کا موقع نہ دو اور ان کے سامنے ہرگز سر نہ جھکاؤ۔

اگر تمہارا مقصدِ طلب دنیا ہے تو تم اس دنیا کے بدترین انسان ہوگے۔ یاد رکھو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم نے اپنے آپ کو بھی برباد کیا اور اپنے مقتول رفقاء کے لئے بھی سامان بربادی بہم پہنچایا۔

اور اگر تم یہ سمجھو کہ درحقیقت تم ہو تو حق پر ہی لیکن جب تمہارے ساتھی کمزور پڑ گئے تو تمہارا دل بھی بجھ گیا، تو یہ اور بھی غلط بات ہے۔ یاد رکھو حریت پسندوں اور اہلِ دین کو یہ چیز زیب نہیں دیتی۔ یہ عذر قابل قبول نہیں ہے۔ بتاؤ تم کب تک اس دنیا میں زندہ رہوگے۔ ذلت کی زندگی سے موت بدرجہا بہتر ہے"۔

یہ الفاظ اسلام کی ایک بہادر اور غیرت مند خاتون حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے اپنے بیٹے عبداللہ بن زبیر کو دشمن کے مقابلے میں روانہ کرتے ہوئے کہے۔

یہ طویل قامت اور بھرے ہوئے جسم کی خوب رو خاتون خلیفۂ اول حضرت

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔ ہجرت سے ستائیس سال قبل پیدا ہوئیں۔ اسلام قبول کرنے والوں میں ان کا اٹھارہواں نمبر تھا۔ بڑی فراخ دل، بلند حوصلہ، فیاض، دلیر، جفاکش اور صابرہ خاتون تھیں۔ انھیں یہ شرف حاصل ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کے ارادے سے روانہ ہوئے تو انھوں نے ان کے لئے زادِراہ اور ناشتا تیار کر کے دیا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ ہجرت کے وقت اپنے تمام درہم و دینار ساتھ لے گئے تھے۔ ان کے والد کا نام ابوقحافہ تھا اور وہ نابینا تھے۔ انھیں بیٹے کی ہجرت کا علم ہوا تو بولے۔

"ابوبکر ہمیں مالی اور جانی دونوں قسم کی تکلیف میں مبتلا کر گیا"

اسماء نے دادا کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو درہم و دینار کے وزن کے برابر چھوٹے چھوٹے پتھروں کے ٹکڑوں کا ڈھیر لگایا، ان پر کپڑا ڈالا اور دادا کا ہاتھ پکڑ کر انھیں اس ڈھیر پر لا کھڑا کیا۔ بولیں:

"یہ دیکھئے تمام دولت یہیں پڑی ہے، وہ تو کچھ بھی اپنے ساتھ لے کر نہیں گئے"۔

کچھ دنوں کے بعد مسلمان خواتین نے ہجرت کی تو اسماء نے بھی ان کے ساتھ رختِ سفر باندھا اور عازمِ مدینہ ہوگئیں۔ مدینہ پہنچ کر قبا کے مقام پر قیام کیا، جہاں ان کے بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام عبداللہ رکھا۔ یہ ہجرت کے بعد پہلی اولاد تھی جو ایک مہاجر خاندان کو اللہ نے عطا فرمائی، بچے کو لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آپ نے بچے کو گود میں لیا۔ گھٹی دی اور دعا فرمائی۔ یہی وہ بچہ ہے جو عبداللہ بن زبیر کے نام سے معروف ہے۔ جو تاریخِ اسلام کا ایک نامور سپاہی گزرا ہے۔ اسماء کے تذکرہ میں عبداللہ کا نام بھی بار بار آئے گا۔

یہ ایک امیر گھرانے کی بیٹی تھیں اور زندگی کی ابتدائی منزلیں دولت وثروت کے ماحول میں طے کی تھیں، لیکن شادی زبیر بن عوام سے ہوئی جو نہایت غریب اور نادار

شخص تھے اور جن کا اثاثہ صرف ایک گھوڑے اور ایک اونٹ تک محدود تھا۔ اسماء نے زبیر کے گھر آتے ہی اپنے آپ کو جفاکش اور محنت و مشقت کا عادی بنا لیا تھا۔ خود گھوڑے کو دانہ دیتیں پانی بھرتیں اور کنویں سے ڈول کے ساتھ پانی نکال کر اسے پلاتی تھیں۔ سرور کائنات ﷺ نے زبیر کو ایک خطۂ زمین عنایت کیا تھا، اسماء وہاں جا کر کھجوروں کی گٹھلیاں چنتیں اور سر پر اٹھا کر لاتی تھیں۔ ایک دن کھجوریں سر پر اٹھائے آ رہی تھیں کہ ادھر سے آنحضرت ﷺ بھی تشریف لے آئے، آپ اونٹ پر سوار تھے۔ آپ نے اونٹ کو بٹھایا اور اسماء سے سوار ہونے کو کہا، لیکن ان کو اس بات سے شرم آئی کہ حضور تو پیدل چلیں اور یہ اونٹ پر سوار ہوں، اس لئے انکار کر دیا۔ گھر آ کر یہ واقعہ اپنے شوہر زبیر کو سنایا تو انھوں نے بطور مزاح کہا۔

''واہ! سر پر بوجھ لادنے سے تو شرم نہ آئی لیکن سرور عالم ﷺ کے اونٹ پر سوار ہونے سے شرما گئیں''۔

کچھ عرصہ بعد کام کاج کے لئے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اسماءؓ کو ایک خادم دے دیا تھا، اس سے ان کی یہ تکلیفیں رفع ہو گئی تھیں۔

دل کی فیاض تھیں مگر مالی اعتبار سے غریب تھیں۔ اس لئے ناپ تول کر خرچ کرتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو فرمایا۔

''اگر تم لوگوں کو ناپ تول کر دو گی تو اللہ بھی تمہیں ناپ تول کر دے گا''۔

اس کے بعد یہ عادت ترک کر دی اور پھر اللہ نے اتنا دیا کہ تمام مشکلیں ختم ہو گئیں۔ ان کے بیٹے عبداللہ بن زبیر کا بیان ہے کہ میں نے اپنی ماں سے بڑھ کر کسی کو فیاض نہیں پایا۔ ان کی چھوٹی بہن ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے وفات کے وقت ترکے میں ایک جنگل چھوڑا تھا جو حضرت اسماء کے حصے میں آیا تھا، مگر اس پیکرِ سخاوت خاتون نے جنگل ایک لاکھ درہم میں فروخت کر کے اس کی تمام رقم اپنے

اعزہ واقارب کو تقسیم کردی۔ جس طرح حضرت اسماء خود خرچ کرتیں اور غربا و مساکین کی مدد کرتی تھیں۔ اسی طرح اپنی اولاد کو بھی اس عمل کی تلقین کرتی تھیں۔ وہ اپنے اہل وعیال سے کہا کرتی تھیں۔

''یہ مال ودولت تمہیں اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کو دوسروں کے کام میں لاؤ۔ غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرو۔ نہ کہ اس لئے کہ اس کو تجوریوں میں بند کر کے رکھ چھوڑو۔ اور صرف اپنے ہی مصرف میں لاؤ۔ اگر تم اسے دوسرے کے کئے استعمال نہیں کرو گے اور اپنے کسی بھائی کی ضرورت پر اپنی ذاتی ضرورت کو ترجیح دو گے تو بخیل اور کنجوس کہلاؤ گے۔ دوسروں کی مشکل کشائی کے لئے اپنا مال خرچ کرنا بہترین ذخیرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے نہ مال کے کم ہونے کا خطرہ ہے، نہ ضائع ہونے کا۔

سخاوت کے علاوہ حضرت اسماء انکسار و تواضع کا پیکر تھیں اور باوجود اس کے کہ مال ودولت کی نعمت سے بہرہ مند تھی، مگر موٹا لباس پہنتیں اور فقیرانہ زندگی بسر کرتی تھیں اس سلسلے میں ان کے بہت سے واقعات تاریخ کی کتاب میں مرقوم ہیں، جن میں ایک واقعہ یہ ہے کہ ان کے بیٹے منذر، فتح عراق سے واپس آئے تو مال غنیمت میں کچھ خوبصورت اور باریک منقش زنانہ کپڑے بھی ساتھ لائے۔ یہ کپڑے فرمانبردار بیٹے نے نہایت ادب کے ساتھ اپنی ماں کی خدمت میں پیش کئے۔ بوڑھی ماں کی بصارت زائل ہو چکی تھی۔ کپڑوں کو ہاتھ سے ٹٹول کر بیٹے سے مخاطب ہوئیں اور کہا:

''یہ اتنے باریک اور نرم و نازک کپڑے تم میرے لئے لائے ہو، میں اپنے جسم پر یہ لباس نہیں پہن سکتی۔ یہ شرفاء اور جفاکش لوگوں کا لباس نہیں ہے۔ میرے لئے موٹے کپڑے لاؤ''۔

چنانچہ سعادت مند بیٹے نے وہ کپڑے واپس کئے اور ماں کے لئے موٹے کپڑے لا کر دیے۔ یہ کپڑے لے کر وہ بہت خوش ہوئیں اور کہا:

"بیٹا مجھے اسی قسم کے کپڑے پہنایا کرو"۔

ایک روایت کے مطابق حضرت اسماء شاعرہ بھی تھیں اور زبان واظہار کی خوبیوں سے انہیں بہرۂ وافر حاصل تھا۔ ۳۱ھ میں جب ان کی عمر ۵۸ سال کی ہوگئی تھی اور عالم شباب سے نکل کر بڑھاپے کی دنیا میں داخل ہوگئی تھیں، جنگ جمل کا واقعہ پیش آیا۔ ان کے شوہر حضرت زبیر جنگ جمل سے واپس آرہے تھے، ایک شخص عمرو بن جرموز مجاشعی نے ان کو بصرہ سے پانچ میل دور وادی سباع میں قتل کردیا۔ اس حادثے کا ان پر نہایت گہرا اثر ہوا اور رنج والم میں ڈوب کر اپنے بہادر اور تیغ زن شوہر کا مرثیہ کیا جس کے تین شعر یہ ہیں:

غدا ابن جرموز بفارس بهمة   یوم الهیاج و کان غیر معرد

یا عمرو لو نبهته لوجدته   لا طأشاعش الجنان و لا الید

ثکلتک امک ان قتلت مسلما   حلت علیه عقوبة المتعمد

ابن جرموز نے لڑائی کے دن ایک شہ سوار اور عالی ہمت انسان کو ایسی حالت میں دھوکا دیا جب کہ وہ نہتا اور بے سروسامان تھا۔

اے عمرو! اگر تو اس کو خبردار کردیتا تو یقیناً اس کو ایسا شخص پاتا کہ نہ اس کے دل میں کوئی خوف ہوتا اور نہ ہاتھ میں کوئی لرزہ۔

تجھ سے خدا سمجھے، تو نے ایک ایسے مسلمان کو قتل کیا، جس کی وجہ سے مجھ پر ضرور عذاب نازل ہوگا۔

عبداللہ کے کان ماں کی گود ہی میں تلوار کی کاٹ اور تیزی سے آشنا ہو چکے تھے۔ ان کی ماں اپنے اس بچے کو ان اشعار سے لوری دیتی۔

ابیض کالسیف الحسام الا بریق   بین الحواری و بین الصدیق

نحفی به و رب ظن تحقیق   و الله اهل الفضل اهل التوفیق

یہ چمکتی ہوئی تیز تلوار کی طرح سفید رو ہے، جو حواری رسول (یعنی اپنے باپ زبیر) اور (اپنے نانا) صدیق کی اولاد ہے۔ اس کے بارے میں میرا یہ گمان ہے اور بسا اوقات گمان صحیح ہوتا ہے کہ بخدا یہ اہل فضل ہے اور توفیق وقوت کا حامل ہے۔

عبداللہ بن زبیر نے یزید کی بیعت کرنے اور خود کو اس کے دائرۂ حکومت میں شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا اور مکہ مکرمہ کو مرکز بنا کر اپنی خلافت کا اعلان کر دیا تھا اور کئی صوبوں پر قبضہ بھی کر لیا تھا۔ یزید کے بعد جب عبدالملک بن مروان تختِ حکومت پر متمکن ہوا تو اس نے عبداللہ بن زبیر کو شکست دینے کی ٹھان لی اور ان سے مقابلے کے لئے حجاج بن یوسف کو روانہ کیا۔ حجاج بن یوسف نہایت ظالم اور سفاک تھا۔ وہ بہت بڑی فوج کے ساتھ مکہ کی طرف بڑھا اور یکم ذی الحجہ ۷۲ھ کو اس مقدس شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مکے میں آمد ورفت کے تمام راستے بند کر دیئے اور باہر سے ہر قسم کے سامان کی درآمد کے ذرائع منقطع ہو گئے۔ عبداللہ بن زبیر اور مکہ میں رہنے والے ان کے حامیوں کے لئے یہ نہایت نازک وقت تھا۔ چھ مہینے تک دونوں جانب کی فوجیں برسرپیکار رہیں۔ حجاج کا محاصرہ اتنا سخت تھا کہ مکہ مکرمہ میں کھانے پینے کی کوئی شے باہر سے نہیں آ سکتی تھی۔ اس نے بیت اللہ کی حرمت کو اس طرح پامال کر دیا تھا کہ جبل ابوقبیس پر منجنیقیں نصب کر کے اس پر مسلسل پتھر برسائے گئے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن زبیر کی جرأت اور اللہ سے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ وہ اس حالت میں بھی بیت اللہ میں اس خشوع وخضوع سے نماز پڑھتے تھے کہ کبوتر اڑ کر آتے اور ان کے کندھوں اور سر پر بیٹھ جاتے اس وقت وہ بہتر سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے، لیکن دل جوان تھا اور ارادے مضبوط تھے۔

اس سخت محاصروں کے زمانے میں وہ ایک دن حضرت اسماء کی خدمت میں ان کی خیر وعافیت پوچھنے کے لئے آئے۔ وہ کچھ بیمار تھیں۔ ماں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

"امی جان! موت میں بڑا سکون ہے"۔

ماں نے جواب دیا: ''شاید تم میرے مرنے کی خواہش رکھتے ہو کہ کم زور ماں کی خدمت سے نجات پا جاؤں۔ لیکن بیٹا میں چاہتی ہوں کہ تمہارا انجام دیکھ کر مروں۔ اگر تم شہادت کے مرتبے کو پہنچ جاؤ تو تمہارے کفن دفن کا انتظام اپنی نگرانی میں کروں اور اگر فتح یاب ہو جاؤ تو میرے دل کو سرور حاصل ہو''۔

اس سے دس دن بعد جب ان کے ساتھ گنتی کے چند آدمی رہ گئے تھے، وہ آخری دفعہ حضرت اسماء کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

''امی جان! اب میرے ساتھ چند افراد رہ گئے ہیں۔ اگر میں دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دوں تو ممکن ہے مجھے اور میرے ساتھیوں کو امان حاصل ہو جائے۔ بتایئے آپ کی کیا رائے ہے؟''

جواب دیا:

اے میرے بیٹے! اگر تمہاری یہ تمام تگ ودو حق کے لئے ہے تو بہادروں کی طرح لڑ کر درجۂ شہادت پر فائز ہو جاؤ، دشمن کے سامنے سر جھکا کر ذلت کا مظاہرہ نہ کرو۔ اگر تمہارا یہ سلسلہ دنیوی عز وجاہ کے حصول کے لئے تھا تو تم نہایت ناپسندیدہ شخص ہو۔ اس صورت میں تم نے اپنا انجام بھی خراب کیا اور دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈالا۔ بہادر لوگ جو حق وصداقت کو دنیا میں پھیلانے کی جدوجہد کرتے ہیں، نہ وہ موت سے ڈرتے ہیں اور نہ دشمن کی شرائط پر اس کے سامنے جھکتے ہیں، وہ عزت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور عزت کی موت مرتے ہیں۔

بیٹے نے جواب دیا: امی! میں موت سے نہیں ڈرتا، صرف یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ میری موت کے بعد دشمن میری لاش کو خراب کریں گے، اس کا مثلہ کریں گے یعنی میری ناک اور کان وغیرہ کاٹیں گے اور مجھے سولی پر چڑھائیں گے، جس سے آپ کو تکلیف پہنچے گی۔

حضرت اسماء بولیں: جب بکری کو ذبح کردیا جائے تو پھر اس کی کھال کھینچی جائے یا اس کے جسم کے ٹکڑے کردیئے جائیں، اسے کیا۔ تم اللہ پر توکل کرکے اپنا سلسلۂ جہاد جاری رکھو۔ اللہ کی راہ میں اگر جسم کا قیمہ کردیا جائے تو یہ گمراہ لوگوں کی غلامی میں رہنے سے بہت بہتر ہے۔ موت سے ڈر کر غلامی کی زندگی کبھی اختیار نہیں کرنی چاہیے۔

بیٹے نے ماں کی بہادرانہ اور حوصلہ مندانہ باتیں سن کر ان کی خدمت میں عرض کیا کہ اب میں اللہ کی راہ میں شہادت کے لئے میدانِ جنگ میں جارہا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ آپ میری موت پر شکر و صبر سے کام لیں گی۔ میں نے کسی مسلمان پر کبھی ظلم نہیں کیا، کبھی بدعہدی نہیں کی، کبھی برائی کو پسند نہیں کیا، کبھی امانت میں خیانت نہیں کی، کبھی دنیا کے عارضی فوائد کو آخرت کے دوامی فوائد پر ترجیح نہیں دی۔

اس قسم کی چند باتیں کرنے کے بعد وہ دشمن کے مقابلے میں جا کھڑے ہوئے اور جنگ کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔ حجاج بن یوسف نے ان کی شہادت پر نہایت خوشی کا اظہار کیا اور ان کی لاش کو حجون کے مقام میں سولی پر لٹکا دیا گیا۔

تیسرے دن حضرت اسماء ایک خادمہ کے سہارے مقام حجون پر آئیں۔ حجاج اس وقت وہیں تھا۔ بولیں:

''کیا اس سوار کے اترنے کا ابھی وقت نہیں آیا''؟

حجاج نے جواب دیا: وہ ملحد تھا۔ اس کی یہی سزا تھی۔

حضرت اسماء نے جواب دیا: وہ ملحد نہیں تھا، وہ نماز روزے کا پابند اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو ماننے والا تھا۔

حجاج نے کہا: تم سٹھیا گئی ہو۔

بولیں: تمہاری عقل جواب دے گئی ہے۔ میں بالکل صحیح کہہ رہی ہوں۔ بخدا میں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قبیلہ بنوثقیف میں ایک کذاب اور ایک

سفاک پیدا ہوگا۔ کذاب (یعنی مختار ثقفی) کو ہم نے دیکھ لیا۔ سفاک تم ہو۔

کئی روز بعد خلیفہ عبدالملک بن مروان کو دمشق میں اطلاع ہوئی کہ حضرت عبداللہ بن زبیر کی لاش انکی والدہ کو نہیں دی گئی تو اس نے نہایت سخت الفاظ میں حجاج کو خط لکھا اور لاش ان کی والدہ کو دینے کا حکم دیا۔ لاش دی گئی تو انھیں غسل دیا گیا۔ لاش کے ٹکڑے ہو چکے تھے، پھر اسی حالت میں جنازہ پڑھ کر انھیں حجون کے مقام پر دفن کر دیا گیا۔

حضرت اسماء نہایت عالی ہمت، بلند حوصلہ اور جرأت مند خاتون تھیں۔ ان کی زندگی میں بدامنی کا دور آیا تو وہ اپنے ہاتھ میں ہمیشہ تیز دھار خنجر رکھتی تھیں۔ ایک دن ان سے لوگوں نے پوچھا:

"اس خنجر سے آپ کیا کام لیں گی"؟

فرمایا: "اگر فتنہ پرور میرے گھر میں گھس کر بدامنی کا مظاہرہ کریں گے تو یہ خنجر ان کے پیٹ میں اتار دوں گی اور ان کی تکابوٹی کر دوں گی۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ نہایت سخی تھیں اور مستحقین کی مالی مدد کرتی تھی۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ان کی والدہ کا نام قتیلہ تھا جو عبدالعزی کی بیٹی تھیں۔ وہ مسلمان نہیں ہوئی تھیں۔ ان کے مسلمان نہ ہونے کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہجرت سے قبل انھیں طلاق دے دی تھی۔

ایک دفعہ وہ مدینہ منورہ آئیں اور حضرت اسماء سے کچھ روپے مانگے۔ حضرت اسماء انھیں روپے دینا چاہتی تھیں۔ لیکن ان کے مشرکہ ہونے کی بنا پر روپے دینے میں کچھ تامل کر رہی تھی۔ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ میری ماں مشرکہ ہیں اور مجھ سے مالی امداد چاہتی ہیں کیا میں ان کی مدد کر سکتی ہوں؟

آپ نے فرمایا: ہاں کر سکتی ہو۔ اسلام صلہ رحمی سے کسی کو منع نہیں کرتا۔

ایک دفعہ قتیلہ کچھ تحائف لے کر حضرت اسماء کے پاس آئیں، حضرت اسماء

نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی معرفت نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ وہ اپنی مشرکہ ماں کے تحائف قبول کرسکتی ہیں اور انھیں مہمان کی حیثیت سے اپنے مکان میں ٹھہرا سکتی ہیں؟

آنحضرت نے جواب دیا: ان کے تحائف قبول کرو اور انھیں اپنے مکان میں مہمان کی حیثیت سے ٹھہراؤ۔

چنانچہ انھوں نے ان کے تحائف بھی قبول کئے اور اپنے مکان میں بھی ٹھہرایا۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے پانچ بیٹے تھے اور تین بیٹیاں۔ بیٹوں کے نام تھے عبداللہ، عروہ، منذر، مہاجر اور عاصم۔ بیٹیوں کے نام تھے خدیجۃ الکبریٰ، ام الحسن، اور عائشہ۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا علم وفضل میں بھی اونچا مقام رکھتی تھیں۔ ان سے چھپن (۵۶) حدیثیں مروی ہیں۔ ان سے روایت کرنے والوں میں سے چند حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں: حضرت عبداللہ بن زبیر، عروہ بن زبیر، ابوبکر، عباد اور عامر عبداللہ بن عروہ، عبداللہ بن کیسان، فاطمہ بنت منذر بن زبیر، محمد بن منکدر، ابن ابی مکیلہ، وہب بن کیسان، مطلب بن حطب، ابونوفل بن ابوعقرب، مسلم مصری، صفیہ بنت کیسان، عبادہ بن حمزہ بن عبداللہ بن زبیر۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے سو سال کے قریب عمر پائی ہے۔ ۷۲ھ میں اپنے لختِ جگر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بعد فوت ہوئیں۔

☆☆☆

حضرت معاذہ بنت عبداللہ

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی کنیز جنھیں اس نے اسلام کی راہ میں سخت تکلیف پہونچائی تھی۔

معاذہ بنت عبداللہ بن جریر الضریر بن امیہ بن حدارہ بن حارث بن خزرج۔ عبداللہ بن اُبی کی کنیز تھیں۔ قبولِ اسلام کے باعث اللہ نے ان کو آزادی کی نعمت عطا کی۔ ان عظیم خواتین میں سے تھیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی سعادت حاصل کی۔

حضرت معاذہ بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح سہل بن قرظہ سے ہوا۔ ان کے انتقال کر جانے یا طلاق دینے کے بعد دوسرا نکاح حمیر بن عدی القاری سے کیا۔ انھوں نے طلاق دے دی تو تیسری شادی عامر بن عدی سے کی۔ پہلے شوہر سہل بن قرظہ سے دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک لڑکا عبداللہ بن سہل اور ایک لڑکی ام سعید بنت سہل۔ دوسرے شوہر حمیر بن عدی سے جڑواں لڑکے حارث اور عدی پیدا ہوئے اور ایک لڑکی ام سعد پیدا ہوئی۔ تیسرے خاوند عامر بن عدی سے صرف ایک لڑکی ام حبیب بنت عامر پیدا ہوئی۔

''الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب'' میں بتایا گیا ہے کہ جہاں یہ بہت بڑی عاملہ وفاضلہ اور معلّمہ تھیں، وہاں سخاوت وعادات کے لحاظ سے نہایت بلند مرتبے پر فائز تھیں۔ صدقات وخیرات بڑی وسعتِ قلب سے کرتی تھیں۔ بلند حوصلہ اور عالی ذہن خاتون تھیں۔ متکبر اور ظالم کے سامنے کبھی سر نہ جھکاتیں، کم زور اور نادار کی مدد کرتیں۔ ضرورت

مندوں کے کام آتیں اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کے لئے تیار رہتیں۔ لوگوں کا سودا سلف لا دیتیں اور بوڑھی عورتوں کی خدمت کرتیں۔ زبان میں اثر اور زور تھا۔ ایک عرصے تک مشہور منافق عبداللہ بن ابی بن سلول کی کنیز رہیں۔ لیکن ضمیر زندہ تھا، جذبات تیز تھے، ذہن آزاد تھا اور فکر میں روانی تھی۔ نہ خود کسی پر ظلم کرتیں اور نہ کسی پر ظلم ہوتا دیکھ کر برداشت کرسکتیں۔ اسلام کی بہت بڑی خادمہ تھیں اور حالات کی رفتار کو خوب سمجھتی تھیں۔ محنت مزدوری سے جی نہ چراتیں۔

اسلام کی آواز کانوں میں پہنچی تو مسلمان ہوگئیں۔ عبداللہ بن اُبی ان کے اسلام کا شدید مخالف تھا۔ اس لئے انھیں سخت اذیتیں پہنچاتا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اس کی تکلیفوں اور اذیتوں کو برداشت نہ کرسکیں گے اور زیادہ رقم دے کر اسے چھڑا لیں گے۔ مگر معاذہ بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا کے دل میں اسلام کی محبت اس درجہ راسخ ہوچکی تھی اور حبِ رسول ان کے اندر اس قدر گھر کرچکی تھی کہ انھیں کسی تکلیف کی ئی پرواہ نہ ہوتی اور وہ برابر اپنے اسلام کا اعلان کرتیں اور احکامِ شریعت پر پابندی سے ں پیرا رہتیں۔ ایک مرتبہ عبداللہ بن اُبی کی طرف سے تکلیفوں میں اضافہ ہوا تو اس بلند مرتبت خاتون نے اس سے کہا۔

میں اگرچہ غلاموں اور کنیزوں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہوں، لیکن میرا ضمیر آزاد ہے اور میرے فکر و عمل کی دنیا وسیع ہے۔ میں بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں اسلام کی نعمت سے مالا مال ہوچکی ہوں۔ اسلام کے خلاف تمہاری کوئی بات ماننے کو تیار نہیں۔ بہ صدق دل محمد (ﷺ) پر ایمان لاچکی ہوں۔ اب کوئی تکلیف اور کوئی حرص مجھے رسول اللہ ﷺ کے دامن سے الگ نہیں کرسکتی۔ مجھے یقین ہے کہ دین و دنیا کی کامیابی کا ضامن صرف اسلام ہے اور رسول اللہ ﷺ سے قلبی وابستگی تمام بیماریوں کا واحد علاج۔ میں نے اسلام قبول کرکے اور آنحضرت کی بیعت کا شرف حاصل کرکے

پوری صورت حال کا جائزہ لے لیا ہے۔ اسلام میں غلام اور آزاد کی کوئی تمیز نہیں۔ وہاں چھوٹے اور بڑے میں کوئی فرق نہیں، آقا اور مالک کو کوئی فوقیت حاصل نہیں، امیر اور غریب میں کوئی امتیاز نہیں۔ میں اسلام کے معاملے میں تمہیں کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ جاؤ جو جی چاہے کر لو۔ میں اب کسی صورت میں اسلام ترک نہیں کر سکتی۔

وہ حضرت معاذہ کو کنیز کی حیثیت سے بدکاری پر مجبور کرتا تھا۔ اس پر سورہ نور کی یہ آیت نازل ہوئی۔

لاتکرھوا فتیاتکم علی البغاء اس کے بعد ان کو آزادی حاصل ہوگئی اور انھوں نے اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

تاریخ وفات کا پتہ نہیں چل سکا۔

☆☆☆

حضرت برزہ بنت مسعود ثقفی رضی اللہ عنہا

بہترین خطیب اور پر جوش مبلغ اسلام جن کی زبان میں زور اور عذوبت کا حسین امتزاج تھا۔

حضرت برزہ رضی اللہ عنہا نہایت عظیم المرتبت صحابیہ تھیں۔ حضرت مسعود بن عمرو ثقفی کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے کارناموں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ طبقات ابن سعد اور سیرت ابن ہشام میں ان کے حالات ملتے ہیں جو انتہائی سبق آموز ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاتون صبر و استقلال اور عزیمت و استقامت کی ایک عظیم الشان مثال تھیں، جو بیک وقت بہادر و جری بھی تھیں اور عابدہ و زاہدہ بھی، بلاغت وفصاحت میں بھی بہت آگے تھیں اور عزم و ہمت میں بھی۔ ان خوش بخت اور رفیع المنزلت افراد میں سے تھیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کے حضور قبولِ اسلام کا شرف حاصل کیا اور آپ سے بیعت کی سعادت عظمیٰ سے بہرہ ور ہوئے۔ کردار کی پاکیزگی اور خدمتِ خلق کی بنا پر حضرت برزہ خاص شہرت کی حامل تھیں۔ حدیثِ رسول کی راویہ اور متعدد مشاہیر کی استاد تھیں۔ ان کے سامنے بعض حضرات نے زانوئے شاگردی تہہ کیا اور سرورِ کائنات ﷺ کی احادیث کے سماع کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ ان کی زبان میں زور اور عذوبت دونوں کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ بہترین خطیب اور پر جوش مبلغ اسلام تھیں۔ تحمل اور بردباری ان کے وہ جوہر ان میں پائے جاتے تھے جو کم لوگوں کے حصے میں آتے ہیں۔

حضرت برزہ بنت مسعود ثقفی رضی اللہ عنہا نے سیرت ابن ہشام کی روایت

کے مطابق جنگ احد میں بھی شرکت کی۔ یہ جنگ ۳ ہجری میں لڑی گئی تھی اور اس میں مسلمانوں سے ایک جنگی لغزش ہوگئی تھی جس کے نتیجے میں مسلمانوں میں گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوگئے تھے اور یکا یک جنگ کا نقشہ کچھ اس طرح بدل گیا تھا کہ مسلمانوں کا اس میں ثابت قدم رہنا مشکل ہوگیا تھا۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جن حضرات نے اثبات واستقامت کا ثبوت دیا، ان میں حضرت برزہ رضی اللہ عنہا کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ یہ خاتون اس درجہ بلند ہمت اور عزم وارادے کی مالک تھیں کہ انتہائی خوف ناک اور شدید تکلیف دہ حالات میں بھی میدانِ جنگ میں ڈٹی رہیں۔ جب مسلمانوں میں ہزیمت کے آثار دکھائی دینے لگے تو یہ بہادر خاتون ایک کنارے پر کھڑی تھیں اور ایک اونچے مقام سے تمام معاملات کو بنظرِ غائر دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو پکارا اور بلند آواز سے کہنا شروع کیا۔

مسلمانو! کہاں جا رہے ہو؟ میدانِ جنگ سے بھاگنے کی کوشش کرنا اسلام کے منافی اور بہادری کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ یہ دیکھو تمہارے پیغمبر (ﷺ) بدستور میدان میں موجود ہیں اور ان پر تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ لیکن رسول اکرم ہر صورت میں حالات کا مقابلہ کریں گے۔ تم عجیب مسلمان ہو کہ اپنے پیغمبر کو چھوڑ کر بھاگنے کی کوشش کر رہے ہو۔ ہر حال میں استقامت کا ثبوت دو، اپنی گردنیں کٹا دو، جان کی بازی لگا دو، کفر کی طاقت کے ساتھ پوری طاقت سے ٹکرا جاؤ، اپنے پیغمبر ﷺ کی حفاظت کرو۔ میدان سے بھاگ جانا بہادروں کا شیوہ اور سچے لوگوں کا کام نہیں۔ اگر تم اپنی بات میں صادق ہو، تمہارا مذہب سچائیوں کا جامع ہے، تم اللہ کے پرستار ہو اور صدق دل سے محمد (ﷺ) کی نبوت ورسالت کا اقرار کرتے ہو تو میدان میں ڈٹے رہو اور جواں مردی سے دشمن کے تیر وتفنگ کا مقابلہ کرو، کسی نوع کی کم ہمتی اور کمزوری کا اظہار تمہاری توہین ہے، بہادر بھاگنے کے نام سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ ان کے مستقبل کے فیصلے

میدان جنگ ہی کرتا ہے۔تمہارے آباء واجداد کی عمریں دشمن سے تصادم اور لڑائیوں میں گزر گئیں، آج تم یہاں سے پیٹھ دکھا کران کے نام کو بھی بٹا لگا رہے ہو اور اپنے جذبۂ اسلامیت کی بھی اہانت کے درپے ہو۔ٹھہرو! اپنے مستقبل کا فیصلہ یہیں کرو۔تعجب ہے عورتیں تو تیروں کی چھاؤں میں کھڑی ہیں اور مردوں پر شکست کے آثار نمایاں ہیں۔

حضرت برزہ رضی اللہ عنہا نے جنگ احد میں انتہائی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ یہ زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کرتی تھیں، مجاہدین کو پانی بھی پلاتی تھیں اور دشمن سے مقابلے کے لئے انھیں اسلحہ بھی فراہم کرتی تھیں۔ جنگ سے واپسی کے بعد انھوں نے ایک نہایت اہم خدمت یہ انجام دی کہ شہداء احد کے گھروں میں جا کران کے اہل وعیال کو تسلی دی اور شہادت کے فضائل بیان کئے اور یہ بتایا کہ مسلمان کا اصل کام جہاد ہے۔جو شخص جہاد سے گریزاں ہے، مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں۔اسلام کی تعلیم میں جہاد کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اور کسی عبادت کو حاصل نہیں۔

انھوں نے کہا کہ جہاد کی متعدد نوعیتیں ہیں، جن میں بنیادی نوعیت میدان جنگ میں جانا اور شمشیر بکف ہو کر دشمن سے برسر پیکار ہونا ہے۔اگر کوئی شخص اس اثناء میں درجۂ شہادت پر فائز ہو جانے کا شرف حاصل کر لیتا ہے تو وہ انتہائی خوش نصیب ہے، ان کی اس انداز کی تسلی اور اس اسلوبِ گفتگو نے شہداء کے ورثاء کو انتہائی متاثر کیا اور ان کے افسوس وحزن کے آثار دور ہو گئے۔

☆☆☆

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا

ایک جری خاتون جنھوں نے کلمۂ حق کہنے میں کسی مصلحت کا لحاظ نہ کیا۔

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خادمہ تھیں۔ فہم وفراست اور عقل وخرد میں ان کا شمار مدینہ منورہ کی ممتاز خواتین میں ہوتا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی چونکہ انتہائی زیرک اور گہرے فکر ونظر کی مالک تھیں اس لئے جو لوگ ان کے خدام اور متعلقین کے حلقے میں شامل تھے وہ بھی اسی قسم کی ذہنی رسائی کے حامل تھے اور ان کا طائرِ فکر نہایت بلندیوں پر محوِ پرواز تھا۔

حضرت بریرہ اپنے اندر بہ یک وقت کئی خصوصیات رکھتی تھیں۔ وہ سرورِ کائنات ﷺ کی صحابیہ، ام المومنین حضرت عائشہؓ کی خادمہ، جلیل القدر صحابہ اور تابعین کی معلّمہ اور فرامینِ رسالت مآب کی راویہ۔ ان اوصاف وخصوصیات کی بنا پر انھیں بے حد عزت واحترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور تمام لوگ ان کی قدر کرتے تھے۔

حضرت بریرہ کو حضرت عائشہؓ کی خادمہ کی حیثیت سے آنحضرت ﷺ کے گھریلو حالات سے پوری آگاہی حاصل تھی۔ وہ فرماتی ہیں کہ ازواجِ مطہرات کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے تعلقات نہایت اچھے تھے۔ اپنی صاحبزادیوں سے آپ انتہائی حسن سلوک روا رکھتے تھے، رشتہ داروں اور قرابت داروں سے پوری صلہ رحمی کرتے تھے، محلے اور شہر کے باشندوں سے آپ بہت اچھی طرح پیش آتے تھے اور ان کے کام کاج سرانجام دینے میں مسرت محسوس فرماتے تھے۔ خادموں اور خادماؤں سے گفتگو کرتے اور ہم کلام ہوتے وقت نرمی ورأفت کا برتاؤ فرماتے تھے، مہمانوں اور گھر میں آنے جانے والوں کا احترام کرتے تھے۔ غرض وہ آنحضرت اور آپ کے گھر سے

پوری طرح باخبر تھیں اور آپ جن جن لوگوں سے جو سلوک فرماتے اس کا علم رکھتی تھیں۔

حضرت بریرہ راویہ حدیث بھی ہیں اور آنحضرت ﷺ کی بعض احادیث ان سے مروی ہیں۔ اس حیثیت سے انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ حضور اپنے صحابہ اور اصحابِ صفہ کی بڑی تکریم فرماتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جن خصوصیات کی مالک تھیں اور جو اوصاف ان کی ذات گرامی میں پائے جاتے ہیں، ان کی تفصیلات ان کے سامنے بالکل واضح تھیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ دیگر ازواجِ مطہرات سے حضرت عائشہؓ کے تعلقات و مراسم بہنوں کے سے تھے اور وہ سب کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کرتی تھیں۔

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا متعدد غزوات میں شریک ہوئیں، جس غزوے میں حضرت عائشہؓ نے شرکت فرمائی، انھوں نے بھی اس میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی۔ یہ مجاہدین کو پانی پلانے، ان کے لئے کھانا تیار کرنے، ان کو ہتھیار فراہم کرنے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کی خدمت انجام دیتی تھیں۔

تمام لوگوں میں ان کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا۔ خلفاء راشدین بھی ان کی تکریم کرتے تھے۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کے گھر تشریف لے جاتے اور ان کی ضروریات کے بارے میں دریافت کرتے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی ان کے مکان پر جاتے، دیگر خلفاء کا بھی یہی حال تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کی تو یہ کیفیت تھی کہ انھیں دیکھ کر راستہ چلتے ہوئے رک جاتے اور اس وقت تک قدم نہ اٹھاتے جب تک وہ خود نہ چل پڑتیں، یا جانے کی اجازت نہ دے دیتیں۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہیں جارہے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ ادھر سے حضرت بریرہ بھی آرہی تھیں۔ انھوں نے ان کو دیکھا تو فرطِ احترام سے نظریں نیچی کرلیں اور قدم رک گئے۔ سلام کیا اور کھڑے ہوگئے اور کافی دیر کھڑے

رہے۔ ایک شخص نے کہا امیر المومنین بہت دیر ہوگئی ہے، اب تو چلئے۔ اسے ڈانٹا اور فرمایا تمہیں معلوم ہے یہ کون ہیں؟ یہ نہایت معزز خاتون ہیں۔ میرے نزدیک یہ سب سے زیادہ لائقِ تعظیم ہیں۔ جب تک یہ کھڑی رہیں گی یا مجھے اجازت نہیں دیں گی میرے قدم حرکت میں نہیں آئیں گے۔ میں کھڑا رہوں گا اور ان کی باتیں سنتا رہوں گا۔

اصحاب سیر نے ان کے اقوال وارشادات بھی نقل کئے ہیں جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً فرماتی ہیں.

نیکی کرکے اس کی تشہیر نہ کرو، کسی پر احسان کرو تو اس کا بدلہ نہ چاہو، راست بازی کو اپنا شعار بناؤ، اس انداز سے بات کرو کہ اس کے سمجھنے میں الجھن نہ پیدا ہو، کسی کو حقیر نہ سمجھو، ہمیشہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرو، کذب بیانی سب سے بڑا فتنہ ہے، اپنے اندر اخلاقِ حسنہ کی جنت آباد کرنے کی عادت ڈالو۔ تلاوتِ قرآن کو اپنے لئے لازمی قرار دو، صدقِ مقال انسان کا عظیم سرمایہ ہے، کسی کو غلط فہمی میں ڈال کر اپنا کام نہ چلاؤ، دنیا کے مفاد عارضی ہیں، ان کے لئے زیادہ تگ وتاز نہ کرو، اکل حلال میں بے شمار برکتیں پنہاں ہیں۔ انسانیت کا احترام بنیادی شے ہے، کمزور سے انتقام نہ لینا ہی اصل بہادری ہے۔ اپنی شجاعت کا ثبوت دینا ہو تو ضعیف وناتواں کو ہدف ستم نہ بناؤ۔ اپنا کام خود کرو، کسی کے دست نگر بننے سے احتراز کرو، قتل وخوں ریزی ناقابلِ عفو معصیت ہے۔ دوسرے کے جذبات کا احترام بلندی اخلاق کی علامت ہے۔ حکمرانوں کی نگاہ تیز اور وسیع ہونی چاہئے۔ مال دار وہ ہے جو دوسروں کی ضروریات کا خیال رکھے۔ ضرورت سے زیادہ بات کرنا کذب بیانی کی راہ پر لگا دیتا ہے، کسی سے مانگنا ذلت کا موجب ہے، زبان کو قابو میں رکھنا تقویٰ کی علامت ہے، نیک لوگوں کی مجلس حصولِ خیر کا ذریعہ ہے، قطع کلامی آدابِ مجلس کے منافی ہے۔ نیکی کی بات نہ بتانا امانت میں خیانت کرنا ہے، دل ایک شفاف آئینہ ہے جسے یاوہ گوئی غبار آلود کردیتی ہے۔ بہترین انسان وہ ہے جو زندگی کے

قافلے میں اچھے لوگوں کو شامل کرتا ہے۔

حضرت بریرہ کے شاگردوں کا بھی ایک حلقہ تھا، جن لوگوں نے ان سے سماع حدیث اور روایت حدیث کا شرف حاصل کیا ان میں عبدالملک بن مروان بھی شامل ہیں جو بعد میں بنوامیہ کے بہت بڑے حکمراں ہوئے۔ وہ ایک زوردار حاکم تھے۔ خود کہتے ہیں کہ میں حضرت بریرہ کی مجلس میں حاضر تھا اور رسول اکرم ﷺ کی احادیث کے سماع کا شرف حاصل کر رہا تھا کہ انھوں نے میری طرف مخاطب ہو کر زوردار الفاظ اور مرعوب کن انداز میں کہا:

عبدالملک! غور سے سنو۔ میں تم میں کچھ خصوصیات دیکھ رہی ہوں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت زمامِ اختیار تمہارے ہاتھ میں آئے گی۔ اگر تمہیں حکمراں بنادیا گیا تو خوں ریزی سے دامن کشاں رہنا اور قتل وغارت سے اپنے ہاتھ آلودہ نہ کرنا۔ میں یہ اس لئے کہہ رہی ہوں کہ میں نے اپنے ان کانوں سے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص نے دنیا میں ناحق کسی مسلمان کا خون بہایا ہوگا اور اس کے ہاتھ اس کے لہو سے رنگین ہوئے ہوں گے، اسے دھکے دے کر جنت کے دروازے سے پیچھے ہٹادیا جائے گا۔

حضرت بریرہ جرأت مند خاتون تھیں۔ کلمۂ حق کہنے میں کسی مصلحت کا لحاظ نہ کرتیں۔ وہ خلفاء میں اگر کسی قسم کی غلط بات دیکھتیں تو برملا ٹوک دیتیں۔ اللہ سے ڈراتیں اور آنحضرت ﷺ کی پاکیزہ تعلیمات یاد دلاتیں۔

رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت سے انھیں انتہائی محبت تھی۔ وہ عادات وخصائل کے اعتبار سے ممتاز درجہ رکھتی تھیں۔ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر افسردہ ہوجاتیں اور اس کی تکلیف دور کرنے کی کوشش فرماتیں۔

☆☆☆

حضرت بسیرہ رضی اللہ عنہا

اپنے دور کی عظیم خاتون جس نے کئی جنگوں میں حصہ لیا اور کئی میدانوں میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔

حضرت بسیرہ رضی اللہ عنہا مکہ مکرمہ کی رہنے والی تھیں اور عرب کے جس قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں وہ ایک جنگ جو قبیلہ تھا۔ عربوں کی روایات کے مطابق وہ اونٹ رکھتے اور بکریاں پالتے تھے۔ کچھ لوگ تجارت بھی کرتے تھے جو شام کے علاقے سے مختلف مال لاتے اور مکہ، طائف اور اس کے قرب وجوار میں فروخت کرتے تھے۔ بعض لوگ بصریٰ جاتے تھے اور وہاں سے کچھ مال لاتے اور کچھ مال وہاں لے کر جاتے تھے۔ اس قبیلے کے بعض ایسے افراد بھی تھے جن کا تعلق راہبوں اور تارک الدنیا زاہدوں کے گروہ سے تھا۔ یہ راہب اس بات کے قائل اور مبلغ تھے کہ کتبِ الٰہی کے مطابق ایک ایسا نبی آنے والا ہے جو آخری نبی ہوگا۔ وہ سرزمین عرب میں پیدا ہوگا اور تھوڑے عرصے میں تمام مذہبوں کے متبعین پر غلبہ حاصل کر لے گا اور دنیا اس کی تابع فرمان ہو جائے گی۔

راہبوں کی یہ باتیں واپس آ کر یہ اپنے قبیلے کے لوگوں کو سناتے اور ایک آنے والے مصلح اور پیغمبر کے بارے میں تعجب وحیرانی کا اظہار کرتے۔ عرب قبائل میں قریش سب سے زور دار اور مرجعِ خلائق تھے۔ لوگ انھیں مستحق تعظیم گردانتے تھے اور ان کی بات مانتے تھے۔ حضرت بسیرہ رضی اللہ عنہا کے قبیلے کے ایک شخص نے جو شام کے سفر سے واپس آیا تھا کہا کہ میں ایک راہب سے یہ سن کر آیا ہوں کہ عرب میں ایک پیغمبر پیدا ہوگا، ممکن ہے وہ پیغمبر قریش ہی میں پیدا ہو۔ بہر حال یہ باتیں یہودیوں اور عیسائیوں

میں خاصی مشہور تھیں اور ان کے راہب وتارک الدنیا بزرگ یہ باتیں عام طور پر اپنی مجلسوں میں بیان کیا کرتے تھے، جو عرب کے ان قبائل میں بھی پہنچ چکی تھیں جو اپنے آپ کو دینِ ابراہیمی کے متبع گردانتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ کا ظہور ہوا تو عرب کے بعض لوگوں نے ان راہبوں کی باتوں کا ذکر کیا اور اس مسئلے کو سنجیدگی سے موضوعِ فکر بنایا کہ ممکن ہے یہی آخری نبی اور دنیا کے مصلح ہوں۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے زمانے میں حضرت بسیرہ مکہ سے باہر تھیں اور طائف کے علاقے میں اپنے بعض اعزہ سے ملاقات کے لئے گئی تھیں۔ تین مہینے کے بعد واپس آرہی تھیں کہ معلوم ہوا مکہ میں محمد ﷺ نے رسالت ونبوت کا دعویٰ کیا ہے اور وہ خود کو اللہ کا فرستادہ قرار دیتے ہیں اور کچھ لوگ ان پر ایمان بھی لاچکے ہیں، جن میں بوڑھے بھی شامل ہیں اور جوان بھی، بچے بھی اور عورتیں بھی، پڑھے لکھے بھی اور ان پڑھ بھی، امیر بھی ہیں اور مفلس وقلاش بھی، غلام بھی ہیں اور آزاد بھی، تجارت پیشہ بھی اور ملازم ومزدور بھی۔

اب حضرت بسیرہ کے دل میں بھی ایک تحریک سی پیدا ہوئی اور غور وفکر کے نئے زاویوں نے کروٹ لی۔ چپکے چپکے چند عورتوں سے ملیں اور اسلام کے بارے میں کچھ باتیں سمجھنے کی کوشش کی، جس سے اس نتیجے پر پہنچیں کہ رسول اللہ ﷺ اللہ کے سچے نبی ہیں، ان کی دعوت صحیح ہے، ان کی باتیں مبنی برحق ہیں، ان کے اصول حقیقت کے آئینہ دار ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں وہ فی الواقع اللہ کا پیغام ہے اور جن عادات واطوار کے حامل ہیں وہ واقعی صحت واستواری لئے ہوئے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے فضائل ومناقب سن کر اور آپ کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد حضرت بسیرہ ایک روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اس وقت آپ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف فرما

تھے اور کچھ جاں نثار آپ کی خدمت میں حاضر تھے۔ حضرت بسیرہ نے سلام کیا اور ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ آپ نے آنے کا مقصد پوچھا تو عرض کیا چند باتیں دریافت کرنے کے لئے آئی ہوں۔ فرمایا کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔

عرض کیا: اسلام کیا ہے؟

فرمایا: اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو سچا ماننے اور ان پر ایمان لانے کا نام اسلام ہے۔

کہا: آپ لوگوں کو کیا تعلیم دیتے ہیں؟

فرمایا: یہ کہ کسی پر ظلم نہ کرو، مظلوم کی مدد کرو، ہمسائے کی ضرورتیں پوری کرو، اپنے ہاتھ اور اپنی زبان سے کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ، جو چیز اپنے لئے پسند کرتے ہو وہ دوسرے کے لئے بھی پسند کرو، زبان قابو میں رکھو، سچ بولو، کسی پر اتہام نہ باندھو، خدا کو ایک مانو اور اس کے رسول کی تابعداری کرو۔

یہ چند سیدھی سادی اور صاف باتیں تھیں جو بسیرہ کے دل میں اتر گئیں اور وہ کلمۂ شہادت پڑھ کر اسی وقت دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئیں۔

مسلمانوں کے لئے مکی زندگی آزمائش اور امتحان کی زندگی تھی۔ قبولِ اسلام کے بعد وہ باہر نکلیں تو حالات بالکل مختلف تھے اور لوگوں کی نظریں ان کے بارے میں بدلی ہوئی تھیں۔ اس وقت وہ جوانی کی حدود سے نکل کر کہولت کی سرحد میں داخل ہو رہی تھیں اور لوگوں پر ان کا خاصا اثر تھا۔ مگر اب انھوں نے دیکھا کہ جو لوگ چند لمحے قبل مدحت سرائی میں رطب اللسان تھے، اب یکایک مذمت پر اتر آئے ہیں اور جو معاون و مددگار تھے وہ دشمن اور درپے آزار ہوگئے ہیں۔ گھر اور باہر کی فضا متغیر ہوگئی ہے اور چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب کا لب ولہجہ تبدیل ہوگیا ہے۔ اب یہ اہل مکہ اور اپنے اعزہ واقارب سب کے نزدیک اجنبی تھیں اور ان کا کوئی بھی ہم درد نہ تھا۔ گھر والوں نے

روٹی پانی تک بند کردیا اور شدید تکلیفیں دینا شروع کردیں۔ایک روز جب تمام رشتے دار اور اہلِ محلّہ ان کے اردگرد جمع تھے اور انھیں مار پیٹ رہے تھے تو بولیں:

کیا تم مجھے محض اس لئے تکلیفیں پہنچا رہے ہو کہ میں مسلمان ہوگئی ہوں۔یاد رکھو اللہ ایک ہے، وہ وحدہ لاشریک ہے، اس کے پیغمبر برحق ہیں، محمد ﷺ اس کے سچے رسول ہیں، ان کی اطاعت ہر شخص پر فرض ہے۔میں صدق قلب سے ان کی اطاعت قبول کرچکی ہوں، اسلام میرے دل کی گہرائیوں میں اتر چکا ہے، مجھے دنیا کی کوئی طاقت اب اسلام کے دائرے سے باہر نہیں نکال سکتی۔

میں تمہارے ہاتھوں مرجانا قبول کرسکتی ہوں، لیکن اسلام کی دولت کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دوں گی۔میں یہ برداشت کرسکتی ہوں کہ تم میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دو، مجھے آگ میں جلا دو اور میری راکھ فضا میں اڑا دو، لیکن یہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتی کہ توحید کی نعمت کو چھوڑ کر دوبارہ کفر وشرک کی آلودگیوں کو قبول کرلوں۔میں نے اپنے ان کانوں سے محمد ﷺ کے ارشاداتِ عالیہ کو سنا ہے اور میری ان آنکھوں نے ان کو دیکھنے کا شرف حاصل کیا ہے، میں یقین رکھتی ہوں کہ وہ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں اور ان کی تمام باتیں صحیح ہیں۔میں سچ سے دست بردار ہوکر جھوٹ کو نہیں اپنا سکتی اور نیکی کے دائرے سے نکل کر برائی کے حصار میں نہیں آسکتی۔تم جو جی چاہے کرو، میرے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئے گی۔میں ثابت قدم رہوں گی اور میرے دل میں جو بات راسخ ہوچکی ہے، اب کسی صورت میں اس میں تزلزل نہیں پیدا ہوگا۔دیکھو میں تمہیں یہ بتادوں کہ میں سچی ہوں اور تم جھوٹے ہو۔میں مظلوم ہوں اور تم ظالم ہو۔مظلوم کی دعا اللہ کے ہاں شرف قبول سے محروم نہیں رہتی۔اس کی دعا سے عرشِ خداوندی کانپ جاتا ہے۔

حضرت بسیرہ رضی اللہ عنہا کی یہ تقریر زوردار تھی اور اس کے ایک ایک لفظ میں صداقت وخلوص پایا جاتا تھا، اس لئے وہ پیچھے ہٹ گئے اور انھیں اپنے حال پر رہنے دیا،

بلکہ کئی شخص یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ آخر اسلام میں ضرور صداقت ہوگی جو اتنے مصائب کے بعد بھی ایک عورت اسے ترک کرنا تو کجا اپنے موقف سے ذرا پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ اس کے نتیجے میں بعض لوگ مسلمان بھی ہوگئے اور انھوں نے حضرت بسیرہ کے سامنے اپنے اس عمل پر ندامت کا اظہار کیا۔ان کے عزیزوں میں سے جو لوگ مسلمان ہوئے وہ تبلیغِ اسلام کے سلسلے میں اب ان کے بہت بڑے معاون تھے۔

جب مکہ میں مسلمانوں کا رہنا ناممکن ہوگیا تو ہجرت مدینہ کی تیاری شروع سے ہوتی۔ حضرت یسیرہ بھی اپنے قرابت داروں اور متعلقین کے ساتھ ہجرت کی سعادت بہرہ مند ہوئیں۔ ہجرت کرنے والے میں ان کے بھائی، بیٹے، بہنیں اور بعض دیگر قریبی رشتے دار شامل تھے۔ان کے خاندان کے اکثر افراد اور خود انھوں نے مدینہ پہنچ کر ان جنگوں میں حصہ لیا جو مسلمانوں اور مخالفینِ اسلام کے درمیان لڑی گئیں۔ انھوں نے ابتدائی معرکوں یعنی بدر اور احد میں بھی شرکت کی اور دوسری لڑائیوں میں بھی شامل رہے۔ان کا خاندان جو ابتدا میں اسلام کا سخت دشمن تھا، بعد میں اسلام کا زبردست حامی ہوا اور یہ لوگ اسلام کی عزت و وقار کو محفوظ رکھنے کے لئے کوشاں ہوئے اور میدان عمل میں نکلے۔

حضرت بسیرہ رضی اللہ عنہا راویہ حدیث بھی ہیں اور ان سے رسول اللہ ﷺ کی کچھ احادیث مروی ہیں۔ پھر آگے ان کے شاگردوں کا سلسلہ چلا، جنھوں نے ارشاداتِ پیغمبر سے لوگوں کو آگاہ کیا۔

اپنے دور کی یہ ایک عظیم خاتون تھیں جنھوں نے عمل و حرکت کے کئی میدانوں میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

☆☆☆

حضرت ام اسحاق غنویہ رضی اللہ عنہا

اس خاتون کے حالات جن کے ہجرت کے موقع پر ان کے مشرک شوہر نے ان کے بھائی کو قتل کر دیا تھا اور اکیلے یہ مدینہ پہونچی تھیں۔

یہ جلیل القدر خاتون مکہ مکرمہ کی رہنے والی تھیں اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔علامہ ابن عبدالبر نے اپنی مشہور کتاب ''الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب'' میں اور دیگر مورخین نے اپنی تصنیفات میں ان کے حالات بیان کئے ہیں۔رسول اللہ ﷺ کے ہجرت کرنے کے بعد مسلمان ہوئیں اور اس کے نتیجے میں انھیں بہت سی تکلیفیں پہنچائی گئیں۔

ابتدا میں ان کے قبول اسلام کا کسی کو پتا نہیں چلا۔ایک روز اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھیں اور آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہی تھیں۔ان کے پڑھنے کی آواز والد کے کانوں سے ٹکرائی،وہ بیدار ہوا اور کان ان کی طرف لگا دیئے۔کچھ دیر تو وہ چپ چاپ سنتا رہا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اٹھ کر بیٹھ گیا اور بیٹی کو آواز دی،مگر کوئی جواب نہ آیا،اب باپ غصے سے بے تاب ہو گیا اور خشم گیں آواز میں بیٹی سے کہا۔

ام اسحاق ابھی ابھی تم یہ کیا پڑھ رہی تھی،کیا وہی جو یہاں محمد (ﷺ) پڑھا کرتے تھے اور جس کی پاداش میں انھیں اپنے آبائی وطن اور خاندانی مکانات سے نکلنا پڑا۔تم نہیں جانتی کہ انھیں اور ان کے ساتھیوں کو اس کے نتیجے کس درجہ خوف ناک نتائج بھگتنا پڑے ہیں۔انھیں اپنی جائدادوں سے دست کش ہونا پڑا اور اقرباء واعزہ سے جدائی اختیار کرنا پڑی اور دوسری جگہ جا کر پناہ لینا پڑی،تم اس کی تابعداری کر کے مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو،اگر تم اس سے باز نہ آئیں اور محمد (ﷺ) کی اطاعت سے کنارہ کشی

اختیار نہ کی تو میری برادری اور اہلِ شہر مجھے رسوا کریں گے۔

باپ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا مگر بیٹی بالکل خاموش رہی۔ باپ نے یہ سمجھ کر کہ بیٹی نافرمانی کی مرتکب ہورہی ہے اور میری بات کو نظر انداز کر رہی ہے مزید خفگی کا اظہار کیا اور کہا:

یاد رکھو میں برادری میں ذلیل نہیں ہوسکتا۔ میں باحمیت اور باغیرت آدمی ہوں اور لوگوں میں مجھے عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ آج تک کسی معاملے میں کسی کو مجھ سے شکایت کا موقع نہیں ملا۔ میں نے جن اصولوں کو اپنایا ہے انھیں کبھی ترک نہیں کیا۔ میری زندگی آئینے کی طرح صاف ہے اور اس سلسلے میں مجھے خاص مقام حاصل ہے۔ آج تم میری عزت خاک میں ملا رہی ہو اور شہرت کو داغدار کرنے کے درپے ہو۔ بہتر یہ ہے کہ اس نئے دین کو جس کا ہمارے آباء واجداد کے دین اور طرزِ عمل سے کوئی تعلق نہیں، ترک کردو، ورنہ میں تمہیں سنگین سزادوں گا اور ایسی اذیتیں پہنچاؤں گا جن کا تم تصور بھی نہیں کرسکتی ہو۔ میں جس چیز کو صحیح سمجھتا ہوں اس پر عمل کرنے کے بارے میں نہایت سخت ہوں اور جسے اپنے نقطۂ نگاہ سے غلط سمجھتا ہوں اسے حقارت سے ٹھکرا دیتا ہوں۔ اس ضمن میں کسی کی پسند یا ناپسند میرے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اپنے آباء واجداد کے دین کی روشنی میں میرے کچھ اصول ہیں جو میں نے اختیار کررکھے ہیں۔ اگر اس راہ میں کوئی رکاوٹ حائل ہوگی تو میں اسے دور ہٹادوں گا۔

باپ کے ان آخری فقروں نے بیٹی کو چونکا دیا اور وہ باپ کی تقریر کا جواب دینے پر مجبور ہوگئی۔ اسلام کی دولت سے بہرہ ور بیٹی نے سراپا نیاز ہوکر کہا:

آپ میرے لئے واجب التکریم شخصیت ہیں اور آپ کا احترام میرے لئے دو وجوہ سے ضروری ہے۔

اول: اس لئے کہ آپ میرے والد ہیں اور مجھے آپ کی توقیر کرنا چاہئے۔

دوم: اس لئے کہ میرے مذہب (اسلام) کا یہ حکم ہے کہ ماں باپ کی ہر حال میں عزت کی جائے اور کسی صورت میں ان کے احترام کے تقاضوں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

یہ عزت واحترام ہی کے تقاضے تھے جو مجھے مجبور کرتے تھے کہ میں زبان کو حرکت نہ دوں اور خاموشی سے آپ کی بات سنتی رہوں۔ اب بھی آپ کی عزت کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ صحیح آواز آپ کے کانوں تک پہنچا دوں تا کہ اتمامِ حجت ہو جائے اور میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کی مرتکب نہ قرار پاؤں۔

اے میرے قابل احترام والد! بات یہ ہے کہ میں اسلام قبول کر چکی ہوں اور میں نے دینِ محمد (ﷺ) کی حقانیت کا اقرار کر لیا ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ آباء واجداد کا دین اور ان کے رسوم وعوائد کوئی حیثیت نہیں رکھتے، اصل شے صداقت ہے۔ اگر صداقت ہمارے بڑوں کے مذہب میں نہیں پائی جاتی تو اسے ایک لمحے کے لئے بھی قبول نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بات اپنا وزن کھو بیٹھی ہے کہ جو کچھ بڑے کرتے رہے ہیں وہی صداقت ہے اور اسی کو اپنانا چاہئے۔ عین ممکن ہے ہمارے بڑے غلط راہوں پر چلتے رہے ہوں، ہمیں ان کی اتباع کر کے اپنے آپ کو غلط راہوں پر نہیں ڈالے رکھنا چاہئے، حق کی تلاش اصل مسئلہ ہے۔ اگر آج ہم حق کی تلاش میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور کسی شخص کی باتیں ہمارے ضمیر اور دل کو مطمئن کرتی ہیں تو انہیں قبول کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہئے۔ شروع شروع میں سچی بات کے اعلان میں واقعی کچھ اجنبیت سی محسوس ہوتی ہے اور ہمارے کان چونکہ اس سے آشنا نہیں ہوتے لہٰذا اس میں کچھ وحشت کا سا گمان ہونے لگتا ہے، مگر غور سے دیکھا جائے اور آباء واجداد کے تصورات سے بالا ہو کر اصل معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی سعی کی جائے تو تمام عقدے کھل جاتے ہیں اور راستے کی رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔

اے میرے معزز باپ! میں نے جو دین قبول کیا اور اپنے لئے منتخب کیا ہے، اس کی تعلیمات براہ راست دل کے دروازوں پر دستک دیتی ہیں۔ اس کا حکم ہے کہ چوری نہ کرو، کسی کو تنگ نہ کرو، دنیا میں خوں ریزی نہ کرو، اس عالم آب و گل میں فساد نہ پھیلاؤ، لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم نہ کرو، غصب ونہب کی عادتیں ترک کردو، ہمسایہ کے حقوق پورے کرو، انھیں تکلیف نہ پہنچاؤ، بڑوں کی عزت کرو، چھوٹوں پر رحم کھاؤ اور ان کے ساتھ شفقت ومہربانی کا برتاؤ روا رکھو، ظلم وستم سے باز آجاؤ، حلال وحرام کے درمیان امتیاز کرو، عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرو، سچ بولو اور جھوٹ کو ترک کردو۔

باپ جو چند لمحے پیشتر غضب ناک تھا اور بیٹی کو محض اسلام قبول کرنے کی وجہ سے ڈانٹ رہا تھا، اب حیرانی وتعجب کے عالم میں بیٹھا بیٹی کی باتیں سن رہا ہے اور اس کی کسی بات کو جھٹلانے کی جرأت نہیں کرتا۔ جب بیٹی بات ختم کر چکی تو باپ نے حیرت سے پوچھا: اسلام کے بارے میں جو تم کہہ رہی ہو کیا وہ سچ ہے؟ بیٹی نے مسرت آمیز لہجے میں جواب دیا، کیوں نہیں، اسلام کی یہی تعلیم ہے اور وہ اپنے پیرووں کو یہی سکھاتا ہے۔ باپ اسی وقت ایمان لے آیا۔

حضرت ام اسحاق غنویہ رضی اللہ عنہا نے مدینہ منورہ کی ہجرت کا شرف بھی حاصل کیا اور آنحضرت ﷺ کے وصال کے خاصا عرصہ بعد تک زندہ رہیں۔ انھوں نے خلفاء راشدین کا زمانہ دیکھا اور کئی جنگوں میں شرکت کا شرف حاصل کیا۔

اب حضرت ام اسحاق کی ہجرت کا واقعہ سنئے۔

وہ اپنے بھائی کے ساتھ مکہ سے مدینہ کو روانہ ہوئیں۔ ایک جگہ پہنچے تو بھائی نے کہا: تم یہاں ٹھہرو۔ ''میں اپنا نفقہ مکہ میں بھول آیا ہوں'' اسے لے آؤں۔

انھوں نے کہا: مجھے اپنے مشرک شوہر سے خطرہ ہے، وہ تمہیں کوئی تکلیف نہ پہنچائے۔

بھائی نے جواب دیا: اللہ نے چاہا تو میں اس کے شر سے محفوظ رہوں گا۔ کئی دن

وہ راستے میں رکی رہیں، لیکن بھائی واپس نہ آیا۔ ایک دن وہاں سے ایک شخص گزرا جسے انھوں نے پہچان لیا۔ اس نے پوچھا۔

ام اسحاق! تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟

جواب دیا: اپنے بھائی کے انتظار میں بیٹھی ہوں، جو کئی دن سے مکہ گیا ہے، واپس نہیں آیا۔

اس نے کہا: تیرے بھائی کو تیرے شوہر نے قتل کر دیا ہے۔

یہ سن کر ام اسحاق کو سخت افسوس ہوا، وہاں سے چلیں اور نہایت تکلیف کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچیں۔ مسجد نبوی میں گئیں تو نبی ﷺ وضو کر رہے تھے۔ روتے ہوئے آپ کو بھائی کے قتل کی اطلاع دی۔ آپ نے سن کر پانی کا چلو بھرا اور ان کے چہرے پر چھڑک دیا۔ آگے حضرت ام حکیم بیان کرتی ہیں کہ اس واقعہ کے بعد حضرت ام اسحاق کو ایسی تسکین حاصل ہوئی کہ ان پر کوئی بڑی سے بڑی مصیبت بھی آ پڑتی تو روتی نہیں تھیں۔ اللہ انھیں صبر دیتا تھا۔

☆☆☆

حضرت ام زیاد اشجعی رضی اللہ عنہا

ایک بے خوف اور جری خاتون جو طب و جراحت میں مہارت رکھتی تھیں اور جنگ خیبر میں چرخہ کات کر مجاہدین کی مدد کی تھی۔

حضرت ام زیاد اشجعی رضی اللہ عنہا ان چھے (٦) خواتین میں سے ایک ہیں جن کی شجاعت و بہادری کی خصوصیت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے سامنے تعریف کی گئی اور بتایا گیا کہ ان کا شمار مدینہ کی ان صحابیات میں ہوتا ہے جو میدانِ جنگ میں اپنی خداداد بسالت کے جوہر بھی دکھاتی ہیں اور مجاہدین کی خدمت کے فرائض بھی انجام دیتی ہیں، چنانچہ ابن اثیر نے ''اسد الغابہ'' میں اور حافظ ابن حجر نے ''اصابہ'' اور ''تہذیب التہذیب'' میں لکھا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے غزوۂ خیبر کے موقعے پر ان کو پیغام بھیجا اور اپنے ہاں طلب فرمایا۔ یہ حاضر ہوئیں تو آپ نے فرمایا:

میدانِ خیبر میں جاؤ گی؟

عرض کیا: یارسول اللہ ضرور حاضر ہوں گی۔

فرمایا: وہاں کیا خدمت انجام دو گی؟

کہا: ہمارے پاس ایسی دوائیں ہیں جن سے زخمی مجاہدین کی مرہم پٹی کریں گی، انھیں تیر اٹھا اٹھا کر دیں گی اور ان کی کمانوں پر ڈال لیں گی، ان کو پیاس محسوس ہوگی تو ستو پلائیں گی، ان کے حوصلے بڑھانے کے لئے شعر پڑھیں گی اور اللہ کی راہ میں دوسری ضروری خدمات انجام دیں گی۔

یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

فوراً تیار ہو جاؤ اور میدانِ جنگ کی طرف چل پڑو۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد سن کرام زیاد اسی وقت تیار ہوگئیں اور خیبر میں پہنچ گئیں۔ جب مجاہدین کی کوششوں اور اللہ کی نصرت سے خیبر فتح ہوگیا تو آنحضرت ﷺ نے ان کو بھی اسی طرح مال غنیمت سے حصہ دیا جس طرح مردوں کو دیا، کیونکہ ان کی قربانیوں اور جدوجہد کو آنحضرت ﷺ نے اسی نوعیت کی قربانیاں اور کوششیں قرار دیا جس نوعیت کی مردوں کی قربانیاں تھیں۔

حضرت ام زیاد اشجعی رضی اللہ عنہا نے خیبر کے علاوہ دیگر معرکوں میں بھی حصہ لیا اور ان میں بھی اسی قسم کی خدمات انجام دیں۔ مدینہ منورہ میں یہ خاص شہرت کی حامل تھیں۔ لوگوں پر مردوں کی طرح ان کا دبدبہ تھا۔ آواز میں زور تھا، کسی سے مرعوب نہ ہوتی تھیں خلافِ شریعت بات دیکھتیں تو تڑپ اٹھتیں، سچی بات کہنے میں کسی کی رعایت نہ کرتیں۔ فرمایا کرتیں کہ اگر رسول اللہ ﷺ کلمۂ حق کہنے میں کسی کی رعایت کرتے یا مصلحت کو ملحوظ رکھتے تو اسلام کبھی نہ پھیل سکتا۔ عمل میں ڈھیل اور سستی انھیں سخت ناگوار تھی۔ اگر کہیں قول وفعل میں تضاد دیکھتیں تو خفگی کا اظہار کرتیں۔ پاکیزگیِ کردار اور صدقِ مقال پر بہت زور دیتیں۔ عورتیں عمل کے سلسلے میں عام طور پر ڈھیلی ہوتی ہیں، اس لئے ان کو بالخصوص یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کرتیں کہ اللہ کے نزدیک اصل شے عمل ہے، جتنا کوئی عمل میں اونچا ہوگا اسی قدر اللہ کے ہاں عزت واحترام کا مستحق قرار پائے گا۔ انسان کے جوہر میدانِ جنگ میں کھلتے ہیں اور دشمن کے مقابلے میں جا کر معلوم ہوتا ہے کہ بہادری وشجاعت کیا شے ہے اور دل کی مضبوطی کس چیز کا نام ہے۔

اسی جنگ خیبر میں شامل ہونے کے لئے ان سے خود رسول اللہ ﷺ نے خواہش ظاہر کی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ مرد عورتوں سے بہت آگے ہیں، وہ میدان جنگ میں تلوار چلاتے ہیں اور اسلام کی خدمت کے لئے سخت صعوبتیں برداشت کرتے ہیں، لیکن اس

خیال میں پوری طرح ایسے لوگوں کے ہم آہنگ ہونا مشکل ہے۔حقیقت یہ ہے کہ عمل وحرکت کے میدان میں عورتیں مردوں سے پیچھے نہیں ہیں، بلاشبہ مرد شمشیر بکف ہوتے ہیں اور دشمن کے مقابلے میں نکل کر شہادت کا درجہ حاصل کرتے ہیں یا غازی کہلاتے ہیں،مگراس ضمن میں عورتیں بھی ان کے برابر کی شریک ہیں۔اگر مردوں کے ہاتھ میں تلوار ہے تو یہ بات کیوں نظرانداز کردی جاتی ہے کہ اس تلوار کی دھار کو تیز کرنے کے لئے عورت کے ہاتھ حرکت میں آتے ہیں۔اگر وہ تیر چلاتے ہیں اور معرکۂ کارزار گرم ہوتا ہے تو انھیں یہ تیر کمان میں جوڑنے کے لئے عورت عطا کرتی ہے۔مجاہد پانی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو عورت کا ہاتھ آگے بڑھ کر پانی کا پیالہ ان کے منہ میں لگاتا ہے۔وہ زخمی ہوتے ہیں تو عورت ان کی مرہم پٹی کے فرائض انجام دیتی ہے۔مجاہد بھوک سے دوچار ہوتو عورت اس کے لئے روٹی مہیا کرتی ہے۔عورت کی اہمیت کو کم نہ سمجھو اور انھیں کم زور وناتواں نہ خیال کرو،عورت کا وجود اپنی جگہ مستقل حیثیت رکھتا ہے۔فتح اور شکست کے معاملات مردوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور عورتوں پر بھی۔رسول اللہ ﷺ نے عورت کی حیثیت کا خاص طور سے خیال رکھا ہے۔اس وقت آنحضرت ﷺ کے فرمان کے مطابق میدان جنگ میں آتی تھیں اور خدمات انجام دیتی تھیں۔

حضرت ام زیاد ایک بے خوف اور جری صحابیہ تھیں اور بلند افکار وخیالات کی مالک۔وہ طب اور جراحت میں مہارت رکھتی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔

رسول اللہ ﷺ کے وصال کے کئی سال بعد تک زندہ رہیں،انھوں نے جہاد کے فضائل بیان کرنا اور لوگوں کو اس کے لئے آمادہ وتیار کرنا ایک طرح سے اپنے آپ پر فرض قرار دے لیا تھا۔صحابہ ان کی جرات وبسالت کی بنا پر ان کی انتہائی تکریم کرتے تھے۔

یہ قبیلہ بنو اشجع سے تعلق رکھتی تھیں۔صحیح مسلم اور ابوداؤد میں بیان کیا گیا ہے کہ جنگ خیبر میں انھوں نے پانچ دوسری صحابیات کی رفاقت میں چرخہ کات کر مجاہدین کی مدد کی تھی۔

☆☆☆

حضرت فاطمہ بنت ولید رضی اللہ عنہا

ایک فصیح اللسان اور بلیغ اللسان خاتون جن کے اشعار دشمن کے لئے شمشیر برہنہ سے کم نہ تھے۔

حضرت فاطمہ بنت ولید بن مغیرہ رضی اللہ عنہا کے حالات تاریخ طبری، طبقات ابن سعد، سیرت ابن ہشام، ابن اثیر کی ''اسد الغابہ'' اور حافظ ابن حجر کی ''الاصابہ'' میں مذکور ہیں۔ یہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں جو عسکر اسلام کے مشہور سپہ سالار تھے اور جن کی بہادری اور جنگی صلاحیتوں کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے سیف من سیوف اللہ کا خطاب عطا فرمایا تھا۔

ابتدا میں فاطمہ بنت ولید اسلام اور مسلمانوں کی شدید مخالف تھیں اور مسلمانوں پر کفار نے جو حملے کئے ان میں وہ باقاعدہ شریک ہوتی تھیں اور اپنے بھائی خالد کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کرتی تھیں۔ غزوۂ احد یعنی ۳ ہجری میں بھی انھوں نے شرکت کی اور مسلمانوں کے مقابلے میں کفار کا ساتھ دیا۔ ۸ ہجری میں فتح مکہ کے موقع پر حلقہ بگوشِ اسلام ہوئیں اور رسول اکرم ﷺ کی بیعت کا شرف حاصل کیا۔ قبولِ اسلام کے بعد ان کی دنیا بالکل بدل گئی۔ اسلام سے قبل جس زور کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کرتی تھیں، مسلمان ہونے کے بعد اسی زور اور شدت کے ساتھ ان کی حمایت اور مخالفینِ اسلام کی مخالفت کرنے لگیں۔ تبلیغِ اسلام کے سلسلے میں اکثر مردوں سے بھی آگے نکل جاتیں۔ مدینہ منورہ کے قرب و نواح کی بستیوں اور مختلف قبائل میں جا کر لوگوں کو اسلام سے روشناس کراتیں اور اس میں شامل ہونے کی دعوت دیتیں۔ عالی حوصلہ اور جرأت مند خاتون تھیں۔ کسی قسم کے خوف اور خطرے کا احساس نہ کرتیں۔

فاطمہ بنت ولید فصیح البیان اور بلیغ اللسان خاتون تھیں۔ میدانِ جنگ میں

فوجیوں کو دشمن کے مقابلے میں ابھارنے اور ڈٹ جانے کے لئے اس قسم کے شعر پڑھتیں کہ لوگ تعجب کا اظہار کرتے۔ بسا اوقات دشمن انھیں جنگ میں دیکھ کر ہی پریشان ہو جاتے، کیونکہ ان کے اشعار ان کے لئے شمشیرِ برہنہ سے کم نہ تھے۔ گفتار میں بڑی تیز اور مستعد تھیں۔

عقل و فراست اور معاملہ فہمی میں بھی مشہور تھیں۔ ان کی شادی ایک شخص حارث بن ہشام کے ساتھ ہوئی تھی۔ فتحِ شام کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ شام کے علاقے میں چلی گئی تھیں۔ کس درجہ دور اندیش اور اصابت فکر ورائے کی مالک تھیں اس سلسلے میں اتنا جان لینا کافی ہے کہ بعض جلیل القدر صحابہ اہم امور میں ان سے مشورہ کے طالب ہوتے اور پھر ان کی رائے اور مشورے پر عمل کرتے۔ خود ان کے بھائی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اکثر امور مہمہ میں ان سے مشورہ لیتے۔ چنانچہ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید کو عسکرِ اسلام کی سپہ سالاری کے منصب سے معزول کر دیا تو وہ اپنی اس بہن حضرت فاطمہ کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ اب انھیں کیا کرنا چاہئے؟ انھوں نے جواب دیا:

امیر المومنین آپ کو معزول کر چکے ہیں، اب وہ ہرگز یہ نہیں چاہیں گے کہ آپ کو دوبارہ اس منصب پر فائز کیا جائے، اگر آپ نے ان کے حکم کی تعمیل میں تامل کیا تو وہ آپ پر عائد کردہ الزامات میں آپ کو مجرم ثابت کریں گے اور آپ ان کی جرح وتعدیل کے پیمانے پر پورے نہ اترے تو آپ سے جبراً یہ منصب چھین لیں گے اور آپ کو خطاوار ثابت کریں گے۔ اس سے مسلمانوں میں اختلاف کی راہیں کھلیں گی اور انتشار کے لئے فضا ہموار ہوگی۔ میں یہ مشورہ نہیں دے سکتی کہ آپ کی ذات مسلمانوں میں اختلاف و انتشار کا باعث بنے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ بہن کے اس مخلصانہ مشورے پر بہت خوش ہوئے اور ان کا سر چوم لیا اور بولے:

فاطمہ! واللہ تم نے سچ کہا۔

اس کے بعد خاموشی سے اپنے منصب سے الگ ہوگئے اور اپنے آپ کو الزامات کی گرفت میں آنے سے بچالیا۔

حضرت فاطمہ بنت ولید رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے احادیث بھی روایت کیں جو کتبِ حدیث میں منقول ہیں اور پھر خود ان سے بھی بعض حضرات نے آنحضرت ﷺ کی احادیث کا سماع کیا جو آگے اپنے شاگردوں سے بیان کیں۔ ان کے شاگردوں میں ان کے پوتے ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام بھی شامل ہیں۔ حدیث وسنت کے بیان کا انھیں بہت شوق تھا اور وہ اپنے شاگردوں کو آنحضرت ﷺ کے فرامین واقوال تفصیل سے بتاتی تھیں۔

فاطمہ ایک شجاع خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس لئے بنیادی طور پر اسی موضوع سے ان کو زیادہ دلچسپی تھی۔ چنانچہ مختلف غزوات کے واقعات ذوق ورغبت سے بیان کرتیں اور اس کی تفصیلات ایک تسلسل کے ساتھ لوگوں کو بتاتیں۔

عورتوں کو ان صحابیات کے حالات بھی بتاتیں جنھوں نے جنگ بدر، جنگ احد، جنگ خیبر یا دوسری ان جنگوں میں شرکت کی جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں لڑی گئیں۔ ان کے واقعات سنانے کے بعد انھیں جہاد کی تلقین کرتیں اور کہتیں کہ تمھارے اسلاف (مردوں اور عورتوں) نے اسلام کی نشر واشاعت کے لئے جنگ و جہاد میں اتنا حصہ لیا کہ اس میں اپنی تمام کوششیں وقف کردیں۔ بتاؤ اس کے مقابلے میں تمھاری کیا حالت ہے؟ تم بھی اس میدان میں اپنی جرأت کے جوہر دکھاؤ اور اپنے بچوں کو بھی اسی قسم کی تربیت دو۔

ان کی وفات کب ہوئی اور کس سال ہوئی؟ اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ چونکہ یہ مدینہ منورہ سے شام کے علاقے میں تشریف لے گئی تھیں، اس لئے وہیں رہیں اور اسی علاقے میں خاصی عمر پاکر انتقال کیا۔

☆☆☆

حضرت اروی بنت حارث رضی اللہ عنہا

وہ بہادر خاتون جن کے سامنے معاویہ اپنے آپ کو بے بس پاتے تھے۔ جن کی زبان کی کاٹ تلوار سے تیز تھی اور باتیں صداقت پر مبنی تھیں۔

یہ خاندانِ بنو ہاشم کی رفیع المرتبت خاتون اور رسول اللہ ﷺ کی چچازاد بہن تھیں۔ فصاحت و بلاغت میں یگانۂ روزگار تھیں اور ادیبہ وشاعرہ تھیں۔ ان کے حالات طیفور کی ''بلاغات النساء'' اور ابن عبور کی ''العقد الفرید'' میں مرقوم ہیں۔ لیکن یہ حالات مختصر ہیں اور صرف وہی ہیں جن کا تعلق ان کی فصاحت و بلاغت اور ادب وشعر سے ہے، نیز ان کے ان واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کو پیش آئے۔ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں تو نہایت سختی سے پیش آئیں۔ اس وقت بہت بوڑھی ہو چکی تھیں اور ضعف ونقاہت نے پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ کمر جھک گئی تھی، سر ہلتا تھا اور چہرے پر جھریوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ لیکن آواز گرج دار اور بارعب تھی۔ رگوں میں خونِ بنی ہاشم دوڑ رہا تھا، جس نے ڈر اور خوف کو دل سے نکال دیا تھا۔ لاٹھی کے سہارے چلتے ہوئے حضرت معاویہ کے مکان پر گئیں۔ دروازے پر دستک دی، حضرت معاویہ باہر آئے، اندر لے جا کر احترام سے بٹھایا اور عرض کیا۔

پھوپھی! مجھے آپ کی تشریف آوری سے بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے یہاں آ کر مجھے شکریے کا موقع دیا ہے۔ آپ نے آج مجھ پر جو احسان فرمایا ہے، اس پر اظہارِ تشکر کے لئے اپنے پاس الفاظ کی قلت محسوس کرتا ہوں۔ میرے متعلق کوئی حکم ہو تو ارشاد فرمائیے۔

حضرت معاویہ نے بات ختم کی تو تیزی سے بولیں:

بھتیجے! تمھاری اب کیا حالت ہوگئی ہے۔تم اپنے آپ کو کس دنیا کا انسان سمجھنے لگے ہو۔تمھیں معلوم ہے تم وہی ستو پینے والے، اونٹ پر سوار ہونے والے اور عرب کے تپتے ہوئے صحرا میں سورج کی تیز دھوپ میں سفر کرنے والے ایک عرب ہو۔تم اپنے گزشتہ دور کو بھول گئے ہو، امارت وخلافت نے تمھاری دنیا بدل ڈالی ہے۔اللہ نے تم پر جو احسان کیا ہے اس کی ناقدری پر تلے ہوئے ہو،تم نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل کیا اور آپ کی رفاقت میں رہنے کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے، لیکن ان کے قوانین واحکام کو نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔تم کو اللہ نے اقتدار بخشا تھا کہ لوگوں کی خدمت کرو، کم زوروں کا خیال رکھو، ضرورت مندوں کو بے نیاز کردو محتاجوں کو غنی کردو، بے کاروں کو کاروبار مہیا کرو، اللہ کے ارشادات کی خود پابندی کرو اور اپنے اہل وعیال اور خاندان کو بھی پابند رہنے کا حکم دو، متکبروں کا تکبر ختم کرو، مغروروں کے غرور کو مٹی میں ملادو۔اپنی اور اپنے خاندان کی ضروریات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دو، کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ، نیکی کو پھیلاؤ اور برائی کا خاتمہ کرو۔مگر تم نے ان تمام چیزوں کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔تمھاری حکومت میں تمھارے حواری اور تمھاری ہاں میں ہاں ملانے والے من مانی کارروائیاں کر رہے ہیں اور تمھارے اعزہ واقرباء نے لوگوں کو مصیبت میں ڈال رکھا ہے،تم ظلم وستم کے تمام واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور خاموش ہو۔آخر یہ کیوں ہے؟

معاویہ یادرکھو! یہ حکومت ہمیشہ رہنے والی نہیں اور یہ دولت ناقابل اعتماد ہے۔ ایسا نہ ہو کہ خود یہی حکومت وفرماں روائی اور مال ودولت کی یہی کثرت تمھارے لئے مصیبت کا باعث بن جائے اور تمھیں اپنا دفاع کرنا آسان نہ رہے۔یہ حکومت اللہ کی امانت ہے اور اللہ اسے ایسے لوگوں کے سپرد کرے گا جو اس کے اہل ہوں اور اس کے

دین کی تبلیغ واشاعت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں اور ان کا مقصد وحید، اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا ہو، تمھیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اللہ کے دین اور اس کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کا دین ہمیشہ غالب رہے گا اور اس کے مددگاروں سے کبھی دنیا خالی نہ ہوگی۔ اس کا دین ہی منصور ہوگا، اگر چہ اس کے مخالف کتنا ہی برا سمجھیں۔ ہم اہل بیت ہیں اور ہمارا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ہم نے اللہ کے دین کی ہر موقع پر مدد کی ہے، تم عام لوگوں کی طرح کے ایک ادنیٰ آدمی تھے، ہماری وجہ سے تمھیں حکومت واقتدار کی یہ مسند نصیب ہوئی، آج تم ہو کہ ہم لوگوں کی مخالفت پر اتر آئے ہو۔ جو حکمراں کم زور کا خیال نہیں رکھتا، مظلوم کی مدد کو نہیں پہنچتا اور خوش حالی کے مواقع دوسروں کو نہیں دیتا بلکہ خود ہی دولت و ثروت کو سمیٹنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھاتا ہے، اس کا اقتدار عارضی ہے اور اس کی امارت وخلافت کی مدت مختصر ہے۔ دوسرے کے حقوق غصب کرنا سب سے بڑی برائی ہے۔ اگر تمھارے دل میں اللہ کا ذرا بھی خوف باقی ہے تو سیدھی راہ پر آ جاؤ اور سلطنت کے تمام لوگوں کو ایک سا درجہ دو، کسی کو کم زور اور کسی کو اونچا سمجھنا ناقابلِ عفو جرم ہے۔

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی اس وقت موجود تھے۔ حضرت اروی بنت حارث رضی اللہ عنہا کی یہ تقریر انھیں ناگوار گزری اور کہا:

بڑھیا زبان بند کرو اور نظریں نیچی کرو۔

حضرت اروی رضی اللہ عنہا اس تلخ کلامی کو برداشت نہ کر سکیں اور غصے سے عرب کے مروجہ محاورے کو استعمال کرتی ہوئی بولیں:

تمھاری ماں تمھیں گم پائے، تم کون ہو؟

کہا: میں عمرو بن عاص ہوں۔

بولیں: تم مجھ سے مخاطب ہونے کی جرات کرتے ہو، تم معمولی حیثیت کے آدمی تھے اور تمہارے اندر کوئی نمایاں خوبی نہ تھی، نہ تم قریش میں معزز تھے، نہ تمھیں اور

جگہ کہیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، نہ تم سخی تھے اور نہ بہادر و جری تھے۔ تمھیں کہیں کا گورنر (عامل) بنا دیا گیا، تو آپے سے باہر ہو گئے ہو اور معززین سے اس انداز سے بات کرتے ہو، میں تمھارے خاندان اور حسب و نسب کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم اس قابل نہیں کہ مجھ سے مخاطب ہونے کی جرأت کرو۔

مروان بن حکم بھی اسی مجلس میں بیٹھے تھے۔ انھوں نے سختی سے کہا:

بڑھیا! تم اب عمر کی اس منزل میں پہنچ گئی ہو کہ تمھاری عقل رخت سفر باندھ گئی ہے، تم اتنے بڑے لوگوں کو آنکھیں دکھاتی ہو، خاموش ہو جاؤ، تم زندگی کے اس موڑ پر ہو کہ تم میں خرد و دانش باقی نہیں رہی۔ لہٰذا تمھاری شہادت بھی نا قابلِ قبول ہے۔

بولیں: بیٹا میں تم سے اور تمھارے خاندان سے خوب آگاہ ہوں۔ میں نے تمھارے باپ حکم کو دیکھا ہے وہ جرأت و مردانگی کے کسی زاویہ میں بھی پورا نہیں اترتا تھا۔ کوئی شخص اس سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔ اب تم اقتدار میں ہو تو بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہے ہو، ہم اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے نزدیک تمھیں کوئی وقعت حاصل نہیں اور میں تمھیں لائقِ التفات نہیں سمجھتی۔

اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئیں اور کہا:

معاویہ! ان لوگوں نے جو میری بے عزتی کی ہے، اس کے ذمہ دار تم ہو، تمھیں معلوم ہے جنگ احد کے وقت مسلمانوں میں آثارِ ہزیمت پیدا ہوئے تو تمھاری ماں نے وہ شعر کہے تھے جن میں مخالفینِ اسلام کی فتح اور مسلمانوں کی شکست پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ آج ہم نے جنگ بدر کا انتقام لے لیا ہے۔ ہم اتنے بہادر اور تیغ زن ہیں کہ مخالف ہم سے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتا۔ جو بھی ہمارے سامنے آئے گا شکست سے دوچار ہو گا۔

اس طرح اس نے متعدد اشعار میں مسلمانوں کو ہدفِ طعن ٹھہرایا تھا اور اپنی

شجاعت کے کارنامے گنائے تھے اور پھر تم کو یاد ہے کہ میں نے اس کو جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ تمھاری یہ جیت عارضی ہے۔ آثار بتا رہے ہیں کہ کفر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا اور اسلام کا جھنڈا بلند ہوگا، جس طرح تمھیں بدر کے میدان میں ذلت آمیز شکست ہوئی تھی، اسی طرح دوسرے معرکوں میں بھی تمھیں ہزیمت ونکبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہمارے بہادر تمھیں ختم کر کے رکھ دیں گے اور ہماری تلواریں تمھارے سروں کو تن سے جدا کرنے میں تاخیر سے کام نہیں لیں گی۔

اس موقع پر حضرت اروی بنت حارث رضی اللہ عنہا نے ہند کے اشعار بھی پڑھ کر سنائے جو اس نے جنگ احد کے دن مسرت آمیز لہجے اور فخریہ انداز میں پڑھے تھے۔ وہ شعر بھی پڑھے جو اس کے جواب میں خود انھوں نے پڑھے تھے۔

اب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، عمرو بن عاص اور مروان بن حکم کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا تم کیسے آدمی ہو، تم نے ایک ناخوش گوار بحث کا آغاز کر کے حضرت اروی رضی اللہ عنہا کو بات کہنے کا موقع دیا اور ان کی زبان سے مجھے ایسی باتیں کہلوائیں جو میں سننا نہیں چاہتا تھا۔

بعد ازاں اروی سے کہا پھوپھی! فرمایئے کس طرح تشریف آوری ہوئی؟ آپ کا جو مقصد ہو وہ بلا تکلف بیان کیجئے۔ انھوں نے آنے کا مقصد بتایا اور بات ختم ہو گئی۔

حضرت معاویہ نے کہا: بنو ہاشم کی عورتیں مردوں سے کہیں زیادہ فصیح ہیں اور بلاغت ان کی گھٹی میں رچی ہوئی ہے۔ ان کی زبان میں روانی اور کلام میں جوش ہے، کوئی شخص اگر چہ کتنا بھی فصیح ہو، ان سے تابِ مکالمت نہیں رکھتا۔ اس خاندان میں شجاعت وجرأت بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ نبوت کے لئے بھی اللہ نے اسی خاندان کو منتخب فرمایا، جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس میں فصاحت و بلاغت کے جو جوہر پائے جاتے تھے عرب کے کسی خاندان میں نہیں پائے جاتے۔ ان سے گفتگو کے لئے ضروری ہے کہ

انسان خاندانی کمزوریوں سے بھی پاک ہو اور ادب وزبان کے مختلف پہلوؤں پر بھی اس کا غلبہ ہو۔ ان کی عورتوں سے اندازہ کیجئے، ان کے مرد کتنے جری اور فصیح و بلیغ ہوں گے۔ میں اپنے آپ کو قادر الکلام سمجھتا ہوں اور ہر شخص کو پورا پورا جواب دے سکتا ہوں، لیکن بنو ہاشم کی اس معمر خاتون کے سامنے خود کو بے بس پاتا ہوں۔ اس کی زبان کی کاٹ تلوار سے تیز ہے اور اس کی باتیں صداقت پر مبنی ہیں۔

جب وہ جانے لگیں تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے چھے ہزار (6000=00) دینار ان کی خدمت میں پیش کئے اور کہا میں آپ کا معمولی خادم ہوں، آپ کی نیک دعاؤں کی متمنی ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ آپ مجھے یاد رکھیں گی۔ آپ جس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، وہ معزز خاندان ہے اور اللہ نے اسے بہت سے اعزاز بخشے ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ انھیں دور تک چھوڑنے گئے اور اپنے عجز و انکسار اور ان کے علوِ مرتبت کا اظہار کیا۔

☆☆☆

بکارہ ہلالیہؒ

وہ بہادر خاتون جس نے اپنے اشعار میں کہا تھا ''بنو امیہ حق دار خلافت نہیں ہیں یہ اتنا بڑا اعزاز انہیں زیب نہیں دیتا''۔

حضرت بکارہ ہلالیہ کا شمار عرب کی ان خواتین میں ہوتا ہے جو شجاعت و بسالت اور فصاحت و بلاغت میں خاص شہرت کی مالک تھیں اور جن کی یہ خوبیاں زبان زد عام تھیں۔ شعر و شاعری، نظم و نثر، خطابت اور انتخابِ الفاظ میں وہ اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔

یہ بہادر خاتون جنگ صفین میں شریک ہوئیں اور خوب دادِ شجاعت دی۔ اس جنگ میں یہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامیوں میں سے تھیں۔ انھوں نے اس جنگ میں حضرت علیؓ کے حامیوں میں زوردار تقریریں کیں اور جب معرکۂ کارزار گرم تھا، بلاخوفِ خطر ایسے مقامات پر پہنچتیں جہاں موت کی وادی بالکل قریب نظر آنے لگتی، نہ ان کے دل میں کوئی دہشت پیدا ہوتی اور نہ مخالفین کی تلواریں ان کا راستہ روک سکتیں۔

بکارہ میں صرف یہی خوبی نہ تھی کہ فصاحت و بلاغت اور بہادری و بے خوفی میں ان کا کوئی حریف نہ تھا بلکہ زہد و عبادت اور خوفِ خدا میں بھی اپنی نظیر نہ رکھتی تھیں۔ صادق القول اور حد درجے کی حق گو تھیں۔ جان بچانے یا اپنے تحفظ کے لئے کوئی ایسا قدم نہ اٹھاتیں جو کسی صورت میں غیرتِ ایمانی اور عزتِ نفس کے خلاف ہوتا۔ عہدِ طفولیت بھی نیکی کے ماحول میں گزرا، جوانی بھی بہترین حالات میں بسر ہوئی اور کہولت کی منزلیں بھی صاف ستھرے انداز سے طے کیں۔

ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس مروان بن حکم اور عمرو بن

العاص بیٹھے تھے،انھوں نے دیکھا کہ ایک عورت آ رہی ہے،عمر کے بوجھ سے جس کی کمر جھکی ہوئی ہے،ہڈیوں سے گوشت اتر چکا ہے،آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں،ہاتھ میں چھڑی پکڑ رکھی ہے اور دو خادم سہارے دیئے ہوئے ہیں۔حضرت معاویہ کے قریب آئیں تو وقار و تمکنت کے ساتھ بولیں:

السلام علیکم

معاویہ دیکھ کر احتراماً کھڑے ہوگئے۔نہایت تکریم کے الفاظ میں سلام کا جواب دیا اور ادب سے عرض کیا:

تشریف رکھئے۔

مروان نے کہا امیر المومنین!انھیں پہنچانتے ہیں،یہ کون ہیں؟

معاویہ نے پوچھا:

کون ہیں؟

کہا:وہی جو صفین کی جنگ میں ہماری مخالفت کر رہی تھیں اور جب معرکہ کارزار گرم تھا تو یہ شعر پڑھے تھے۔

''اے وہ لوگو جو ہماری امداد کے لئے گھروں سے نکلے ہو،تیز اور کاٹ دینے والی تلواروں کو میان سے نکال لو''۔

''اور ان تلواروں کو اس زور اور عجلت سے چلاؤ کہ دشمن کو ختم کر دیں اور ان کی لاشیں مٹی میں تڑپنے لگیں''۔

''آج فیصلے کا دن ہے،اس میں طاقت کے جوہر دکھاؤ اور مخالفوں کو ہرگز دم نہ لینے دو''۔

''اپنی صفیں آراستہ کرلو،مضبوط دیوار کی طرح کھڑے ہو جاؤ اور دشمن کے سینے چیر دو''۔

عمرو بن العاص نے کہا:امیر المومنین یہ وہی بڑھیا تو ہے جس نے کہا تھا۔

''کیا ابن ہند (معاویہ) بھی کہیں خلافت کا مستحق ہوسکتا ہے۔سخت افسوس ہے اس کے ارادے صحیح نہیں''۔

''وہ انتہائی خودفریبی میں مبتلا ہے۔عمرو اسے دھوکا دے رہا ہے اور سعید اس کا غلط مشیر ہے''۔

''اس کے اس خیال کی بلند پروازی کا خاتمہ کردو۔بہادرو اس کے مقابلے میں علی (رضی اللہ عنہ) بے مثال اور بہترین انسان ہیں''۔

سعید نے عرض کیا: امیر المومنین یہ اشعار اسی نے تو پڑھے تھے۔

''بنوامیہ حقِ دار خلافت نہیں ہیں۔یہ اتنا بڑا اعزاز انھیں زیب نہیں دیتا''۔

''زمانے نے کیسی عجیب وغریب کروٹ بدلی ہے کہ اب یہ لوگ ہمارے مقابلے کو نکلے ہیں۔ان کو ہرگز کامیابی سے ہم کنار نہ ہونے دو اور ہر صورت میں آلِ محمد (ﷺ) کی امداد کرو''۔

''یادرکھو! محمد اور آل محمد (ﷺ) نے بھوکے رہ کر شجرِ اسلام کی آبیاری کی ہے، انھیں کبھی دھوکا نہ دو''۔

جب وہ خاموش ہوگئے تو حضرت بکارہ ہلالیہ بولیں: معاویہ! تم نے ان کی زبانی میرا کلام سن لیا۔میں نے نہ صرف یہ اشعار پڑھے تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بہت باتیں کہیں تھیں اور میں اسے صحیح سمجھتی تھی۔افسوس ہے ان لوگوں نے سب باتیں بیان نہیں کیں اور ان کے حافظے نے میرے ضروری اشعار بھی یاد نہیں رکھے۔میں معذرت کے لئے تمھارے پاس نہیں آئی اور نہ کسی نوع کی ندامت کا اظہار کرتی ہوں۔میں ان باتوں کی تردید نہیں کرتی، تصدیق کرتی ہوں۔مجھے افسوس ہے، اب میرے خون میں وہ روانی باقی نہیں رہی، میری صحت جسمانی جواب دے گئی ہے اور میری بینائی کم زور پڑگئی ہے۔تم جو جی چاہے کرلو۔میں نے تمہاری مخالفت میں کوئی دقیقہ، فروگزاشت نہیں کیا۔

اس خاتون کی جرأت کی داد دیجئے اور ساتھ ہی حضرت معاویہ رضی اللہ کا حوصلہ دیکھئے، فرماتے ہیں:

بکارہ آپ میرے نزدیک بدرجہ غایت قابلِ احترام ہیں۔ میں آپ کی توقیر کو حاصل زندگی سمجھتا ہوں۔ آپ کو نہ صرف میں کچھ نہیں کہوں گا بلکہ کوئی بھی آپ کے خلاف زبان کو حرکت نہیں دے گا، آپ جو جی چاہے کہئے۔ آپ کی تمام باتیں خندہ پیشانی سے برداشت کی جائیں گی۔ آپ کی ہر قسم کی ضروریات پوری کی جائیں گی۔

اس کے بعد ان کی خدمت میں متعدد قسم کے تحائف پیش کئے اور عزت کے ساتھ انھیں رخصت کیا۔

حضرت بکارہ ہلالیہ رحمۃ اللہ علیہا کی عمر اور سنِ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

☆☆☆

بنانہ بنت ابی یزید

وہ خاتون جو خارجیت کی سخت مخالف اور ان کی سرگرمیوں کو اسلام سے متصادم قرار دیتی تھیں اور جنھیں ایک خارجی نے قتل کیا ہے۔

بنانہ بنت ابی یزید بن عاصم الازدی، قبیلہ ازد سے تعلق رکھتی تھیں اور اس قبیلے کے ایک اونچے خاندان کی نامور خاتون تھیں۔ تاریخ طبری میں ان کے حالات بیان کیے گئے ہیں جو بڑے نصیحت آموز ہیں۔

بنانہ ۱۹ یا ۲۰ھ میں امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں پیدا ہوئیں۔ ان کا قبیلہ نواحی مدینہ میں سکونت پذیر تھا اور اپنی خصوصیات کی بنا پر خاص شہرت واہمیت کا مالک تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ بنانہ کی ولادت کے بعد اس قبیلے کی اہمیت مزید بڑھ گئی تھی۔

حضرت بنانہ رحمۃ اللہ علیہا کی تعلیم وتربیت بہت اچھے طریقے سے کی گئی اور متعدد صحابہ اور صحابیات سے انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ یہ احادیث کی راویہ تھیں اور روایت حدیث میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ جن حضرات سے انھوں نے اخذ علم کیا، ان میں بعض امہات المومنین اور صحابیات شامل ہیں۔ صحابہ میں سے جن حضرات سے انھوں نے تعلیم حاصل کی ان میں حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوالدرداء اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔

راویہ حدیث ہونے کے علاوہ عادات وخصائل کے اعتبار سے بھی یہ اونچے

مقام پر فائز تھیں۔ لوگوں کی ہمدرد، یتیموں اور مسکینوں کی خیر خواہ اور محتاجوں کی معاون تھیں۔ بڑوں کی تکریم ان کا خاصہ تھا۔ بوڑھی اور معذور عورتوں کی خدمت ان کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی تھی۔ گفتار میں نہایت نرم تھیں اور رہن سہن کا انداز بہت سادہ تھا۔ جھگڑے جھمیلے کو سخت برا سمجھتی تھیں۔

حضرت بنانہ رحمۃ اللہ علیہا نے قرآن مجید بڑی محنت و اہتمام سے پڑھا اور اس سلسلے میں حبرِ امت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے شرفِ شاگردی حاصل کیا، جن کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو قرآن مجید کے بہت بڑے عالم تھے اور علومِ قرآنی سے بے حد شغف رکھتے تھے۔ ان سے قرآن حکیم کی تعلیم کے لئے دور دراز سے لوگ آتے اور مفسر قرآن بن کر واپس جاتے۔

بنانہ فصاحت و بلاغت میں بھی یکتا تھیں اور شعر و شاعری کا پاکیزہ ذوق رکھتی تھیں۔ ان کے آباء واجداد میں سے بعض لوگ زمانۂ جاہلیت کے عظیم شعراء میں شمار ہوتے تھے اور فصاحت و بلاغت میں ان اوصاف سے متصف تھے جو عربوں کی قبائلی زندگی کا ضروری جز تھے۔ قبائلی عرب زمانہ جاہلیت میں بھی اور زمانہ اسلام میں بھی شعر و شاعری سے نہایت دلچسپی رکھتے تھے اور فصاحت و بلاغت ان کا اصل سرمایۂ حیات تھا۔ اس سلسلے میں ان کے باہمی مقابلے ہوتے رہتے تھے۔ ان کے بچوں اور عورتوں کو بھی اس موضوع سے گہرا تعلق تھا اور ان کی تربیت اس انداز سے کی جاتی تھی کہ وہ زبان پر عبور میں کسی سے پیچھے نہ رہیں اور اس موضوع کی تمام خوبیاں ان میں سمٹ آئیں۔ حضرت بنانہ بنت ابی یزید بھی ان اوصاف کی مالک تھیں اور اس موضوع کی وہ تمام خوبیاں ان میں جمع تھیں جو ان کے آباء واجداد میں پائی جاتی تھیں۔ لیکن انھوں نے اس سے کبھی زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا، کیونکہ ان کی تمام تر توجہ تحصیلِ حدیث اور فہمِ قرآن کی طرف مبذول ہوگئی تھی اور ان کے شب و روز یادِ الٰہی میں بسر ہوتے تھے۔ تاریخ کی

بعض کتابوں میں ان کے اشعار مرقوم ہیں، مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔

طبری نے لکھا ہے کہ بنانہ تہجد گزار، قیام اللیل کی پابند، کثرت سے قرآن پڑھنے والی، راویہ حدیث، شعر وشاعری اور فصاحت وبلاغت سے تعلق رکھنے والی خاتون، نہایت خوب صورت بھی تھیں۔

حضرت بنانہ کے عہد میں خوارج نے سر اٹھالیا تھا، لیکن بنانہ خارجیت کی سخت مخالف تھیں اور خارجیوں کی سرگرمیوں کو اسلام سے متصادم قرار دیتی تھیں۔ یہ کسی ایسی چیز کو پسند نہ کرتی تھیں جو اسلامی تعلیمات کے بنیادی مقاصد سے ٹکراتی ہو۔ خارجی بھی انھیں اپنی دشمن قرار دیتے تھے اور ان کی ایذا رسانی کے درپے رہتے تھے۔ اتفاق ملاحظہ ہو کہ ایک روز یہ تنہا جارہی تھیں کہ انھیں چند خارجیوں نے پہچان لیا اور ان کا راستہ روک کر انھیں مارنے کو دوڑے۔ انھوں نے بھی قدم روک لئے اور کھڑی ہوگئیں۔ اس اثناء میں ان کے اور خارجیوں کے درمیان مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی۔

ایک خارجی: ہم تمھیں آج زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ کیونکہ تم ہر جگہ ہماری مخالفت کرتی ہو۔

بنانہ: افسوس ہے تم مرد ہوکر عورتوں کو قتل کرتے ہو، کیا تم اس اسلامی اخلاق اور بہادرانہ اوصاف سے واقف نہیں کہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذوروں کو قتل کرنا شجاعت کی توہین اور اسلام کی مخالفت ہے۔

دوسرا خارجی اپنے ساتھیوں سے: اس کا راستہ چھوڑ دو، اسے قتل نہ کرو، یہ سچ کہتی ہے۔ عورت کو قتل کرنا واقعی مردانہ بہادری کے منافی ہے۔

تیسرا خارجی اپنے ساتھی سے: کیا تم اس لئے اس کے قتل سے روک رہے ہو کہ تمھیں اس کا حسن بھا گیا ہے اور تم اس سے تعلقاتِ محبت استوار کرنا چاہتے ہو اور سمجھتے ہو کہ اس اخلاقی امداد سے یہ تمھاری گرویدہ ہوجائے گی؟

خارجی: ہرگز نہیں، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ عورت کو قتل کر کے اپنی بہادری کو مجروح نہ کیا جائے۔

بنانہ: تم بدتمیز ہو اور تمھاری حرکات اسلام کے منافی ہیں۔ نہ تم انسانیت کے تقاضوں کو سمجھتے ہو اور نہ اسلام کے احکام کو درخور اعتناء ٹھہراتے ہو۔ تم اچھی طرح سمجھ لو کہ میں تمھارے ساتھ کسی نوع کے قلبی اور روحانی مراسم نہیں رکھتی اور میں تمھاری شدید مخالف ہوں۔ میرے نزدیک تم سخت قابلِ ملامت ہو۔ میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ کس درجہ افسوس کی بات ہے کہ تم ایک عورت کو گردن زدنی قرار دیتے ہو اور پھر ایسی عورت کو جو نہ تمھیں تکلیف پہنچانا چاہتی ہے، نہ تم پر تلوار اٹھانے کے لئے تیار ہے اور نہ کسی مجمعِ عام میں تمھاری مخالفت کرتی ہے۔ وہ ایک گھریلو عورت ہے اور اس کا دائرۂ کار سمٹا ہوا اور محدود ہے۔

ایک خارجی تلوار بے نیام کر کے: ہم تمھیں ضرور قتل کریں گے اور ہمارے نقطۂ نظر سے تمھیں موت کے گھاٹ اتارنا ضروری ہے۔

بنانہ: گرج دار آواز سے: تم معاملے کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لو، میں پھر کہتی ہوں کہ کمزوروں، عورتوں، بوڑھوں، بچوں اور معذوروں کو قتل کرنا کسی صورت میں بھی مستحسن نہیں۔ اگر تم ایسا کرو گے تو یہ قتل تمھاری اخلاقی موت کے مترادف ہوگا اور تم ذلیل و نامراد قرار پاؤ گے، کیونکہ بے بس لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنا ہرگز لائقِ تائید نہیں۔

اتنے میں ایک خارجی جلدی سے تلوار کو میان سے نکالتا ہے اور آگے بڑھ کر حضرت بنانہ بنت ابی یزید کی گردن تن سے جدا کر دیتا ہے۔

یہ واقعہ ۶۸ھ کو پیش آیا۔

☆☆☆

حضرت فاطمہ بنت عبدالملک

اموی حکمراں عبدالملک بن مروان کی بیٹی جن سے ان کے شوہر نے کہا تھا کہ یا تو اپنے باپ کے دیئے ہوئے ہیرے کو بیت المال میں جمع کردو یا پھر مجھ سے علیٰحدگی اختیار کرلو۔

حضرت فاطمہ رحمۃ اللہ علیہا مشہور اموی حکمراں عبدالملک بن مروان کی بیٹی تھیں جو ۶۷ ہجری کے پس وپیش پیدا ہوئیں۔ یہ وہ خاتون ہیں، جس نے سلطنت و فرماں روائی کی آغوش میں پرورش پائی اور زندگی کی تمام منزلیں ارباب حکومت کی رفاقت اور قصر خلافت میں طے کیں۔ان کا دادا بھی حکمران، باپ بھی حکمران، بھائی بھی حکمران، اور شوہر بھی حکمران تھا۔ سسر عبدالعزیز بن مروان (جو ان کے حقیقی چچا بھی تھے) مصر کے گورنر تھے اور بیس سال سے زیادہ عرصہ اس منصب پر فائز رہے۔ کہتے ہیں اتنی طویل مدت ان کے سوا کوئی اور شخص اس اہم عہدے پر فائز نہیں رہا۔

فاطمہ بنت عبدالملک کئی خوبیوں کا مجموعہ تھیں اور متعدد اوصاف ان کی ذات میں سمٹ آئے تھے۔ وہ بہ یک وقت عالمہ وفاضلہ بھی تھیں، حلیم الطبع اور منکسر المزاج بھی تھیں، فیاضی اور سخاوت کے وصف سے بھی متصف تھیں اور نہایت نیک اور صابرہ بھی تھیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہ خاتون ناز ونعمت میں پلی بڑھیں اور ہوش سنبھالتے ہی زندگی کو شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ میں پایا، مگر چہرے پر کبھی نخوت وغرور کے آثار ظاہر نہیں ہوئے اور کبھی کسی قسم کے پندار سے اپنے ذہن کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ علم بھی حاصل کیا تو بہت محنت سے اور اساتذہ کے سامنے باقاعدہ زانوئے شاگردی تہہ کر کے، حلم وانکساری کے جوہر سے آراستہ ہوئیں تو وہ بھی طبعی اقتضاء سے۔

فیاضی وسخاوت میں بہت مشہور تھیں۔مورخین کا کہنا ہے کہ دمشق میں ان کے مکان کو دار الضیافت کی حیثیت حاصل تھی۔کثیر تعداد میں محتاج و مستحقین ان کے ہاں آتے اور وہ ان کی ضروریات کی تکمیل کرتیں،اصحابِ ثروت اور امراء وعمالِ حکومت ان کے دستر خوان کی وسعت سے کام ودہن کی تواضع کرتے۔وہ سب کا خندہ جبینی سے استقبال کرتیں اور سب کی تکمیل حاجت کے لئے کوشاں ہوتیں۔

ان کے تلامذہ کا حلقہ بھی خاصا وسیع ہے،جن میں بڑی بڑی علمی اور مشہور شخصیتیں شامل ہیں۔ان سے تحصیل حدیث کرنے والوں میں مغیرہ بن حکیم صغانی یمانی، عطاء بن ابی رباح،ابوعبیدہ بن عتبہ بن نافع فہری اور مزاحم (غلام عمر) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے زمانے میں علمی اعتبار سے خاص شہرت کے مالک تھے اور حدیث کے بارے میں جن کی رائے اور خیالات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ پھر ان حضرات کا سلسلۂ اسناد بھی بڑا وسیع ہے۔جن کے تلامذہ اور فیض یافتگان کا یہ حال ہے،اندازہ کیجئے خود اس خاتون کا اپنا مرتبہ کس درجہ بلند ہوگا اور وہ علم وفضل کی کن رفعتوں پر فائز ہوں گی۔

ان کی شادی حضرت عمر بن عبدالعزیز بن مروان سے ہوئی،جو ان کے چچازاد تھے اور غالباً اس زمانے میں خناصرہ کے گورنر تھے،یہ ۸۶ھ کی بات ہے۔اس شادی سے عمر بن عبدالعزیز بہت خوش ہوئے اور اپنے سسر (عبدالمالک بن مروان) کا نہایت بلیغ وفصیح الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ نے فاطمہ کو میرے حبالۂ عقد میں دے کر میری قلبی تمناؤں کی حوصلہ افزائی کی ہے اور میری روحانی مسرتوں کو پروان چڑھنے کا موقع دیا ہے۔اس تشکر وامتنان کی وجہ یہ ہے کہ خود حضرت عمر بن عبدالعزیز بھی بہت بڑے محدث اور متقی وپرہیزگار تھے اور فاطمہ بھی ان اوصاف سے متصف تھیں،یعنی طبعی رجحانات میں دونوں ہم آہنگ تھے،چنانچہ یہ ذہنی ہم آہنگی اور فکری اتحاد ہمیشہ قائم رہا اور بلند کردار

بیوی نے ہر موقع پر عظیم شوہر کی ہم نوائی کی۔ ازدواجی زندگی میں کسی موقع پر بھی دونوں میں بعد یا اختلاف کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔ بیوی نے شوہر کے زمانۂ خلافت میں بھی وہی کچھ کیا، جس کا شوہر نے اظہار کیا یا جس بات کو شوہر کی مرضی کے مطابق سمجھا۔

شوہر کی وفاداری کے سلسلے میں ان کے بے شمار واقعات کتب سیر وتراجم میں منقول ہیں، جن سے ان کے ایثار اور قربانی کا پتا چلتا ہے۔ چند واقعات ملاحظہ ہوں۔

عمر بن عبدالعزیز، اموی حکمران سلیمان بن عبدالملک کی وفات کے بعد ۱۰ صفر ۹۹ھ کو خلیفہ مقرر ہوئے تو بنوامیہ کی تمام جائدادیں اور جاگیریں ضبط کرلیں۔ بیوی کی وہ جاگیر بھی بحق بیت المال ضبط کرلی جو اسے باپ اور بھائیوں نے دی تھی۔ لیکن بیوی نے کسی قسم کے ملال کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس باب میں شوہر کی ہم نوائی کی۔

اس زمانے میں فاطمہ کے پاس ایک نہایت قیمتی ہیرا تھا جو ان کے باپ عبدالملک نے ان کو دیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کو بلایا اور فرمایا تمھیں دو باتوں میں سے ایک کو اختیار کرنے کی اجازت دیتا ہوں، یا تو یہ ہیرا واپس کردو اور مجھے دے دو تاکہ میں اسے بیت المال میں جمع کردوں، یا پھر مجھ سے علیحدگی اختیار کرلو۔ فاطمہ نے جواب دیا میں آپ کو اس ہیرے پر اور اس سے کئی گناہ زیادہ ہیروں پر ترجیح دیتی ہوں، چنانچہ عمر بن عبدالعزیز نے یہ ہیرا بیت المال میں جمع کرادیا۔ عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد جب یزید بن عبدالملک خلیفہ مقرر ہوا تو اس نے یہ ہیرا بیت المال سے نکال کر فاطمہ کو دینا چاہا۔ مگر انھوں نے لینے سے انکار کردیا اور کہا یہ میرا مال نہیں۔ یہ تمام مسلمانوں کا مال ہے، اسے واپس لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جب عمر بن عبدالعزیز پر نزع کی کیفیت طاری ہوئی تو یہ قریب بیٹھی تھیں، نہایت صبر وشکر سے اس جلیل القدر شوہر کو دنیا سے رخصت ہوتا دیکھ رہی تھیں، لیکن کسی قسم کی آہ وزاری نہیں کی، کیونکہ شوہر نے اس سے روک دیا تھا اور انھوں نے شوہر کے حکم کی

پوری تعمیل کی۔

ایک بار بچوں نے کھانے کے لئے کسی بہتر چیز کا مطالبہ کیا تو کہا: اپنے باپ کو دیکھو انھوں نے دنیا کی ناز ونعمت سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے اور خلیفۃ المسلمین ہونے کے باوجود سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، تمھیں بھی اپنے آپ کو اسی قالب میں ڈھالنا چاہئے اور باپ کی طبیعت سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔

بہرحال یہ نہایت پرہیز گار اور سادہ مزاج خاتون تھیں اور شوہر کی طبیعت کی ہر آن رعایت رکھتی تھیں۔

ایک بار کسی نے پوچھا: اپنے شوہر کی کوئی بات سنائیں تو کہنے لگیں وہ دنیا سے بے نیاز ہیں، انھوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے لئے فارغ کر لیا ہے اور اپنی ذات کو ان کی مشکلات ومسائل کا مرکز بنالیا ہے۔ صبح وشام وہ انہی کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں اور میں اس ضمن میں ان کی پوری پوری معاون ہوں۔

ایک مرتبہ خاندان بنوامیہ کی عورتوں نے ان سے عمر بن عبدالعزیز کے رویے کی شکایت کی تو فرمایا تم اللہ کی مخلوق پر ظلم کر کے اور ان کے مال غصب کر کے اپنے لئے سامان عیش مہیا کرنا چاہتی ہو، میرا شوہر اللہ کے سامنے جواب دہ ہے، کیونکہ وہ مسلمانوں کا خلیفہ ہے، وہ تمھارے عیش وآرام کے لئے لوگوں کو بھوک اور تنگ دستی کے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔

☆☆☆

حضرت زینب بنت معدانؒ

جنھوں نے اپنے آپ کو اللہ کی عبادت کے لئے وقف کر دیا تھا۔اور جن کا ضمیر اطمینان کی دولت سے مالا مال تھا۔

”آپ کو اگر اللہ سے پیار ہے تو اس سے ڈرتے اور خوف زدہ کیوں ہوتے ہو۔قران تو کہتا ہے اللہ رحمٰن اور رحیم ہے،غفور اور غفار ہے،یعنی وہ انتہائی رحم کرنے والا اور حد سے زیادہ مہربان ہے اور اس کے عفو وکرم اور عطا و مغفرت کا دائرہ بدرجہ غایت وسیع ہے،وہ نہ خود کسی پر ظلم کرتا ہے اور نہ کسی کو ظلم واستبداد کی اجازت دیتا ہے،لیکن آپ اس سے اس طرح ڈرتے اور یاد کر کے روتے ہیں جیسے وہ نعوذ باللہ ان اوصاف سے خالی ہے۔کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جس سے محبت اور دلی لگاؤ ہو،اس سے ڈرا نہیں جاتا اور جو لغزشوں کو نظر انداز کر دینے والا ہو اور رحم وکرم کا مالک ہو،اس سے مایوس نہیں ہوا جاتا۔ آپ اپنے کسی دوست کو یاد کر کے روتے ہیں یا خوش ہوتے ہیں؟ اپنے محبّ سے قریب ہو کر خوف محسوس کرتے ہیں یا اظہار مسرت؟

”یہ بات میری سمجھ سے بالا ہے کہ اللہ کو یاد کر کے آنسو بہائے جائیں اور اس کا ذکر ہوتے ہی کانپنا شروع کر دیا جائے۔اگر آپ اللہ کی یاد اور اس کے ذکر میں مخلص ہیں تو اس سے آپ کو شادمانی حاصل ہونی چاہیے،نہ کہ ڈر اور خوف کی چادر اپنے اوپر اوڑھ لی جائے۔پھر آپ کو یہ نکتہ نہیں بھولنا چاہیے کہ رونے اور آنسو بہانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے اور جو غم ذہن یا دل پر مسلط ہوتا ہے،ختم ہو جاتا ہے۔کیا آپ اللہ کو یاد کر کے اس لئے روتے ہیں کہ اس کی یاد کا ایک غم ہے جو آپ رو کر اس غم سے نجات

حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ اگر حقیقت یہی ہے تو آپ کا یہ عمل صحیح نہیں اور یہ اللہ کی حقیقی یاد کو سطح قلب سے محو کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ اللہ کی یاد کا بوجھ تو ہر وقت دل پر رہنا چاہئے، نہ کہ اسے آنسوؤں کے راستے دل سے نکال دیا جائے"۔

یہ الفاظ زینب بنت معدان نے حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کو اس وقت کہے تھے، جب وہ اللہ کے خوف سے زاروقطار رو رہے تھے۔

حضرت ذوالنون مصری مشہور بزرگ تھے جو ہر وقت یاد خدا اور عبادت الٰہی میں مستغرق رہتے تھے۔ ان کا نام ثوبان تھا اور باپ کا نام ابراہیم تھا، بہت بڑے عالم اور محدث تھے۔ ان کا شمار ان حضرات میں ہوتا ہے جو غلام ہونے کے باوجود علم وفضل، زہد وتقوی اور عبادت وتصوف کے بہت اونچے مقام پر فائز ہوئے۔ یہ اس لئے مصری کہلائے کہ مصر کے ایک گاؤں "اخمیم" کے رہنے والے تھے، جہاں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ ان کی وفات ۲ ذیقعدہ ۲۴۶ھ کو پیر کے روز جیزہ کے مقام پر ہوئی۔

انھیں ذوالنون اس لئے کہا جانے لگا کہ یہ ایک مرتبہ کشتی میں سفر کر رہے تھے۔ ایک اور شخص بھی اس کشتی میں سوار تھا جو بہت بڑا تاجر تھا اور بے شمار جواہر اور سونا لئے جا رہا تھا۔ اتفاق سے اس تاجر کے تمام جواہر چوری ہو گئے، کشتی میں جو لوگ سفر کر رہے تھے، ان میں سب سے زیادہ غریب اور نادار ذوالنون تھے، لہٰذا لوگوں کو انہی پر شبہ ہوا، ان کو ملزم قرار دے کر پکڑ لیا گیا اور وہ انھیں سزا دینے پر اتر آئے۔ حضرت ذوالنون جو بالکل سچے تھے اور جن کا چوری سے کوئی تعلق نہ تھا، اس صورت حال سے سخت پریشان ہوئے، انھوں نے حالت اضطراب میں دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور خدا سے دردمندانہ الفاظ میں التجا کی:

"اے اللہ! تو حقیقت حال کو اچھی طرح جانتا ہے"۔

ان الفاظ کا زبان سے نکلنا تھا کہ بہت سی مچھلیوں نے پانی سے باہر سر نکالے،

ان سب کے منہ میں ایک ایک موتی تھا اور وہ یہ موتی حضرت ذوالنون کی خدمت میں پیش کر رہی تھیں۔ انھوں نے یہ موتی مچھلیوں کے منہ سے نکالے اور مسافر تاجر کے حوالے کردیے۔ اس عجیب وغریب واقعہ سے تمام مسافر انتہائی متعجب ہوئے اور سب نے گردن جھکا کر ان سے معافی مانگی۔ عربی زبان میں نون مچھلی کو کہتے ہیں۔ اسی بنا پر لوگ ان کو ذوالنون یعنی مچھلی والا کہنے لگے اور یہی لقب ان کے اصل نام (ثوبان بن ابراہیم) پر غالب آ گیا۔

حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں حضرت زینب بنت معدان ایک بے حد نیک اور متدین خاتون تھیں جو تصوف کے نہایت باریک اور عمدہ نکات بیان کرتیں اور ایسی ایسی باتیں کہتیں جو بڑے سے بڑے صوفیاء کو بھی نہ سوجھتی تھیں۔ یہ اکثر حضرت ذوالنون مصری سے ملتیں اور ان سے مختلف مسائل پر بحث کرتیں۔ ذوالنون ان کی باتوں سے بہت متاثر ہوتے اور ان سے گفتگو جاری رکھنے کی التجا کرتے۔

تاریخ کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ زینب کا ذہن اللہ کے انوار وتجلیات سے بھرپور تھا۔ ان کے قلب کی دنیا نیکی وصالحیت سے آباد تھی، ان کا ضمیر اطمینان کی دولت سے مالا مال تھا اور انھوں نے اپنے آپ کو اللہ کی عبادت کے لئے وقف کردیا تھا۔ ان کی فراست وبصیرت کا یہ عالم تھا کہ کسی شخص پر ایک نظر ڈال کر بتادیتیں کہ یہ نیکی کے کس درجے پر فائز ہے اور اس کی دنیا کا کیا حال ہے۔

خطیب بغدادی نے ''تاریخ بغداد'' میں ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ذوالنون مصری حضرت زینب سے کس درجہ متاثر تھے اور ان کے حکیمانہ ارشادات کو تصوف کے باب میں کتنی اہمیت دیتے تھے۔ خطیب بغدادی ان دونوں کے ایک مرتبہ کے باہم سوال وجواب کے بارے میں لکھتے ہیں:

زینب: آپ کہاں سے آرہے ہیں؟

ذوالنون: میں ایک پردیسی مسافر اور غریب الدیار شخص ہوں۔

زینب: بڑے افسوس کی بات ہے، اللہ کے موجود ہوتے ہوئے بھی غریب الدیار لوگ پائے جاتے ہیں۔ اللہ تو سب کا مونس اور ہر شخص کا معاون وغم خوار ہے، جب تمام دنیا پر اس کی رحمت کا شامیانہ سایہ فگن ہے تو کسی کے پردیسی اور مسافر اور بے وطن ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ذوالنون ایک عورت کی زبان سے یہ حکیمانہ فقرہ سن کر رونے لگے۔ اس پر زینب نے سوال کیا۔

آپ روتے کیوں ہیں؟

ذوالنون: میری بیماری کے لئے جس نے ایک ناسور کی صورت اختیار کر لی تھی، بہت جلد دوا مل گئی۔

زینب: اگر آپ سچ کہہ رہے ہیں تو روئے کیوں؟

ذوالنون: کیا سچا آدمی نہیں روتا؟

زینب: نہیں۔

ذوالنون: یہ کیوں؟

زینب: اس لئے کہ رونے اور آنسو بہانے سے دل کو آرام ملتا ہے اور اطمینان نصیب ہوتا ہے اور گریہ وبکا دل کے لئے امن وراحت کا باعث ہے۔ دل کا راز مخفی رکھنے کے لئے اس سے زیادہ فائدہ مند کوئی صورت نہیں کہ انسان آہ وزاری کو دل کے نہاں خانے میں چھپائے رکھے، آنسو بہانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے اور دل کی یہ راحت اور سبک باری اصحابِ عقل اور اہلِ قلب کے نزدیک ایک بہت بڑی کمزوری ہے اور اولیاء اللہ کا فرض ہے کہ وہ اس کمزوری سے دامن کشاں ہوں۔

حضرت ذوالنون زینب کی یہ بات سن کر بہت متحیر ہوئے اور غور وفکر میں ڈوب

گئے،ان کی حیرانی اور پریشانی دیکھ کر زینب نے سوال کیا۔

آپ کس کیفیت سے دوچار ہو گئے ہیں؟

ذوالنون: میں آپ کی بات سے بہت حیران اور متعجب ہوں۔

ساتھ ہی سوال کیا۔

کوئی ایسا بات بتایئے جس کی وجہ سے اللہ مجھے دینی اور اخروی نفع عطا فرمائے۔

زینب: تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک آپ کو جو فوائد بوقلموں اللہ کی طرف سے حاصل ہوئے ہیں، ان کے باوجود آپ زوائد کی طمع رکھتے ہیں۔اللہ کی عنایات تو سب پر غالب اور فائق تر ہیں،اگر اللہ نے آپ کو کچھ عنایت فرمایا ہے تو اسی پر قناعت کرنی چاہیے،دوسروں کے دروازوں پر دستک دینے کی آخر کیا ضرورت پڑی؟

ذوالنون: میں زوائد کی طمع رکھتا ہوں اور اس سے اپنے آپ کو مستغنی نہیں پاتا۔

زینب: آپ سچ کہتے ہیں،اپنے اللہ سے محبت کیجئے اور اس کی عبادت کا شوق دل میں جاگزیں کیجئے،ایک دن آئے گا جب اللہ کرسی پر اپنے اولیاء واحباء کے لئے جلوہ فگن ہوگا اور انھیں اپنی محبت والفت کا ایک ایسا پیالہ عطا فرمائے گا کہ اس کے بعد ان کو قطعی طور پر کسی قسم کی تشنگی کا احساس نہیں ہوگا۔

حضرت ذوالنون ایک عورت کی زبان سے یہ فقرہ سن کر پھر رونے لگے اور زینب نے ایک فقرہ کہا اور حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ کو اسی حالت میں چھوڑ کر روانہ ہو گئیں۔

☆☆☆

حضرت ابنۃ ابی حثمہؓ

وہ خاتون جو حضرت عثمان کی شہادت کے بعد فتنوں کا دروازہ بند کرنے کے لئے متعدد صحابہ کے یہاں گئیں اور حالات معمول پر لانے کے لئے ان سے جدوجہد کرنے کی درخواست کی۔

"عمر تو بہت اونچا آدمی تھا، بحیثیت انسان اور بحیثیت امیر المومنین کے تیرا مرتبہ بڑا بلند ہے۔ جو بہترین کارنامے تو نے انجام دیئے وہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ نقش رہیں گے اور آنے والی نسلیں تیرا بہترین الفاظ سے تذکرہ کریں گی۔ تو غریبوں کا ہمدرد اور کمزور کا دوست تھا۔ تو وہ تھا جس نے بیواؤں کی حفاظت کی، یتیموں کو مستحقِ امداد گردانا، اسلام کی بنیادوں کو مضبوط کیا، فتنوں کو دبادیا اور سنتِ رسول کو زندہ رکھا اور تمام عیوب ونقائص سے اس طرح دامن بچا کر پاک وصاف دنیا سے رخصت ہوا جس طرح دھونے کے بعد کپڑا میل کچیل سے پاک ہو جاتا ہے۔ عمر تو نے انسانوں کے حقوق تو پورے کئے ہی تھے، تو نے حیوانوں کی رکھوالی بھی کی۔ تو بڑا بہادر اور میدانِ جنگ کا عظیم سپاہی تھا۔ تو نے اسلام اور مسلمانوں کی نگاہ داشت کے حقوق بطریق احسن پورے کئے۔ کفر تیرے سامنے لرز لرز گیا اور شرک نے تیرے حضور گھٹنے ٹیک دیئے۔ تیری قربانیوں کا دائرہ غیر محدود اور تیری فتوحات کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ غیر اسلامی طاقتیں تیرے مقابلے میں قدم نہ جما سکیں اور بڑے بڑے غیر مسلم بہادر تیری تلوار کی تاب نہ لا سکے۔ تو نے حق داروں کو پورا پورا حق دلایا اور ظالموں کو قرار واقعی سزائیں دیں۔ تیرے اندر نرمی اور سختی دونوں مناسب مقدار میں جمع ہو گئی تھیں۔ تو وہ مرد دانا تھا کہ نرمی کے محلِ استعمال کو بھی خوب جانتا تھا اور سختی کے بھی...... باطل نے تیرے مقابلے میں منہ

کی کھائی اور ستم رانوں کو تو نے ہر مقام پر شکست دی‘‘۔

یہ وہ الفاظ ہیں جو ابنۃ ابی حثمہ رحمۃ اللہ علیہا نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت کہے۔ طبری نے اپنی کتاب ’’تاریخ طبری‘‘ میں ان کے حالات بیان کیے ہیں۔ طبری نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

ابنته ابی حثمه کانت من بنات الفصاحة والبلاغة

یہ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے کی خاتون ہیں۔ حضرت عمرؓ کی انتہائی مداح تھیں۔ ان کا شمار تابعی عورتوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے متعدد صحابیات کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور ان سے علم حدیث سیکھنے اور پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ جب انھوں نے مندرجہ بالا الفاظ روتے ہوئے حضرت عمرؓ کی میت پر کہے تو کہتے ہیں کہ وہ تمام صحابہ اشک بار ہو گئے تھے جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ بقول طبری حضرت علی کرم اللہ وجہہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور ایک خاتون کی زبان سے یہ الفاظ سن کر زار زار رونے لگے اور کہا:

اللہ عمر بن خطاب پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔ وہ فی الواقع انھی اوصاف کے حامل تھے۔ ان کے بارے میں اس خاتون نے جو کچھ کہا صحیح کہا۔ ان کی خوبیاں الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں۔ وہ ہر قسم کی نیکیاں سمیٹ کر اپنے ساتھ لے گئے ہیں اور برائیوں سے نجات پا گئے ہیں۔ ابنۃ ابی حثمہ ان کے متعلق کچھ اور بھی کہے گی تو وہ بھی صحیح ہوگا۔ واللہ یہ باتیں انھوں نے تکلف سے نہیں کہیں بلکہ خود بخود ان کی زبان پر جاری ہو گئی ہیں، کیونکہ حق کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ یاد رہتا ہے اور راز خود زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ عمر جن خوبیوں کے مالک تھے، وہ بغیر کسی کے کہنے کے الفاظ کے قالب میں ڈھل گئیں۔ اللہ ابی حثمہ کی بیٹی کو عمر دراز عطا فرمائے، جس نے عمر رضی اللہ عنہ کی صحیح صحیح تعریف کی اور چند الفاظ میں ان کے تعارف کا حق ادا کر دیا:

یہ لائقِ احترام خاتون مدینہ منورہ کی رہنے والی تھیں اور ابنۃ ابی حثمہ کے نام سے مشہور تھیں۔ یعنی ابی حثمہ کی بیٹی۔ ان کا اصل نام کیا تھا؟ یہ معلوم نہیں ہوسکا۔ ۱۱ ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کے بالکل ابتدائی دور میں پیدا ہوئیں۔ بچپن ہی سے علم کی طرف رغبت تھی۔ ذہانت وفطانت میں اپنے سب ہم عمروں سے بڑھی ہوئی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت صرف بارہ تیرہ سال کی تھیں۔ مگر نہایت زیرک، تیز، معاملہ فہم اور حاضر جواب تھیں۔ ساتھ ہی فصاحت وبلاغت کی نعمت سے اس قدر بہرہ ور تھیں کہ بعض اہم شخصیتیں اس سلسلے میں ان سے استفادہ کرتیں اور لوگ اپنے مکتوبات کے مضامین درست کرانے کے لئے ان کے پاس آتے۔ بعض بڑی عمر کی خواتین اس نوعمر سے تقریر کرنے کا فن سیکھتیں اور دوزانو ہوکر ادب سے ان کے سامنے بیٹھیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہ خود بھی حصولِ حدیث کے لئے مختلف صحابۂ رسول کی خدمت میں حاضری دیتی تھیں۔ مدینہ منورہ کی عورتیں اور مردان کی قابلیت اور ذہانت سے بہت متاثر تھے۔ جچے تلے مختصر جملے بولتیں اور چند الفاظ میں بڑی بات کہہ دیتیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ان کے سامنے ہوئی۔ اس سانحہ سے بہت مغموم تھیں۔ وہ اس درجہ فتنے کا دور تھا کہ پورے مدینے پر بلوائیوں کا قبضہ تھا اور نیکی وشرافت کی کوئی قیمت نہ تھی۔ دوسرے حضرات کی طرح یہ بھی حضرت عثمانؓ کی حامی تھیں۔ لیکن بے بس تھیں اور ان کی حمایت میں کوئی عملی اقدام نہ کرسکتی تھیں۔ جب بلوائیوں اور فتنہ پرور لوگوں نے حضرت عثمان کا اجتماعی طور سے جنازہ اٹھانے اور پڑھنے سے بھی روک دیا تو ایک محدود مجلس میں انتہائی تاسف اور حزن وملال کے عالم میں کہا:

"ان آنکھوں کو یہ دن بھی دیکھنا تھے۔ یہ وہ شہر ہے جس نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کی مقدس جماعت کی نصرت واعانت کا شرف حاصل کیا اور اسی بنا پر

یہاں کے باشندے انصار کہلائے۔ مکہ مکرمہ کے بعد مدینہ منورہ ہی وہ مقام ہے جہاں سے اسلام کی اشاعت کے لئے راہیں ہموار ہوئیں اور فتوحات کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ اسی شہر میں رسول اللہ ﷺ محوِ استراحت ہیں، اسی میں ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) آرام فرما ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار صحابہ اس میں مدفون ہیں۔ اس شہر کے مکینوں نے ہر موقع پر اسلام اور مسلمانوں کی حمایت اور خدمت کی، مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج اسی شہر میں رسول اللہ ﷺ کے ایک بلند مرتبہ صحابی اور مسلمانوں کے امیر کو بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا گیا اور پھر اس پر بھی افسوس یہ کہ لوگوں کو ان کی نماز جنازہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی کا نقطۂ آغاز ہے۔ فتنوں کا دروازہ کھل گیا ہے اور اتفاق واتحاد کے دروزے بند ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں آئندہ حالات کیا رخ اختیار کریں گے اور ہمیں کیا دن دیکھنا پڑیں گے۔ کیا اب ہمیں رسوا کن گھڑیوں کا انتظار کرنا چاہئے اور اپنی شان وشوکت کے زوال کا منتظر رہنا چاہئے“۔

ان ایام پرفتن میں یہ متعدد صحابہ کے ہاں گئیں اور حالات کو معمول پر لانے کے لئے ان سے فریاد کناں ہوئیں۔ انہی دنوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمتِ اقدس میں بھی حاضر ہوئیں اور عرض کیا۔

”آپ نبی اکرم ﷺ کے چچازاد اور آپ کے داماد ہیں۔ آپ کو اولین مسلمان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آپ کی رسول اکرم ﷺ نے بہت تعریف فرمائی ہے اور آپ بے شمار فضائل ومناقب کے حامل ہیں۔ اسلام کی خدمت میں آپ کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ آپ جرأت وشجاعت کے پیکر اور عزم وتدبر میں بے مثل ہیں۔ آپ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر کے نزدیک بھی انتہائی اہمیت کی حامل تھے۔ یہ موقع بڑا نازک ہے اور لوگ آپ کی رہنمائی کے طالب ہیں۔ میں امید رکھتی ہوں کہ مسلمان آپ کی ذات گرامی سے مایوس نہیں ہوں گے۔ وہ آپ پر نگاہیں جمائے ہوئے ہیں اور

آپ ہی کو اپنا سہارا سمجھتے ہیں۔ ان کو یاس وناامیدی کی اس فضا سے نکالنے اور تحمل وتدبر سے حالات کو پرامن بنانے میں ان کی قیادت فرمائیے''۔

یہ الفاظ ابنۃ ابی حثمہ نے اس دردناک لہجے میں کہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ پہلے ہی واقعات کی رفتار سے مغموم تھے، اب تو ان کے غم اور تاثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا اور ایک عورت کے ان مخلصانہ جذبات سے بے ساختہ آب دیدہ ہوگئے۔

اس عظیم المرتبت خاتون کی وفات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں مدینہ منورہ میں ہوئی۔ وفات سے قبل انھوں نے اپنے بچوں کو وصیت کرتے ہوئے کہا:

یہ دنیا اخلاص کی دولت سے محروم ہوگئی ہے، تقویٰ دلوں سے نکل گیا ہے، اللہ کا خوف باقی نہیں رہا، اس دور میں نیکی کرنا آسان نہیں، نہ حکمرانوں میں خوفِ خدا باقی رہا ہے اور نہ عام لوگوں میں ہر شخص اپنے ذاتی مفاد کی طرف لپکتا ہے۔ اخلاق حسنہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ خدا جانے مستقبل کے پردے سے کیا ظہور میں آئے گا۔ یہ دنیا آخر ختم ہونے والی ہے۔ میں تمہیں اللہ کے تقوی کی وصیت کرتی ہوں اور حقوق العباد کی ادائیگی پر زور دیتی ہوں۔ یاد رکھو کسی کو تنگ نہ کرنا، مسلمان کے خلاف تلوار نہ اٹھانا، معمولی سے اختلاف کی بنا پر بہت بڑے فتنے کا سامان نہ فراہم کرنا، اگر کوئی مسلمان بھائی زیادتی بھی کرے تو اس سے نرمی کا برتاؤ کرنا، گفتگو میں کبھی ایسا پہلو نہ اختیار کرنا جو دوسرے کے لئے ذہنی کوفت کا باعث بنتا ہو۔ زبان کو دل کے آئینے کی حیثیت حاصل ہے۔ اس سے جو کچھ نکلتا ہے وہ انسان کے اندرونی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے ہر معاملے میں زبان کو نہایت احتیاط سے حرکت دو اور گفتگو میں اعتدال اور میانہ روی کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ اسلام ترحم، محبت اور ایک دوسرے سے ہمدردی کا سبق دیتا ہے۔ نیز آپس میں اتفاق کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام کی اس تعلیم پر عمل پیرا ہوگے تو فلاح پاؤ گے۔ اپنے

آپ پر قرآن کی تلاوت کو لازم پکڑو۔رسول اللہ ﷺ کے ارشادات پر عمل کرو۔آپ کے صحابہ کے عمل کو مشعلِ راہ ٹھہراؤ۔میری زندگی چندروزہ ہے۔میرے بعد میرے لئے دعا کرنا کہ اللہ مجھ پر اپنی رحمت فرمائے۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا،ان کی وفات مدینہ منورہ میں ہوئی۔لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ ان کے ایک بیٹے مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر تھے۔ان سے ملنے کے لئے مکہ آئی تھیں کہ مختصری علالت کے بعد وہیں انتقال کر گئیں۔

☆☆☆

مخہ بنت حارث حافی

وہ خاتون جن سے خوفِ خدا اور زہد وتقویٰ کی ادائیں لوگوں نے سیکھی۔ اکل حلال کے معاملہ میں جن کی احتیاط غلو کی حد تک پہونچی ہوئی تھی۔

حضرت مخہ رحمۃ اللہ علیہا کے حالات ''وفیات الاعیان''، ''تاریخ بغداد''، اور ''طبقات الحنابلہ'' میں مرقوم ہیں۔ یہ مشہور بزرگ بشر بن حارث حافی کی بہن تھیں اور نہایت عبادت گزار خاتون تھیں۔ خود بشر بن حارث بھی حد درجہ کے زاہد اور متقی تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ زہد وتقویٰ اور خوفِ خدا کی تمام ادائیں میں نے اپنی بہن مخہ سے سیکھیں۔ بشر بن حارث کی پرہیز گاری اور خشیتِ الٰہی کی یہ کیفیت تھی کہ ان کی بہن زبدہ کہتی ہیں۔ ایک مرتبہ رات کو گھر آ رہے تھے، جوں ہی دہلیز پر قدم رکھا، ایک گہری سوچ نے آ گھیرا۔ رات بھر اسی طرح کھڑے رہے، فجر کی اذان ہوئی تو سکر کا یہ عالم دور ہوا اور صحو دہوش نے کروٹ بدلی۔ زبدہ کہتی ہیں میں نے عرض کیا:

بھائی کس فکر میں ڈوبے ہوئے تھے؟

فرمایا: بہن! اللہ تعالیٰ کے ایک بہت بڑے انعام کی طرف اچانک عنانِ خیال منتقل ہوگئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے کئی ہم نام اور بھی ہیں۔ ایک بشر عیسائی ہے، ایک بشر یہودی ہے، ایک بشر مجوسی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا کرم ہے کہ مجھے اس نے اپنی رحمتِ خاص سے نوازا، اپنی محبت کا ذوق بخشا، اپنے لطف وکرم کی دولت عطا فرمائی اور اپنے دوستوں کے حلقے میں جگہ دی۔ میں اسی خوشی وسرمستی کی کیفیتوں میں سرشار تھا کہ صبح کی اذان کی آواز کانوں میں پڑی۔ ان کا کہنا ہے کہ زہد واطاعت کا یہ عاطفہ میرے

اندر اپنی بہن مخہ کی رفاقت میں رہنے سے پیدا ہوا۔

مخہ کھانے پینے کے بارے میں انتہائی محتاط تھیں۔ اکل حلال کے معاملے میں ان کی احتیاط غلو کی حد تک پہنچی ہوئی تھی، یعنی کھانا کھاتیں تو سو مصیبتیں جھیل کر، خود جا کر جو خریدتیں، خود پیستیں اور اپنے ہاتھ سے پکاتیں۔

مخہ محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتی تھیں۔ ان کا اصل سرمایہ یا راس المال دو دانق پر مشتمل تھا (ایک دانق) سے روئی خریدتیں، ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک اسے کاتتیں تو ایک دانق نفع حاصل ہوتا۔ ان کے مکان کے آگے سے ہاتھ میں مشعل لئے ایک چوکیدار ابن طاہر گزرتا اور وہ بعض لوگوں کے ساتھ وہاں کھڑا ہو کر باتیں شروع کر دیتا۔ مخہ اس موقع کو غنیمت جانتیں اور تیزی سے سوت کاتنا شروع کر دیتیں۔ مشعل کی روشنی میں کاتا ہوا سوت ظاہر ہے قدرے صاف اور باریک ہوتا اور جو اندھیرے میں کاتا جاتا وہ کچھ موٹا ہوتا۔

مخہ کو دو قسم کے اس مال سے یہ تشویش لاحق ہوئی کہ اسے کیوں کر فروخت کیا جائے اور گاہک سے اس بارے میں کیا کہا جائے۔ اس خلش کو دور کرنے کی غرض سے وہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ مورخین نے لکھا ہے کہ وہ ان کے مکان پر گئیں، دروازہ کھٹکھٹایا، امام احمد نے اپنے صاحب زادہ عبداللہ سے کہا دیکھو تو باہر کون ہے، معلوم ہوتا ہے کوئی خاتون ہیں اور اندر آنے کی اجازت چاہتی ہیں۔ باہر نکل کر عبداللہ نے دیکھا تو واقعی ایک خاتون سر جھکائے کھڑی تھیں۔ امام نے اندر بلایا۔ وہ آئیں سلام کر کے مودب ہو کر بیٹھ گئیں۔

عرض کیا: حضرت دو باتیں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔

فرمایا کہو۔

عرض کیا: پہلی بات تو یہ ہے کہ میں سوت کات کر گزر بسر کرتی ہوں۔ بعض

دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے چراغ کی روشنی میں کات لیتی ہوں۔ کبھی پیسے ہوں تو اپنا چراغ جلا لیتی ہوں، لیکن کبھی تیل کم ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے چراغ بجھ جاتا ہے، لیکن میں اپنا کام جاری رکھتی ہوں اور چاند کی روشنی میں چرخہ چلاتی اور سوت کاتتی ہوں۔ دریافت طلب بات یہ ہے کہ جب میں سوت بیچوں تو کیا گاہک کو صاف صاف بتادینا چاہئے کہ سوت دو حصوں میں منقسم ہے۔ یہ حصہ چراغ کی روشنی میں کاتا گیا ہے اور یہ چاند کی ضو میں تیار ہوا ہے۔

امام نے فرمایا: دونوں میں کچھ فرق ہوتا ہے؟

عرض کیا: جی ہاں! چاند کی روشنی چونکہ کم ہوتی ہے، اس لئے اس میں کاتا ہوا سوت ذرا موٹا ہوتا ہے اور دوسرا باریک۔

امام فرماتے ہیں: فعلیک ان تبینی (یعنی تمھارا فرض ہے کہ اتنا فرق بھی کھول کر بیان کردو)

معاملات میں دیانت کے تقاضوں کا اندازہ کیجئے اور سوال کرنے والی اور جواب دینے والے کی دینی ذمہ داریوں کے شدتِ احساس کو ملاحظہ فرمایئے۔ غور کیجئے دیانت اور تقویٰ کا معیار کتنا اونچا ہے۔ خاتون کی اس جواب سے تشفی ہو جاتی ہے۔

اب وہ دوسرا سوال پوچھتی ہیں۔ اگر مریض تکلیف سے کراہنے لگے اور شدتِ الم سے چیخ پکار کرے تو اللہ کے حضور یہ شکوہ تو متصور نہیں ہوگا؟

امام احمد جواب دیتے ہیں ارجو ان لا یکون (میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوگا) یعنی اللہ کی رحمتوں سے یہی توقع ہے کہ وہ ہماری مجبوریوں اور کمزوریوں کے پیش نظر اسے شکوہ قرار نہیں دے گا، بلکہ اسے اپنی طرف رجوع والتجا ہی کا ایک پیرایہ ٹھہرائے گا اور اپنی یاد اور دعا سے تعبیر کرے گا کیونکہ اس حالت میں انسان یاد تو بہرحال اللہ ہی کو کرتا ہے اور یہ اقرار کرتا ہے کہ تکلیفوں، مصیبتوں اور بیماریوں کو وہی رفع کرنے والا ہے۔

دونوں سوالوں کا جواب پا کر خاتون عرض کرتی ہیں۔

حضور: اجازت ہے۔

امام فرماتے ہیں: آپ جا سکتی ہے۔

وہ رخصت ہو جاتی ہیں تو امام اپنے بیٹے عبداللہ سے کہتے ہیں۔

جس عورت کی دیانت اور تقوی کا یہ حال ہے، معلوم تو کرو یہ کون ہے؟

عبداللہ اس کے پیچھے جاتے ہیں اور جب وہ مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی بشر بن حارث کے مکان میں داخل ہوتی ہیں تو وہ لوٹ آتے ہیں اور باپ سے کہتے ہیں۔

یہ خاتون بشر بن حارث کی بہن ہیں اور ان کا نام مخہ ہے۔

امام فرماتے ہیں میرا بھی یہی خیال تھا، یقیناً یہ بشر کی بہن مخہ ہی ہو سکتی ہے۔

☆☆☆

ام عاصم بنت عاصمؒ

وہ خاتون جنھوں نے دودھ میں پانی ملانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور جو حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ماں ہیں۔

ایک رات خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حسب معمول مدینہ منورہ کی گلیوں میں گشت لگا رہے تھے۔ ان کا غلام اسلم بھی ساتھ تھا۔ گشت لگاتے لگاتے تھک گئے تو ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ مکان کے اندر ایک عورت اپنی لڑکی سے کہہ رہی تھی۔

بیٹی! اٹھو اور دودھ میں پانی ملا دو۔

لڑکی نے کہا: امیر المومنین نے شہر میں منادی کرادی ہے کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے۔

ماں نے جواب دیا: بیٹی یہ رات کا وقت ہے، اس وقت نہ امیر المومنین دیکھ سکتے ہیں اور نہ منادی کرنے والے۔ تم جلدی سے اٹھو اور دودھ میں پانی ملا دو۔

لڑکی نے نہایت سختی سے کہا: امی خدا کی قسم یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ بہ ظاہر تو امیر المومنین کی اطاعت کا دم بھرا جائے اور بہ باطن ان کی نافرمانی اور عدم اطاعت کے بدنما داغ سے اپنا دامن آلودہ کیا جائے۔

امیر المومنین عمر فاروقؓ دروازے پر بیٹھے ماں بیٹی کی یہ گفتگو سنتے رہے، چلنے لگے تو غلام اسلام سے کہا اس دروازے اور جگہ کو یاد رکھو۔ صبح ہوئی تو اسے بھیجا کہ پتا کرو یہ کون عورتیں تھیں، نیز معلوم کرو کہ ان کے شوہر ہیں یا نہیں۔ غلام نے پتا کرکے بتایا کہ

لڑکی کنواری ہے اور ماں بیوہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے تمام بیٹوں کو جمع کیا اور کہا اگر مجھے نکاح کی ضرورت ہوتی تو میں اس لڑکی سے نکاح کر لیتا، لیکن تم میں سے جو پسند کرے، میں اس سے اس کا نکاح کرا سکتا ہوں۔

ان کے لڑکوں میں عبداللہ اور عبدالرحمٰن کی بیویاں موجود تھیں، اس لئے انھیں نکاح کی ضرورت نہ تھی، البتہ عاصم بن عمر کنوارے تھے، لہٰذا انھوں نے اس لڑکی سے عقد کر لیا اور اسی کے بطن سے خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ماں ام عاصم پیدا ہوئیں۔

ایک روایت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود حضرت عاصم رضی اللہ عنہ ہی کو اس لڑکی کا پتا لگانے کے لئے بھیجا اور ان سے کہا کہ تم اس سے نکاح کر لو، کیونکہ اس سے ایک ایسا شہسوار پیدا ہوگا جو تمام عرب کا سردار ہوگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس سے حضرت عمر بن عبدالعزیز پیدا ہوئے۔

ان کے شوہر حضرت عاصم بن عمر فاروق رضی اللہ عنہما ۷۰ھ میں اور ایک روایت کے مطابق ۷۳ھ میں فوت ہوئے۔

حضرت ام عاصم رحمۃ اللہ علیہا اپنے دور کی عظیم الشان خاتون تھیں، نیکی و پاک بازی میں سب سے آگے تھیں۔ حلیم الطبع، پاک طینت، عالمہ حدیث اور نہایت اونچے مرتبے کی عورت تھیں۔ بہت بڑی محدثہ اور فقیہہ تھیں۔ انھوں نے اپنے باپ حضرت عاصم بن عمر سے بھی احادیث روایت کیں اور بعض دیگر صحابہ سے بھی روایت کا شرف حاصل کیا۔

ان کے شوہر نامدار عبدالعزیز بن مروان مصر کے گورنر تھے۔ جب عمر بن عبدالعزیز پیدا ہوئے تو ام عاصم مدینہ منورہ میں تھیں۔ عمر بن عبدالعزیز بڑے ہوئے تو عبدالعزیز بن مروان نے اپنی بیوی ام عاصم کو خط لکھا کہ بچے کو لے کر مصر آ جائیں۔ وہ

اپنے چچا حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس آئیں اور اپنے شوہر کے خط کی اطلاع دی۔ انھوں نے فرمایا تم چلی جاؤ، لیکن اس بچے کو یہیں رہنے دو، کیونکہ ہم بہتر طریقے سے اس کی تعلیم وتربیت کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

یہ مصر پہنچیں تو بچہ یعنی عمران کے ساتھ نہ تھا۔ان کے شوہر عبدالعزیز بن مروان نے ان کو بغیر بچے کے دیکھا تو پریشانی کے عالم میں پوچھا! ''عمر کہاں ہے؟

انھوں نے جواب دیا: میرے چچا حضرت عبداللہ بن عمر نے اس کو اپنے پاس رکھ لیا ہے تا کہ بہتر انداز سے ان کی نگرانی میں اس کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جائے۔

اس سے عبدالعزیز بن مروان بہت خوش ہوئے اور فرمایا تم نے بہت اچھا کیا یہاں کی بہ نسبت وہاں (مدینہ منورہ میں) اس کی تعلیم وتربیت کا انتظام زیادہ اچھا اور عمدہ ہو سکے گا۔

حضرت ام عاصم بنت حضرت عاصم، امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی پوتی تھیں۔ خاندانی اور ذاتی اعتبار سے ان کا درجہ بہت بلند تھا۔یہی وہ نیک بخت خاتون ہیں جن کو خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ماں ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ راویہ حدیث بھی تھیں۔انھوں نے اپنے باپ عاصم سے حدیث کی روایت وسماع کی۔ پھر آگے ان کے تلامذہ کا بھی حلقہ پیدا ہوا جس میں خود ان کے عظیم القدر بیٹے حضرت عمر بن عبدالعزیز بھی شامل ہیں جو ۳۹ سال عمر پا کر ۲۵ ر رجب ۱۰۱ھ کو فوت ہوئے۔

حضرت ام عاصم بنت عاصم نہایت بلند اخلاق اور ہمدرد خلائق خاتون تھیں، منقول ہے کہ ان کی ذات سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچی۔وہ سب کی خیر خواہ تھیں۔میل جول اور اخلاقی بلندی میں کوئی ان کا حریف نہ تھا، گفتار اور کردار میں سب سے ممتاز تھیں، لوگوں کی مدد کرنا اور مستحقین ومساکین کا خیال رکھنا ان کا شیوہ تھا۔جرأت وبسالت میں بھی اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔ان کی رگوں میں خاندانِ فاروقی کا جو لہو دوڑ رہا تھا، اس کا

اثر ان کے ہر عمل اور ہر قول میں نمایاں تھا۔

ان کی وفات اپنے شوہر عبدالعزیز بن مروان کے پاس ہوئی۔ یہ وہ خاتون ہیں جن کے ننھیال بھی بلند مرتبت تھے، شوہر بھی بڑی عزت وشان کے مالک تھے اور لوگوں میں ان کو خاص قدر ومنزلت حاصل تھی۔ پھر اللہ نے ان کو جو بیٹا (عمر بن عبدالعزیز) عطا فرمایا وہ بھی عدیم النظیر صلاحیتوں کا حامل تھا۔ علاوہ ازیں یہ ذاتی طور پر بھی تقویٰ وطہارت کا مجسمہ تھیں اور کوئی ان کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کرسکتا تھا۔ اس حیثیت سے یہ خاتون بہت خوش بخت تھیں جو اللہ کے گوناگوں انعامات کی مستحق قرار پائیں۔

☆☆☆

فاطمہ بنت مروان

وہ ذہین خاتون جن سے سلاطین بنی امیہ تمام اہم مسائل میں مشورہ کرتے تھے۔

حضرت فاطمہ بنت مروان، حضرت عمر بن عبدالعزیز کی پھوپھی تھیں اور نہایت متوازن ذہن کی خاتون تھیں۔ ان کے جذبات واحساسات کو سمجھنے کے لئے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے جنھیں بجا طور پر خلیفۂ راشد کہا جاتا ہے، اصلاحِ احوال اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے نہایت اہم اور بنیادی قدم اٹھائے۔انھوں نے اس سلسلے کا آغاز اپنے گھر سے کیا۔مسند خلافت پر متمکن ہوتے ہی سب سے پہلے اپنی اس جائداد اور اموال واسباب کو بیت المال کے حوالے کیا جو خاندانی اعتبار سے خود انھیں حاصل ہوئی تھی۔ پھر اپنی بیوی کی وہ جائداد بحقِ سرکار ضبط کی جو انھیں والد یا بھائیوں کی طرف سے ملی تھی۔ پھر خاندان کے دوسرے شہزادوں اور رئیسوں کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی اور ان سے وہ تمام جاگیریں چھین لیں جو انھیں وراثت میں عطا ہوئی تھیں۔حضرت عمر بن عبدالعزیز کا موقف یہ تھا کہ یہ مال معضوبہ ہے، اس کے اصل مالک بنو امیہ کے شہزادے یا اس خاندان کے افراد نہیں، بلکہ یہ پوری مسلمان امت کا مال ہے، اس سے صرف ایک ہی خاندان کو متمتع نہیں ہونے دیا جائے گا، سب مسلمان اس سے برابر فائدہ اٹھائیں گے۔

ان کا فرمان تھا کہ میرے دورِ خلافت میں کسی کو نشانۂ ستم نہیں بنایا جائے گا، کسی

پر ظلم وجور نہیں کیا جائے گا۔ یہ کبھی نہیں ہوگا کہ ایک شخص تو غیر محدود زمین کا مالک ہو، اس کی جاگیریں میلوں کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہوں اور اس کے سیم وزر کی کوئی انتہا نہ ہو، وہ اپنی بے پناہ سرمایہ داری کے بل بوتے پر من مانی کارروائیاں کرتا پھرے، کوئی اسے پوچھنے والا نہ ہو۔ وہ فلک بوس محلات وقصور کا مالک ہو اور لوگ محض سرمائے کی بنا پر اس کی عزت واحترام کے لئے مجبور ہوں۔ مگر دوسری طرف ایسے لوگ ہوں جو غربت وافلاس کی زندگی بسر کرتے ہوں، ان کے بچے ایک ایک پیسے کے محتاج ہوں، انھیں صرف اس لئے نظر انداز کر دیا جائے کہ ان کی جیبیں درہم ودینار کے بوجھ سے خالی ہیں، وہ جھونپڑیوں میں رہ کر زندگی کے دن پورے کرتے ہوں اور ایک انچ زمین کے بھی مالک نہ ہوں، یہاں یہ فرق وامتیاز ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا اور کسی کو محض پیسے کی بنا پر قابلِ احترام نہیں گردانا جائے گا۔ عزت واحترام کا پیمانہ روپیہ پیسہ یا جاگیر نہیں، انسانیت ہے، لوگوں کو انسانیت کی ترازو میں تولا جائے گا، جاگیرداری یا سرمایہ داری کی ترازو میں نہیں۔

ظاہر ہے اس نقطۂ نظر کو بنو امیہ کے وہ شہزادے برداشت نہیں کر سکتے تھے جن کی پرورش مال ودولت کے ماحول میں ہوئی تھی اور جن کی زندگی کا دارومدار محض روپیہ پیسہ تھا، چنانچہ جب ان کی سرمایہ داری پر زد پڑی، جاگیریں ضبط ہونے لگیں اور آمدنیوں کا دائرہ سمٹنے لگا تو وہ ایک دم حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مخالفت پر اتر آئے اور ان کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ ان لوگوں نے کچھ ایسے افراد سے بھی رابطہ قائم کیا جو حضرت عمر بن عبدالعزیز سے بہت زیادہ تعلق رکھتے تھے اور وہ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ بنو امیہ نے اس کے لئے جن افراد کو منتخب کیا، ان میں ان کی حقیقی پھوپھی فاطمہ بنت مروان رضی اللہ عنہا خصوصیت سے لائقِ تذکرہ ہیں۔

فاطمہ بنت مروان کاروبارِ حکومت میں خاص اہمیت رکھتی تھیں اور سلاطین بنو امیہ تمام اہم مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ یہ خلیفہ کی بیٹی، خلیفوں کی بہن

اور خلیفہ کی پھوپھی تھیں اور امورِ سلطنت کے نشیب وفراز کو خوب سمجھتی تھیں۔ ان کے مشورے بڑے صائب اور رائے بڑی صحیح ہوتی تھی۔ مروان جسے ایک طرح سے سلطنت بنوامیہ کے بانی کی حیثیت حاصل ہے، اپنی اس بیٹی کو بہت عقلمند سمجھتا تھا۔ اس کے زمانے میں یہ اگرچہ کم سن تھیں، مگر عقل وفہم میں بڑی تیز تھیں اور بہترین مشورے دیتی تھیں۔ یہ بنوامیہ کی ان خواتین میں سے ہیں جو حکومت میں بھی اثر ورسوخ رکھتی تھیں اور عوام میں بھی احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ غریبوں کی ہمدرد، عوام کی خیر خواہ، یتیموں کی معاون، بے کسوں، بے نواؤں اور بیواؤں کی مددگار۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جو حکومت چھوٹے طبقے کا خیال نہیں رکھے گی اور عوام کی ضروریات پوری نہیں کرے گی، وہ لوگوں کے دلوں میں اپنے لئے جگہ نہیں بنا سکے گی اور کبھی کامیابی کی منزلیں طے نہیں کر سکے گی۔ عوام سے بے نیاز حکمرانوں کے دن بہت تھوڑے ہوتے ہیں اور ان کا تختِ حکومت ہمیشہ ڈگمگاتا رہتا ہے۔

یہ خاتون بڑی خوبیوں کی مالک تھیں۔ اگرچہ یہ حکومت وسلطنت کے ماحول میں پروان چڑھی تھیں اور انھوں نے یومِ پیدائش ہی سے آرام وآسائش کی زندگی بسر کی تھی اور ناز ونعمت میں پلی بڑھی تھیں، مگر ان کی عادتیں بالکل مختلف تھیں، وہ نہ کبھی شہزادی بن کر رہیں اور نہ شہزادیوں کی عادات کو اپنایا اور نہ ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ہمیشہ عوامی زندگی بسر کی اور غریبوں سے تعلق وربط اور ان کی معاونت وحمایت کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ حکمرانوں، بادشاہوں اور امیروں کے گھروں میں پلی ہوئی عورتوں کی دنیا بالکل بدل جاتی ہے اور وہ فخر وغرور کا پیکر بن جاتی ہیں۔ نہ ان میں کمزوروں سے ہمدردی کا جذبہ باقی رہتا ہے اور نہ یتامی ومساکین کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی ہیں۔ ان کا وقت اپنے ہی بناؤ سنگھار اور نئے سے نئے فیشن ایجاد کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ لیکن فاطمہ بنت مروان میں یہ بات نہ تھی، ان کی طبیعت میں سادگی اور

فطرت میں نیکی کا جذبہ موجزن تھا اور یہی وجہ ہے کہ سب لوگ ان کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ تمام معاملات میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان کے مشوروں پر عمل پیرا ہوتے تھے۔

یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز (خلیفۂ راشد) کی حقیقی پھوپھی تھیں۔ جب عمر بن عبدالعزیز نے وہ جاگیریں ضبط کرلیں جو بنوامیہ کے خاندان کے لوگوں کو دی گئی تھیں تو خاندان کے تمام افراد حضرت فاطمہ بنت مروان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ وہ اپنے بھتیجے کے پاس جا کر ان کی نمائندگی کریں اور ان کی جائدادیں اور جاگیریں انھیں واپس دلائیں۔ چنانچہ وہ عمر بن عبدالعزیز کے پاس گئیں اور جا کر بیٹھ گئیں۔

عمر بن عبدالعزیز نے انھیں دیکھ کر فرمایا: پھوپھی کس طرح تشریف آوری ہوئی؟

کہا: یوں ہی آئی ہوں۔

فرمایا: اگر کوئی بات ہے تو فرمائیے۔ آپ چونکہ میرے پاس تشریف لائی ہیں، اس لئے پہلے آپ کو بات شروع کرنا اور اپنا مدعا بیان کرنا چاہئے۔

فاطمہ نے کہا: مجھے خاندان کے تمام لوگوں نے نمائندہ بنا کر آپ کے پاس بھیجا ہے اور یہ سب لوگ تمھارے قرابت دار ہیں اور انھیں شکایت ہے کہ تم نے ان سے وہ روٹی چھین لی ہے جو بنوامیہ کے خلفاء نے انھیں دی تھیں۔

فرمایا: میں نے ان کا نہ کوئی حق غصب کیا ہے اور نہ ان کی روٹی چھینی ہے۔

بولیں: سب لوگ اس سلسلے میں شاکی ہیں اور مجھے خطرہ ہے کہ وہ تمھارے خلاف بغاوت کردیں گے۔

فرمایا: اگر میں قیامت کے سوا کسی اور دن سے خوف محسوس کروں تو خدا مجھے اس کی تکلیف سے محفوظ نہ رکھے۔

اس کے بعد ایک اشرفی اور گوشت کا ایک ٹکڑا اور ایک انگیٹھی منگوائی۔ اشرفی

آگ میں ڈال دی۔ جب وہ سرخ ہوگئی تو اسے اٹھا کر گوشت کے ٹکڑے پر رکھ دیا جس سے وہ بھن گیا۔ اب پھوپھی سے مخاطب ہو کر کہا۔

کیا اپنے بھتیجے کے لئے آپ اس قسم کے عذاب سے پناہ نہیں مانگتیں؟

دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے کہا۔

اے پھوپھی! رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ایک نہر پر چھوڑ دیا۔ پھر ایک شخص (ابوبکر) اس نہر کا محافظ ہوا، جس نے اس کو جوں کا توں رہنے دیا اور اس میں کسی نوع کی تبدیلی نہیں کی۔ پھر ایک دوسرا شخص (عمر) اس کا نگراں مقرر ہوا، اس نے بھی اس کو اسی طرح رہنے دیا اور اپنے پیشرو کے نقش قدم پر چلا۔ پھر تیسرے شخص (عثمان) کو اس کی تولیت حاصل ہوئی، اس نے اس سے ایک چھوٹی سی نہر نکالی، پھر یہ نہر معاویہ کے قبضے میں آئی، انھوں نے اس سے متعدد نہریں نکالیں، بعد ازاں یہ نہر یکے بعد دیگرے یزید، مروان، عبدالملک، ولید اور سلیمان کے تسلط میں آئی۔ اب اس نہر کا نگراں مجھے مقرر کیا گیا ہے اور یہ نہر خشک ہو چکی ہے اور اس میں پانی کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا ہے۔ خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا تو تمام ذیلی نہروں کو پاٹ کر وہ نہر جاری کر دوں گا جو بہت بڑی اور عظیم الشان نہر تھی۔

کہا: عمر! تم میرے قابلِ قدر بھتیجے ہو، تمھارے ارادے بہت نیک ہیں اور تم برسرِ حق ہو۔ آئندہ میں تمھارے ساتھ کبھی اس موضوع پر بات نہیں کروں گی۔ میں جانتی ہوں کہ تم سچے ہو اور تم کو اسی طرح کرنا چاہئے تھا۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ تمھیں اس نیک مقصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ بنوامیہ نے جو جائدادیں غصب کر رکھی ہیں اور لوگوں کے جو حق چھین لئے ہیں، انھیں ان سے چھین کر اصل مالکوں کو واپس کرنا یا بیت المال کے لئے ضبط کرنا نہایت ضروری تھا۔

☆☆☆

عاتکہ بنت مروان

ایک عقل منداور دوراندیش خاتون جنھوں نے بعض مسائل میں اپنے خاندان کی نمائندگی کی۔

عاتکہ بنت مروان بن حکم خاندان بنوامیہ سے تعلق رکھتی تھیں۔مروان کواس خاندان میں خاص اہمیت حاصل ہے۔معاویہ بن یزید بن معاویہ بن ابوسفیان کی وفات کے بعد ایسے حالات پیدا ہوگئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا حکومت بنوامیہ کے خاندان کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔لیکن مروان اس طرح میدان میں آیا کہ حکومت دوبارہ مستحکم ہوگئی اور جوخطرات ابھر آئے تھے وہ ختم ہوگئے۔

مروان ۲ہجری میں پیدا ہوئے تھے،حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں میر منشی اور وزارت کے منصب پر فائز رہے۔امیر معاویہ بن یزید کی وفات کے بعد چھ(٦) مہینے تنہا حضرت عبداللہ بن زبیر ہی خلیفہ رہے تھے۔ان کے سوا اور کوئی شخص مدعی خلافت نہ تھا۔حضرت معاویہ کے دور کے اور ان کے پوتے معاویہ بن یزید کے زمانے کے تمام عمال وحکام نے حضرت عبداللہ بن زبیر کی حکومت کو تسلیم کرلیا تھا،لیکن اس اثناء میں مروان بن حکم منصبِ خلاف پر فائز ہونے کے لئے کوشاں رہے،جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھ سات مہینے کی مسلسل بھاگ دوڑ اور کوشش کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے اور ملک شام پر قبضہ کرلیا۔اس حیثیت سے مروان کو ایک باغی بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور بنوامیہ کی حکومت وسلطنت کا مجدد بھی۔

باغی اس لئے کہ اس نے حضرت عبداللہ بن زبیر کی شدید مخالفت کرکے اوران

سے تصادم کے بعد حکومت حاصل کی اور حکومت بنوامیہ کا بانی یا مجدد اس بنا پر کہ اس نے اس وقت حکومت کے درو بست پر قبضہ کیا جب اس خاندان کے ہاتھ سے حکومت کی باگ ڈور نکل چکی تھی۔ یزید کی موت کے بعد مروان نے اس کی بیوی ام خالد سے نکاح کرلیا تھا اور خالد بن یزید کو اس بات کا سخت افسوس اور قلق تھا کہ اس کے باپ (یزید) کے مرنے کے بعد حکومت اس کے ہاتھ سے نکل کر مروان کے قبضے میں چلی گئی ہے۔ اس نے اس کا تذکرہ اپنی ماں (ام خالد) سے کیا۔ اس نے کہا تم خاموش رہو، میں انتقام لے لوں گی، چنانچہ اس نے اپنی چار پانچ باندیوں کو آمادہ کیا، رات کو مروان محل میں آ کر لیٹا تو ام خالد کے حکم سے انھوں نے مروان کے منھ میں کپڑا اٹھونس دیا، جس سے وہ بالکل عاجز آ گیا، آواز بھی نہ نکال سکا، ایک اور عورت نے آگے بڑھ کر جلدی سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ یہ واقعہ ۳ر رمضان المبارک ۶۵ ہجری کا ہے۔ مروان بن حکم نے ۶۳ سال عمر پائی اور ساڑھے نو مہینے حکومت کی۔ یہ عاتکہ اسی مروان کی بیٹی تھی جو بڑی عقل منداور دوراندیش عورت تھی۔

مروان کے بعد علی الترتیب عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک اور سلیمان بن عبدالملک تختِ حکومت پر متمکن ہوئے۔ سلیمان بن عبدالملک کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ مقرر کیا گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خلیفۂ راشد کہا جاتا ہے۔ وہ نہایت پرہیزگار اور خداترس خلیفہ تھے وہ ۱۰ صفر ۹۹ھ کو خلیفہ مقرر ہوئے اور دو برس پانچ مہینے چار دن کی خلافت کے بعد انھوں نے ۲۵ر رجب ۱۰۱ھ کو وفات پائی۔ ان کے دورِ خلافت کو بہترین دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

خاندانِ بنوامیہ نے اپنے زمانۂ حکومت میں بہت سی جاگیروں پر قبضہ کرلیا تھا، تمام شہزادوں نے بڑے بڑے قطعات آراضی اور باغات پر تسلط جمالیا تھا۔ بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت قرار دے لیا تھا اور ذرائع آمدنی کو اپنے تصرف میں لے آئے تھے،

جس سے دوسرے مسلمانوں کی حق تلفی ہوتی تھی اور وہ سخت پریشان تھے، لیکن بنوامیہ ہی کے ڈر سے کچھ کہنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز سریر آرائے خلافت ہوئے تو انھوں نے تمام معاملات کا ازسر نو جائزہ لیا۔ سب سے پہلے انھوں نے اپنی بیوی فاطمہ بنت عبدالملک کے زیورات ان سے چھین کر بیت المال کی تحویل میں دیے اور فرمایا یہ زیورات تمام مسلمانوں کو ملکیت ہیں اور سب اس میں برابر کے شریک ہیں۔ ان کی بیوی ایک خلیفہ کی پوتی، ایک خلیفہ کی بیٹی، دو خلیفوں کی بہن اور خلیفہ (عمر بن عبدالعزیز) کی بیوی تھیں۔

عمر بن عبدالعزیز کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ان کے تمام تر زیورات قومی ملکیت ہیں، کیونکہ یہ زیورات ان خلفاء نے دیئے ہیں جو بیت المال کو اپنا ذاتی خزانہ سمجھتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے وہ تمام جاگیریں بھی بحق بیت المال ضبط کر لی تھیں جو مختلف لوگوں کو ان کی ذاتی اور خاندانی وجاہت کی بنا پر دی گئی تھیں۔ ملازمتوں میں بھی انھیں جو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی وہ ختم کر دی۔ ان کے ماہانہ اور سالانہ وظائف بھی بند کر دیئے گئے، جو اموال واسباب انھیں دیئے گئے تھے، وہ بھی واپس لے لئے گئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے اس اقدام سے بنوامیہ سخت پریشان اور نالاں تھے اور چاہتے تھے کہ انھیں وہ تمام مراعات حاصل رہیں جو انھیں پہلے حاصل تھیں، لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز نے صاف انکار کر دیا اور واضح لفظوں میں انھیں ان کی بدعنوانیوں اور غلط کاریوں سے آگاہ فرمادیا، اس سے بنوامیہ کی خاندانی تعلی اور جذبہ حکمرانی کو سخت ٹھیس لگی اور ان کی زندگی کے شب وروز عوامی سطح پر آ گئے۔ اس کی شکایت انھوں نے عاتکہ بنت مروان بن حکم سے کی اور کہا کہ آپ ایک معزز اور قابلِ احترام خاتون ہیں۔ آپ عمر بن عبدالعزیز کے پاس جائیں اور ان سے ہم سب کی نمائندگی

کرتے ہوئے کہیں کہ وہ ہمارے حقوق بحال کردیں اور ہماری جاگیریں اور زمینیں ہمیں واپس لوٹا دیں، نیز وہ ہمارے آباء واجداد کے کردار کو معیوب قرار دیتے ہیں، اس سے رک جائیں۔

عاتکہ بنت مروان حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور بنو امیہ کے خاندان کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ آپ ایک متقی اور نیک خلیفہ ہیں، بحیثیت انسان بھی آپ کا مرتبہ بلند ہے اور بحیثیت خلیفہ بھی آپ کو سب پر فوقیت حاصل ہے، بہتر یہ ہے کہ آپ بنو امیہ کی شکایات کا ازالہ کردیں اور ان کے اموال واسباب جو بحق بیت المال ضبط کئے جاچکے ہیں انھیں واپس کردیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا: اے پھوپھی! اسلام ایک صاف شفاف سرچشمہ ہے، اس سے بے شمار لوگوں نے روحانی فائدہ اٹھایا، بعض لوگوں نے اسے اپنی ذات کے لئے بھی استعمال کیا۔ خلفاء راشدین کے زمانے تک کسی کو ذاتی مفاد حاصل کرنے کی جرات نہ ہوسکی، لیکن ان کے بعد حالات یکسر بدل گئے، جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آیا انھوں نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اسلامی احکام پر عمل کرنے کے بجائے اس سے انحراف کی راہیں تلاش کیں اور اجتماعی مفاد پر اپنی ذات کو ترجیح دینا ضروری سمجھا۔ مجھے افسوس ہے میرے پیشرو خلفاء نے اپنی صحیح ذمہ داریاں اور بنیادی فرائض انجام دینے میں کوتاہی سے کام لیا۔ میں نے ان کی جو جاگیریں اور اموال واسباب ضبط کرکے بیت المال کے حوالے کئے ہیں ان پر ان کا کوئی استحقاق نہ تھا۔ نہ یہ اخلاقی طور پر اس کے مجاز تھے، نہ اسلامی طور پر میں نے اس سلسلے میں صحیح قدم اٹھایا ہے اور میں اس باب میں حق بجانب ہوں۔

عاتکہ بنت مروان نے کہا، اگر یہ لوگ آپ کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کریں تو

آپ کا کیا جواب ہوگا اور آپ اپنا تحفظ کس طرح کریں گے؟

فرمایا: میں اللہ سے دعا کروں گا، سچ کی حمایت کے لئے مضبوطی سے کام کروں گا اور اس ضمن میں کسی کی نہ رعایت کروں گا اور نہ کسی سے خوف زدہ ہوں گا۔

عاتکہ نے جواب دیا: بھتیجے! تم سچے ہو، تمھارے تمام اقدامات حق وصداقت پر مبنی ہیں، میں تمھارے مخالفوں کو غلط سمجھتی ہوں، ان کے مقابلے میں تمھاری حمایت میرا فرض ہے۔ میں اپنی استعداد کے مطابق تمھاری ہر ممکن مدد کروں گی، تمھارا فرض ہے کہ ان غلط اندیش لوگوں کے مقابلے میں ڈٹے رہو اور ان کے ناروا مطالبے سے ہرگز کسی پریشانی کا شکار نہ ہو، میں ان کو سمجھانے کی کوشش کروں گی، اگر وہ مان گئے تو ٹھیک، ورنہ تم ثابت قدم رہو۔

عاتکہ بنوامیہ میں بڑی قدر ومنزلت کی حامل تھیں اولاد خلفاء میں ہونے کے باوجود سادہ مزاج اور غرور وتعلی سے پاک تھیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی حامی اور نیک کاموں میں پیش پیش رہتی تھیں۔

☆☆☆

نفیسہ بنت حسن

وہ خاتون جن کے گھر کے سامنے سے اپنا جنازہ لے جانے کی وصیت امام شافعی نے کی تھی۔اور جنھوں نے اپنے مکان ہی میں اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھودی تھی۔

حضرت نفیسہ بنت حسن بن زید بن حسن بن علی بن ابی طالب رحمۃ اللہ علیہا خاندانِ نبوت کی جلیل القدر خاتون تھیں، زہد وعبادت، ورع وتقوی اور نیکی وصالحیت کے اونچے مرتبے پر فائز تھیں۔ یافعی نے ''مراۃ الجنان'' میں، سخاوی نے ''تحفۃ الاحباب'' میں، سیوطی نے ''حسن المحاضرہ'' میں، ابن زیات نے ''الکواکب السیر ۃ'' میں، ابن العماد نے ''شذرات الذہب'' میں، الشبیعی نے ''المستطر ف'' میں اور ابن خلکان نے ''وفیات الاعیان'' میں ان کے حالات بیان کئے ہیں۔مورخین نے ان کے واقعاتِ حیات کو اس نہج سے بیان کیا ہے کہ ان کی زندگی کے تمام ضروری گوشے واضح ہوگئے ہیں۔

حضرت نفیسہ بنت حسن رحمۃ اللہ علیہا ایک روایت کے مطابق ۱۳۴ھ میں اور ایک روایت کی رو سے ۱۴۵ھ میں مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئیں اور مدینہ منورہ کی علمی فضاؤں میں تعلیم وتربیت کی منزلیں طے کیں۔اللہ نے ان کو خاندانی شرف ومجد سے تو نوازا ہی تھا، اس کے ساتھ اپنے دور کے بلند پایہ اساتذہ سے حصولِ علم کے مواقع بھی بہم پہنچائے۔اپنے عظیم باپ حضرت حسن بن زید سے تعلیم حاصل کی۔علاوہ ازیں خانوادۂ نبوت کے دیگر اولو العزم افراد سے بھی لقاء اور کسبِ علم کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئیں۔ان کی شادی امام جعفر صادق علیہ السلام کے صاحب زادے اسحاق رحمۃ اللہ علیہ

کے ساتھ ہوئی تھی۔

ان کے والد حضرت حسن بن زید اس زمانے میں عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کی طرف سے مصر کے گورنر تھے، جو پانچ سال اس منصب پر فائز رہے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت نفیسہ اپنے والد محترم کے ساتھ مصر گئیں اور ایک روایت کی رو سے اپنے شوہر نامدار اسحاق بن امام جعفر صادق کی معیت میں وارد مصر ہوئیں۔ لیکن اسی اثنا میں خلیفہ منصور کی وجہ سے والی مصر حضرت حسن بن زید سے ناراض ہوگیا اور اس ناراضی نے اتنی شدت اختیار کی کہ خلیفہ نے انہیں اس عہدے سے معزول کر کے تمام اختیارات چھین لئے۔ ان کا پورا اثاثہ ضبط کرلیا اور بغداد میں بلوا کر انھیں حوالہ زنداں کردیا۔ اس خاندان کے لئے یہ بڑی اذیت کا دور تھا۔ حضرت حسن بن زید رحمۃ اللہ علیہ منصور کی موت تک قید کی صعوبتوں میں مبتلا رہے۔ منصور کے بعد اس کا بیٹا مہدی مسندِ خلافت پر متمکن ہوا تو انھیں جیل سے نکالا اور اسی پہلے منصب پر بحال کیا۔ اور وہ تمام جائداد بھی واپس کردی جو منصور نے بحق سرکار ضبط کرلی تھی۔

حضرت نفیسہ بنت حسن قرآن کریم کی حافظہ اور اس کی تفسیر پر عبور رکھتی تھیں ان کے علم وفضل کی وسعتوں کا یہ عالم تھا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ مصر گئے تو حضرت نفیسہ کی خدمت میں آئے اور ان سے بعض احادیث کی سماعت کا شرف حاصل کیا۔

ان کے کثرت علم ومعرفت کی وجہ سے لوگ انہیں "نفیسة العلم والمعرفة" کہا کرتے تھے۔ ان کے زہد وتقویٰ اور کثرتِ عبادت کے بارے میں متعدد باتیں رجال وتاریخ کی کتابوں میں مسطور ہیں۔

مروی ہے کہ یہ اللہ کے ڈر سے اکثر روتی رہتیں، ہمیشہ رات کو قیام کرتیں اور دن کو روزے رکھتیں۔ کھانے میں قلت کا یہ حال تھا کہ ہر تیسری رات چند لقمے حلق میں اتارتیں، پھر ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ شوہر کی غیر موجودگی میں کھانے کے دسترخوان پر نہ

بیٹھتیں جب کچھ کھانا ہوتا شوہر کی موجودگی میں اور ان کے ساتھ کھاتیں۔انھوں نے تیس حج کئے اور حج کے موقع پر غلافِ کعبہ سے لپٹ جاتیں اور دعا مانگتیں اور یہ الفاظ کہتیں:

الهي وسيدي ومولای متعني وفرحني برضاک عني

زینب بنت یحیٰ المتوج کہتی ہیں کہ مجھے متواتر چالیس برس اپنی پھوپھی نفیسہ کی خدمت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا۔اس اثناء میں کبھی میں نے انھیں شب کو سوتے اور دن کو بغیر روزے کے نہیں دیکھا۔ایک روز میں نے ان سے کہا، کیا آپ اپنے آپ پر ترس نہیں کرتیں؟ فرمایا کیسے ترس کروں جب کہ میرے آگے دور تک ایسی خوف ناک وادیاں پھیلی ہوئی ہیں جنھیں کوئی آرام طلب طے نہیں کرسکتا۔

بشر بن حارث حافی ان کی خدمت میں بالالتزام حاضر ہوتے۔ایک مرتبہ بشر بیمار ہوئے تو حضرت نفیسہ عیادت کے لئے گئیں۔اس وقت امام احمد بن حنبل بھی وہاں تشریف فرما تھے جو ان کی عیادت کے لئے آئے تھے۔انھوں نے نفیسہ کو دیکھا تو حضرت بشر سے پوچھا یہ کون خاتون ہیں؟ انھوں نے کہا نفیسہ بنت حسن ہیں جو میری عیادت کے لئے آئی ہیں۔امام احمد نے بشر سے کہا یہ نفیسہ ہیں تو ان سے دعا کے لئے عرض کیجئے۔ چنانچہ بشر نے دعا کے لئے درخواست کی تو نفیسہ نے ان الفاظ میں دعا مانگی:

”اے اللہ بشر بن حارث اور احمد بن حنبل تجھ سے دوزخ کی آگ سے محفوظ رہنے کی التجا کرتے ہیں، ارحم الراحمین ان کو دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھیو“۔

حضرت نفیسہ دولت مند خاتون تھیں اور ان کا تمام مال ودولت مریضوں، جذامیوں اور حاجت مندوں پر خرچ ہوتا تھا۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ دیار مصر میں گئے تو حضرت نفیسہ نے ان کی مالی امداد کی۔بعض دفعہ امام شافعی کے ہاں نماز پڑھنے کے لئے بھی تشریف لے جاتیں۔کہتے ہیں امام شافعی ان کی زیارت کو گئے تو پردے کی اوٹ میں بات کی اور دعا کے لئے بھی ملتجی ہوئے۔اس وقت ان کے ساتھ عبداللہ بن حکم بھی تھے۔

امام شافعی فوت ہوئے اور ان کا جنازہ پڑھا گیا تو حضرت نفیسہ بھی گئیں اور الگ نماز جنازہ ادا کی۔

ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ امام شافعیؒ نے وصیت کی تھی کہ ان کا جنازہ حضرت نفیسہ کے گھر کے سامنے سے لے جایا جائے۔ چنانچہ وصیت کے مطابق ان کا جنازہ حضرت نفیسہ کے گھر کے سامنے پہنچا تو انھوں نے گھر میں ان کی نماز جنازہ پڑھی۔

ایک مرتبہ ان کے پاس لوگوں نے مصر کے ایک حکمراں کی ستم رانیوں کی شکایت کی اور فریاد کناں ہوئے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے۔ فرمایا وہ کب باہر نکلے گا؟ لوگوں نے عرض کیا کل۔ نفیسہ نے اسی وقت قلم پکڑا، ایک رقعہ لکھا اور اس کے راستے میں پھینک دیا اور اسے آواز دی۔ جب اس نے حضرت نفیسہ کو دیکھا تو آداب بجا لایا، گھوڑے سے اترا، رقعہ ہاتھ میں لیا اور اسے پڑھا۔ اس میں مرقوم تھا تم بادشاہ بن گئے ہو، تم نے لوگوں کو قید کر ڈالا ہے، ان پر تسلط جما لیا ہے، ظلم وقہر پر اتر آئے ہو، خودسری کو پیشہ بنا لیا ہے، سرکشی سے لوگوں کو دبانا شروع کر دیا ہے، لوگوں کی روزی پر قابض ہو کر اسے ضائع کرنے کو اپنا وطیرہ بنا لیا ہے۔ تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ سحری کے وقت لوگوں کی زبانوں سے جو آہوں کے تیر نکلتے ہیں وہ کبھی خطا نہیں جاتے۔ وہ ٹھیک نشانے پر بیٹھتے ہیں، بالخصوص وہ تیر تو قطعاً خطا نہیں جاتے جو ان دلوں سے نکلے ہوں جن کو تم نے ظلم کی بے پناہیوں سے مجروح کر ڈالا ہے، جن کے سینوں کو چھلنی کر دیا ہے، بھوک کی شدت سے جن کے معدے سکڑ گئے ہیں اور جن کے جسم تمھاری حد سے بڑی ہوئی الم ناکیوں سے عریاں ہو گئے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ مظلوم مر جائے اور ظلم آب وتاب کے ساتھ دنیا میں باقی رہے۔ تم جو جی چاہے کرو ہم بہر حال صبر وضبط سے کام لیں گے۔ تم ظلم ڈھاؤ ہم اس کی فریاد اللہ سے کریں گے۔ تم ستم رانی کا مظاہرہ کرو ہم اس کا بدلہ لینے کے لئے اللہ کو پکاریں گے۔ قرآن نے بالکل صحیح کہا ہے، **وسیعلم الذین ظلموا ای**

منقلب ینقلبون.

اس رقع کا یہ اثر ہوا کہ وہ حکمراں اسی وقت واپس چلا گیا۔

نفیسہ سات سال مصر میں رہیں۔ اس کے بعد انھیں بیماری نے آ گھیرا، تکلیف زیادہ بڑھی تو اپنے شوہر اسحاق کو خط لکھا اور بیماری کی اطلاع دی۔ اس اثناء میں انھوں نے اپنے مکان ہی میں اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھودی۔ روزانہ اس قبر میں اترتیں اور قرآن پڑھتیں۔ اس قبر میں انھوں نے ایک سو نوے قرآن ختم کیے، وہ روزے سے تھیں کہ ایک روایت کے مطابق ۶۳ اور ایک کے مطابق ۷۴ برس عمر پا کر ۲۰۸ھ میں انتقال کر گئیں۔ وقتِ موت قریب پہنچا تو لوگ دوڑے ہوئے آئے اور روزہ چھوڑنے اور پانی پینے پر مجبور کیا۔ لوگوں کے اصرار سے تنگ آ کر فرمایا میں تیس سال سے اللہ کے حضور دعا مانگ رہی ہوں کہ اس سے روزے کی حالت میں ملوں، کیا تم چاہتے ہو کہ اب روزہ چھوڑ دوں؟ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اس وقت رات کی تاریکی چھا رہی تھی۔ انھوں نے سورہ الانعام کی تلاوت شروع کی۔ جب لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِندَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (یہ سورہ الانعام کی آیت نمبر ۱۲۷ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے۔ ان کے لئے ان کے اعمال کے صلے میں پروردگار کے ہاں سلامتی کا گھر ہے اور وہی ان کا دوست دار ہے) پر پہنچیں تو بے ہوشی طاری ہوگئی۔ پھر فرشتۂ موت نے دستک دی اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ وفات کے بعد اسی روز ان کے شوہر مدینہ طیبہ سے مصر آ گئے۔

شوہر نے لوگوں سے کہا کہ میں ان کی میت مدینہ منورہ لے جانا اور جنت البقیع میں دفن کرنا چاہتا ہوں، لیکن اہلِ مصر نے امیر شہر کی طرف رجوع کیا اور عرض کیا کہ وہ اسحاق سے التجا کریں کہ وہ ان کی میت کو مدینہ منورہ نہ لے جائیں اور یہیں دفن کریں۔ مگر اسحاق نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور میت کو مدینہ لے جانے پر مصر رہے۔ ان کے انکار سے لوگوں کو سخت صدمہ پہنچا۔ انھوں نے اکٹھے ہو کر بہت سا مال جمع

کیا اور جس اونٹ پر وہ مدینہ منورہ سے آئے تھے اس کی خرجیاں مال و دولت سے بھر ڈالیں۔ لیکن وہ صبح کو اسحاق کے پاس آئے تو اسحاق کا ارادہ بدل چکا تھا۔ لوگوں نے کہا ہم نے آپ کو بہت سا ساز و سامان اور زادراہ دے دیا ہے۔ کہا ہاں میں نے اسے دیکھ لیا، مگر میں تمھیں بتاؤں کہ رات میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ مجھے حکم دے رہے تھے کہ ان کا مال و منال انھیں واپس کردو اور نفیسہ کو یہیں مصر میں دفن کرو۔ چنانچہ جس مکان میں وہ سکونت پذیر تھیں وہیں دفن کی گئیں۔ جس محلے میں ان کا مکان تھا، اس کا قدیم نام "درب السماع" تھا۔ بعد میں وہ پورا محلّہ مسمار ہو گیا اور صرف ان کی قبر باقی رہ گئی۔ باشندگانِ مصر کو اس قبر اور مکان سے سخت عقیدت تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یہاں دعا قبول ہوتی ہے اور مرادیں بر آتی ہیں۔ ذہبی کا کہنا ہے کہ لوگ وہاں سجدہ ریز ہوتے تھے اور معاملہ شرک کی حد تک پہنچ گیا تھا، جہاں وہ کئی قسم کی مشرکانہ حرکتیں کرتے تھے۔

یافعی کہتے ہیں وہ بہت بڑا مزار ہے، میں وہاں گیا تو دیکھا کہ عورتوں، مردوں، تندرستوں، مریضوں اور اندھوں کا ایک بڑا ہجوم جمع ہے۔ مزار کا نگراں یا متولی کرسی پر بیٹھا ہے۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہوا لیکن میں نے اس کی طرف التفات نہیں کیا اور قبر کی زیارت کے لئے آگے نکل گیا۔ میری یہ بے نیازی اسے ناگوار گزری اور مجھ پر خفگی کا اظہار کیا۔ میں نے اس سے کہا میں اصحاب عز و جاہ اور ارباب حشم و مناصب کی طرف کبھی ملتفت نہیں ہوا۔

یافعی کہتے ہیں وہ یہ سن کر خاموش ہو گیا اور میں واپس آ گیا۔

☆☆☆

زبیدہ بنت جعفر

وہ خاتون جنھوں نے اپنی خوبیوں اور ذہانت سے ہارون الرشید جیسے عظیم حکمراں کو اپنا مطیع بنالیا تھا۔

عباسی خلیفہ منصور کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام جعفر تھا اور ایک کا مہدی۔ زبیدہ جعفر کی بیٹی تھیں، جو موصل میں پیدا ہوئیں۔ جہاں ان کا باپ جعفر گورنر تھا۔ ان کا اصل نام امۃ العزیز تھا۔ یہ ابھی شیر خوار تھیں کہ باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئیں۔ ان کی پرورش خلیفہ منصور عباسی نے کی جو ان کے دادا تھے۔ انھوں نے ان کی تعلیم و تربیت خاص اہتمام سے کی۔ انھیں زبیدہ اس لئے کہا جانے لگا کہ ان کے دادا منصور دونوں ہاتھ پکڑ کر انھیں گھمایا کرتے تھے۔ لہٰذا یہ زبیدہ کے لقب سے مشہور ہوگئیں۔ زبیدہ اس لکڑی کو کہا جاتا ہے جس سے مکھن نکالا جائے اور یہی لقب نام پر غالب آ گیا۔

خلیفہ منصور عباسی کے ایک بیٹے کا نام مہدی تھا۔ مہدی کا بیٹا ہارون الرشید تھا جس کے ساتھ ۱۶۵ھ میں زبیدہ کی شادی ہوئی۔ زبیدہ کی عمر اس وقت بیس برس تھی۔ شادی بڑی دھوم دھام سے کی گئی۔ اس میں مشک و عنبر کی گولیاں لٹائی گئیں اور انتہائی مسرت کا اظہار کیا گیا۔ دعوت ولیمہ بہت پر تکلف تھی۔ اس میں سونے چاندی کی خوب صورت چیزیں وسیع پیمانے پر تقسیم کی گئی تھیں۔ قاضی القضاۃ امام ابو یوسف کا کہنا ہے کہ ولیمے کی دعوت میں ستائیس کروڑ پچاس لاکھ درہم صرف ہوئے تھے۔

کہتے ہیں زبیدہ کو جو شادی کا جوڑا دیا گیا تھا اس میں بہت سے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے اور وہ جوڑا جواہرات کی وجہ سے اس قدر بھاری تھا کہ اسے پہن کر چلنا مشکل ہوگیا تھا۔

زبیدہ سے شادی کے پانچ سال بعد ۱۷۰ھ میں ہارون الرشید سریر آرائے سلطنت ہوا۔اس وقت یہ شہزادی اسلامی عہد کی ایک جلیل القدر ملکہ تھیں۔ہارون الرشید نے انھیں قصرِ اسلام میں اتارا جو بغداد کا عظیم الشان اور خوب صورت محل تھا۔

زبیدہ بے شمار خوبیوں کی مالک تھیں اور اپنی خوبیوں اور ذہانت کی بنا پر انھوں نے ہارون الرشید جیسے عظیم حکمراں کو اپنا مطیع بنالیا تھا۔زبیدہ میں ایک کمال یہ تھا کہ انھوں نے کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا اور تمام عمر اپنے شوہر کی اطاعت شعار رہیں۔ملکی معاملات میں ہارون الرشید نے بھی ان سے کبھی کوئی مشورہ نہیں لیا،البتہ گھریلو معاملات ہمیشہ انہی کے مشورے اور رائے سے انجام پائے۔ہارون الرشید نے زبیدہ سے نکاح کے بعد کئی شادیاں کیں۔لیکن زبیدہ نے شوہر کے اس قسم کے نجی معاملات میں نہ کبھی دخل دیا اور نہ کبھی کسی قسم کی ناراضی کا اظہار کیا۔زبیدہ ہاشمیہ تھیں اور بڑے بلند کردار کی مالک تھیں۔امین الرشید زبیدہ کا بہت پیارا بیٹا تھا اور نجیب الطرفین ہاشمی خلیفہ تھا۔

ہارون الرشید کے دور میں زبیدہ نے نہایت شان وشوکت کی زندگی بسر کی۔ ان کے لئے کئی کروڑ کی جاگیر مقرر تھی۔زبیدہ کے کہنے سے ہارون الرشید نے امین الرشید کو اپنا جانشین مقرر کردیا تھا،حالانکہ مامون الرشید،امین الرشید سے زیادہ ذہین وفطین تھا،اور غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک۔مامون پر امین کو ترجیح دینے کی وجہ سے ان دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ بھی ہوئی،جس کا نتیجہ امین کے قتل اور مامون کی جیت کی صورت میں ظاہر ہوا۔مگر مامون کی دوراندیشی اور فہم وفراست ملاحظہ ہو کہ اس نے زبیدہ کے احترام واکرام میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔وہ اسی طرح ان کا اعزاز کرتا رہا جس طرح ہارون اور امین کرتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ زبیدہ بھی مامون کو صائب مشورے دیتی تھیں اور اپنے شوہر اور بیٹے کو قریب قریب بھول ہی گئی تھیں۔

مامون نے زبیدہ کو ماں کا درجہ دیا،قصر الخلافۃ میں آباد کیا،مصارف کے لئے

ایک لاکھ اشرفیاں اور دس لاکھ درہم پیش کیے اور خود آ کر قدم بوس ہوا۔ مامون کی اس خدمت اور اطاعت کی وجہ سے زبیدہ کا دل اس کی طرف سے بالکل صاف ہو گیا اور وہ اسے اپنے بچے کی طرح چاہنے لگیں۔

شوہر کی وفات کے بعد زبیدہ نے عیش و آرام کی زندگی بالکل ترک کر دی تھی اور وظائف و اوراد میں مشغول رہنے لگی تھیں۔

۲۰۸ھ میں زبیدہ نے مامون کی بیوی بوران سے حج بیت اللہ کے لئے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ بوران نے مامون سے ذکر کیا اور مامون نے نہایت خوشی سے اجازت دے دی اور وسیع پیمانے پر سامانِ سفر بھی دیا اور بہت سے خدام بھی ساتھ کر دیئے۔ خود زبیدہ بھی اپنے ذاتی خزانے سے لاکھوں روپے ساتھ لے گئی تھیں۔

زبیدہ نے عراق کا عام راستہ چھوڑ کر شام کی طرف سے مکہ مکرمہ جانے کا عزم کیا۔ راستے میں مسجدیں، سرائیں اور پل بنوائے، جن پر سترہ لاکھ اشرفیاں خرچ ہوئیں۔ بیت المقدس کو جاتے ہوئے جب زبیدہ کا یہ کارواں لبنان پہنچا تو لوگوں نے پانی کی قلت کی شکایت کی۔ زبیدہ نے اسی وقت ماہرین اور انجینئروں کو طلب کیا اور جبل لبنان سے ایک نہر جاری کرائی جس کے ذریعے بیروت تک بافراط پانی میسر آ گیا۔ اس نہر پر جو پل بنائے گئے تھے، وہ اب بھی قناطر زبیدہ کے نام سے مشہور ہیں۔

مکہ مکرمہ جا کر معلوم ہوا کہ حج کے زمانے میں بعض اوقات پانی بالکل میسر نہیں آتا اور ایک مشکیزہ پانی کی قیمت ایک اشرفی تک پہنچ جاتی ہے، لہٰذا زبیدہ نے نہر نکالنے کا حکم دیا اور انجینئروں نے پیمائش کر کے مکہ کی سنگلاخ زمین کو ہموار کیا اور ایک نہر نکالی جس پر ایک کروڑ روپے صرف ہوئے۔ یہ نہر آج بھی ''نہر زبیدہ'' کے نام سے معروف ہے۔ اس نہر کی وجہ سے پانی کی قلت ختم ہو گئی۔

''تاریخ بغداد'' میں خطیب بغدادی نے ایک محدث کا خواب بیان کیا ہے کہ

انھوں نے خواب میں زبیدہ سے پوچھا: کہ اللہ نے تمھارے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟

زبیدہ نے جواب دیا: نہر کی کھدائی کے سلسلے میں پہلی کدال جو سرزمینِ مکہ میں پڑی، اسی وقت میری مغفرت ہوگئی تھی۔

اس نہر کے علاوہ مسافروں اور عازمین حج کے آرام کے لئے زبیدہ نے بہت سے حوض اور تالاب بنوائے، جن سے آج تک عرب قافلے سیراب ہورہے ہیں۔

زبیدہ کو تعمیرات کا خاص شوق تھا اور اس سلسلے میں ان کا ذہن بڑا تیز تھا۔ایک روایت کے مطابق ''بدخشاں'' اور ''تبریز'' زبیدہ کے آباد کردہ شہر ہیں۔

بغداد میں قصرِ اسلام کے قریب زبیدہ نے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی جس پر تیس ہزار اشرفیاں خرچ ہوئیں۔

کہتے ہیں یورپ کے عجائب خانوں کے دورِ زریں کی بہت سی یادگاریں آج بھی محفوظ ہیں، جن میں سے زربفت کا ایک تھان بھی ہے جو صرف زبیدہ کے لئے بغداد کے کارخانوں میں تیار ہوا تھا اور جس کی قیمت پچاس لاکھ اشرفیاں تھی۔قصر اسلام کے بڑے ہال کے لئے ایک ریشمی فرش زبیدہ نے تیار کرایا تھا، اس فرش پر دس لاکھ اشرفیاں خرچ ہوئی تھیں۔

مورخین کا کہنا ہے کہ عبادت اور رسوم شرعیہ کی انجام دہی کے باب میں زبیدہ حضرت رابعہ بصریہ کے نقشِ قدم پر چلتی تھیں اور ان کے محل میں سو کنیزیں ایسی تھیں جو قرآن کی حافظہ تھیں اور روزانہ دس دس پارے تلاوت کرتی تھیں۔

زبیدہ کی تعلیم وتربیت ان کے دادا خلیفہ منصور عباسی کے اہتمام میں ہوئی تھی۔ وہ ادب کا بھی صاف ستھرا ذوق رکھتی تھیں۔ادب کی کتابوں میں ان کے ان خطوط کا بھی تذکرہ ہے جو انھوں نے مامون کو لکھے۔زبیدہ شاعرہ نہ تھیں، لیکن اپنے بیٹے امین کا زور دار اور دردناک مرثیہ لکھ کر مامون الرشید کو بھیجا۔

ہارون الرشید کی وفات کے بعد امین الرشید نے بغداد پر قبضہ کرکے کاروبار حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ۱۹۷ھ میں مامون الرشید کے جرنیل طاہر بن حسین نے بغداد کا محاصرہ کرلیا۔ ایک سال محاصرہ جاری رہا۔ آخر امین نے شکست کھائی۔ ۲۵ر محرم ۱۹۸ھ کو طاہر بن حسین نے اسے گرفتار کرکے قتل کردیا۔ اس کے بعد پوری اسلامی مملکت پر مامون الرشید کا قبضہ ہوگیا اور وہ نہایت اطمینان کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔ ملکہ زبیدہ کو بیٹے کے قتل کی اطلاع پہنچی تو بے حد مغموم ہوئیں۔ وہ شاعرہ نہ تھیں لیکن شعر کا بھی ذوق رکھتی تھیں۔ ان کے ذوق شعری نے شدت اختیار کی تو غم واندوہ کی وہ کیفیت جو سینے میں آگ کی صورت میں بھڑک رہی تھی، مندرجہ ذیل مرثیے کے قالب میں ڈھل گئی۔

الوارث علم الاولین وفهمهم وللملك المامون من ام جعفر	ام جعفر کی طرف سے یہ خط ہے خلیفہ مامون کے نام جو کہ پہلوں کے علم وفہم کا وارث ہے۔
كتبت وعيني مستعمل دمو موعها اليك ابن عمر من جفون ومحجر	اے ابن عمر میں تجھ کو لکھ رہی ہوں اور میری آنکھیں پلکوں سے خون بہاتی ہیں۔
وقد مستني ذل وضر كابة وارق عيني يابن عمي تفكر	مجھ کو ذلت اور اذیت دہ رنج پہنچا اور فکر نے میری آنکھوں کے بے خواب کردیا۔
اتى طاهر لاطهر الله طاهرا فما طهر فيمااتى بمطهر	یہ طاہر کیا ہوا ہے خدا جس کو طاہر نے کرے اور جو کچھ اس نے کیا اس کے الزام سے پاک نہیں ہوسکتا۔
فاخرجني مكشوفة الوجه حاسرا وانهب اموالي واخرب ادوري	اس نے مجھ کو برہنہ سر اور بے پردہ گھر سے نکالا اور میرا مال لوٹ لیا اور میرے مکانات برباد کردیئے۔

یـعـز عـلـی هـارون ما قد لقیته فان کان ما ابدی بامرک صبرت لامر من مقدر

اس ایک چشم ناقص الخلقت کے ہاتھ سے مجھ پر جو گزری ہارون ہوتا تو اس پر گراں گزرتا۔ طاہر نے جو کچھ کیا اگر تیرے حکم سے کیا تو مقدر پر میں صبر کرتی ہوں۔

مامون کو یہ خط ملا اور اس نے یہ اشعار پڑھے تو وہ بے اختیار رو پڑا اور کہا ''واللہ میں خود اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لوں گا''۔

ہارون الرشید نے ۱۹۳ھ کو خراسان میں وفات پائی۔ اس طرح زبیدہ اٹھائیس برس خلیفہ ہارون الرشید کی رفیقۂ حیات رہیں۔ ۷۱ سال عمر پا کر یکم جمادی الاولیٰ ۲۱۶ھ کو بغداد میں فوت ہوئیں۔

☆☆☆

حضرت حسنیٰ

وہ بیباک خاتون جنھوں نے عباسی حکمراں مامون الرشید کے دربار میں اس کی لغزشوں پر شدید تنقید کی تھی۔

امام احمد بن حنبل ائمہ اربعہ میں سے ایک جلیل القدر امام تھے۔ فقہیات میں حنبلی فقہ کی بنیاد انہی سے قائم ہوئی، ان کی قربانیوں کی حدود بہت وسیع ہیں۔ ان کا خشیت الٰہی کا جذبہ نہایت گہرا تھا اور وہ اللہ کے سوا کسی سے خوف زدہ نہ ہوتے تھے۔ جن لوگوں کو ان کی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا، وہ بھی انہی اصولوں کے حامل بن گئے جن کے حامل یہ خود تھے۔ ان کے ملازموں اور حلقہ نشینوں میں ایک خاتون حسنیٰ تھیں انھوں نے امام احمدؒ سے باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور اخذ روایت کے شرف سے بہرہ مند ہوئیں۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے خلق قرآن کے مسئلے میں خلیفۂ وقت کے نقطۂ نظر کی مخالفت کی تو انھیں شدید ابتلاء و آزمائش سے دوچار کیا گیا اور ایسی الم ناک تکلیفیں دی گئیں کہ جن کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اپنے آقا کی آزمائش کے دور میں اس خاتون نے ان کا پورا ساتھ دیا۔ یہ باقاعدہ قید خانے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتیں اور مزاج پرسی کرتیں۔ جب حکومت کی طرف سے ملاقات کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا تو اس باہمت خاتون نے بغداد کے لوگوں میں امام کے عقیدے کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ حکومت کے کارندوں اور اہل کاروں نے انھیں اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر انھوں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ بعض ارکان حکومت نے

انھیں بھی گرفتار کرنے کا ارادہ کیا، لیکن کچھ لوگ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس مسئلے میں ایک عورت کو گرفتار کرنا اور اسے اتنی اہمیت دینا قرینِ عقل نہیں۔ اس سے لوگوں میں یہ تاثر پیدا ہوگا کہ عورتیں بھی ان مسائل پر نظر رکھتی ہیں اور امام احمدؒ کے موقف کی حامی ہیں۔

امام احمدؒ کی اس کنیز یا ملازمہ کا شمار اس دور کے علماء وفضلاء میں ہوتا تھا اور وہ اپنے عہد کی تمام اصناف علم پر عبور رکھتی تھیں۔ انھیں امام احمدؒ سے ان کے بعض فتاوے اور بہت سے مسائل روایت کرنے کا فخر حاصل ہے۔ یہ خواتین کی مبلغ تھیں اور گھر گھر جا کر اپنے استاد کے فقہی نقطۂ نظر کی تبلیغ کرتی تھیں۔ انھوں نے اپنے مکان کو ایک مدرسے کی حیثیت دے رکھی تھی، جس میں شہر کی عورتیں باقاعدہ تعلیم حاصل کرتی تھیں۔

یہ خاتون ایک نادار اور غریب خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، لیکن طبیعت کی بے نیاز تھیں، کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہ کرتی تھیں۔ عورتوں کو مفت تعلیم دیتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ تعلیم پر اجرت لینا گناہ ہے اور اللہ ورسول ﷺ کے احکام وفرامین کو دنیا کی حقیر متاع کے عوض فروخت کردینے کے مترادف ہے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ اپنی شاگردوں سے اپنا کوئی ذاتی کام نہ لیتی تھیں۔ فرمایا کرتیں اس سے خودغرضی پیدا ہوتی ہے اور لوگوں کے ذہن میں یہ تاثر ابھر آنے کا خطرہ رہتا ہے کہ میں نے شاید تعلیم کا یہ سلسلہ لڑکیوں سے اپنے ذاتی اور گھریلو کام کرانے کی غرض سے شروع کیا ہے۔ دوسروں سے کام لینے کا ایک نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ انسان میں آرام طلبی پیدا ہوجاتی ہے اور وہ خود اپنا کام انجام دینے کے قابل بھی نہیں رہتا۔ دوسرے یہ کہ طبیعت میں دوسروں پر حکم چلانے کی عادت پیدا ہوجاتی ہے، جو کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ کہا کرتی تھیں بہتر آدمی وہ ہے جو اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتا ہے، کیونکہ رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ اگر تم

گھوڑے پر سوار ہو اور ہاتھ سے لگام گر کر نیچے آجائے تو کسی سے نہ کہو کہ وہ تمھیں لگام اٹھا دے، خود ہی لگام اٹھاؤ۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی وفات (۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ) کے بعد ان کی بیوہ نے (جو ان کے بیٹے عبداللہ کی ماں تھیں) حسنیٰ کی شادی ایک شخص سے کی، اس سے ان کے پانچ بچے ہوئے، جن میں چار لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ لڑکوں کے نام علی الترتیب حسن، حسین، محمد اور سعید تھے۔ اور لڑکی کا نام زینب تھا۔ حسنیٰ کے یہ بچے بھی ماں کی طرح نیک اور سعادت مند تھے۔ ماں نے احسن طریق سے ان کی تربیت کی اور انھیں خود ہی ابتدائی تعلیم دی۔

لڑکے بڑے ہوئے تو ان کی انتہائی تعلیم کا خاص طور سے اہتمام کیا اور انھیں مشہور محدثین اور فقہاء کی خدمت میں بھیجا۔ شادی کے بعد بھی حضرت حسنیٰ رحمۃ اللہ علیہا نے خواتین کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ تعلیم کے باب میں ان کا قول ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو عالم کامل سمجھتا ہے، وہ جہالت کی وادی میں گھومتا رہتا ہے۔ تعلیم کی سعادت اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو اس کی ضرورت محسوس کرتا اور اس کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا مغرور اور بد مزاج آدمی تعلیم کی لذت سے محروم رہتا ہے۔ اصل عالم وہ ہے جو اپنے اندر سے کبر و نخوت کے جراثیم نکال دے۔ جس ذہن پر رعونت نے قبضہ جما رکھا ہے وہاں علم کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ ان کا کہنا ہے کہ غرور اور علم ایک دوسرے کی ضد ہیں، جس نے غرور سے رابطہ قائم کیا اس نے علم کو اپنے سے دور کر لیا۔ علم دوسرے کی احتیاج کا طالب ہے جب تک احتیاج نہ ہوگی منزل کا ادراک ممکن نہیں ہوگا۔ غرض حسنیٰ عالمہ وفاضلہ اور صالحہ خاتون تھیں۔ فقہی لحاظ سے حنبلی مسلک پر عامل تھیں اور تعبیر مسائل میں عام طور پر اسی کو حق بجانب سمجھتی تھیں، لیکن ان کو یہ اصرار نہ تھا کہ ہر مسئلے میں یہی مسلک صحیح ہے، بلکہ متعدد مسائل میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو ترجیح دیتی تھیں، کیونکہ عمل

میں اہل مدینہ کو خاص اہمیت حاصل ہے اور امام مالک اس کے قائل تھے۔

حق گوئی میں بڑی بے باک تھیں۔ایک مرتبہ عباسی حکمراں مامون الرشید کے دربار میں گئیں اور اس کی لغزشوں پر شدید تنقید کی۔مامون ایک عورت کے جرأت مندانہ طرز کلام سے متاثر بھی ہوا اور حیران بھی۔اہل دربار سے دریافت کرایا کہ یہ کون خاتون ہے۔جب اسے معلوم ہوا کہ ان کا نام حسنیٰ ہے تو رو پڑا اور کہا اگر چہ تم نے تمام باتیں میرے خلاف کہی ہیں اور میرے افکار و تصورات پر سخت ضرب لگائی ہے،لیکن مجھے اس پر کوئی خفگی نہیں،تم بات کر رہی تھیں تو مجھے یہ خیال آ رہا تھا کہ یہ کس قدر بہادر اور حق گو خاتون ہے،کاش سبھی لوگ اس جیسے حق گو ہو جائیں اور ہر معاملے میں جرأت اور بہادری کا ثبوت دیں۔

اسما بنت اسد

ایک مشہور فاضلہ جنھیں رجال وسیر حدیث وفقہ اور دیگر مروجہ علوم میں کمال حاصل تھا۔

''ائمہ دین میں سے آپ کے نزدیک سب سے بڑا امام کون ہے''؟

''امام ابوحنیفہ''۔

''اللہ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے، وہ واقعی بہت بڑے امام تھے''؟

''ہاں! ان کی نظر بہت وسیع تھی اور فقاہت میں ان کا کوئی حریف نہ تھا''۔

''وہ فقہ پر عبور رکھتے تھے''؟

''عبور کا کیا مطلب؟ وہ فقہ کے ایک مستقل مکتبِ فکر کے بانی تھے''۔

''ان کا اندازِ فقاہت کیسا تھا؟''

''وہ مشکل سے مشکل مسائل کو نہایت آسانی سے حل کر دیتے اور مسائل کی چند الفاظ میں تشریح فرما دیتے تھے''۔

''ان کے مشہور شاگرد کون کون ہیں''؟

''امام ابویوسف، امام محمد اور امام زفران کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں''۔

حضرت اسما بنت اسد بن فرات رحمۃ اللہ علیہا کے ایک مشہور شاگرد عبداللہ بن یحییٰ نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی فقہ کے بارے میں چند سوال کئے جن کے انھوں نے آسان اور عام فہم انداز میں یہ جواب دیئے۔

اسما بنت اسد قیروان کی رہنے والی تھیں اور علم وفضل کے اعتبار سے اپنے دور میں نہ صرف سب خواتین سے آگے تھیں بلکہ اکثر مرد علماء وفقہاء بھی ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ ان کے حالات ''شہیرات التونسیات'' میں حسن حسنی عبدالوہاب نے بیان کئے ہیں۔

یہ جلیل القدر خاتون ۱۹۲ھ میں قیروان کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد اسد بن فرات بہت بڑے فقیہ، محدث اور رجال وسیر کے عالم تھے۔ انھوں نے اپنی اس بیٹی کو بڑی محنت سے تعلیم دلائی اور بڑے بڑے علماء وفقہاء کی خدمت میں بھیجا۔ انھوں نے ان کی تربیت کا خاص طور سے اہتمام کیا اور تمام علوم کے حصول کے مواقع فراہم کئے۔ یہ عالمِ طفولیت میں تھیں کہ ان کے والد جناب اسد بن فرات انھیں علمی مجلسوں میں اپنے ساتھ لے جاتے اور انھیں حدیث وفقہ کے نکات سمجھاتے۔ فقہی مناظروں اور بحث وتمحیص کی مجلسوں میں بھی وہ انھیں اپنے ساتھ رکھتے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ علم وادراک کے تمام گوشوں پر حاوی ہوگئیں۔ رجال وسیر پر عبور حاصل کرلیا اور حدیث وفقہ اور اس دور کے مروجہ علوم میں درجۂ کمال کو پہنچیں۔

اس زمانے میں قیروان ایک عظیم علمی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا اور علماء حدیث وفقہ کی بہت بڑی جماعت اس میں فروکش تھی۔ جابجا علمی محفلیں جمتی اور مختلف موضوعات پر آزادانہ گفتگو ہوتی۔ اسما کے والد ان سب میں شرکت کرتے اور اپنی اس بیٹی کو ساتھ رکھتے۔ قیروان میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے معتقد بھی خاصی تعداد میں تھے اور امام مالک اور امام شافعی (رحمہما اللہ) کے متبعین بھی۔ اس زمانے میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی ان قربانیوں کی بڑی شہرت تھی جو انھوں نے خلقِ قرآن کے مسئلے سے متعلق دی تھیں اور جو عباسی حکمراں مامون الرشید کے افکار وخیالات کے خلاف ایک

زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتی تھیں۔ امام احمدؒ نے اپنی ان قربانیوں کی بدولت ہر طبقے کے علماء وزعماء کے دل جیت لئے تھے اور سب لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔

مامون الرشید کی کوششوں سے کلامی بحثوں کا بھی آغاز ہو چکا تھا اور فلسفہ وحکمت کی گرفت دلوں پر خاصی گہری ہوگئی تھی۔ اسما ان سب مباحث سے آشنا تھیں اور بسا اوقات ایک فریق کی حیثیت سے ان میں شریک ہوتی تھیں۔

یہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متبعین میں سے تھیں اور ان کی فقہ پر عبور رکھتی تھیں۔ اس مسلک کے فقہاء میں ان کو عزت وحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا کیونکہ اس باب میں یہ بے حد معلومات رکھتی تھیں۔ مختلف علوم کی تحصیل کے بارے میں یہ خاتون بہت وسیع القلب تھیں اور ان کا عقیدہ تھا کہ علوم میں حد بندی قلت معلومات اور کم عقلی کا نتیجہ ہے۔ ہر شخص کو اپنی معلومات بڑھانے کے لئے ہر قسم کے علوم سے متمتع ہونا چاہئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک مجلس میں فرمایا:

علم کی اپنی ایک تعریف ہے، علم کا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کو تنگ نظری اور تعصب کی بیماری سے نجات دلاتا ہے۔ جو شخص جتنا وسیع المطالعہ اور وسعت معلومات کا حامل ہوگا، اس کا دل اسی نسبت سے حسد وکینہ اور بغض وعداوت کے جراثیم سے پاک ہوگا۔ علم ایک عظیم ورثہ ہے، جسے ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل ہوتے رہنا چاہئے۔ علم ذہن کو جلا بخشتا ہے، دماغ کو نورِ بصیرت عطا کرتا اور دل کو خاص قسم کی پاکیزگی سے نوازتا ہے۔ جو لوگ علم تفسیر حاصل کرتے اور فقہ سے جی چراتے ہیں، وہ بھی علم کے دشمن ہیں اور جو فقہ کو حدیثِ رسول اللہ ﷺ پر ترجیح دیتے ہیں وہ بھی اپنی جہالت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، اور جو فقہ سے اغماض کرکے تاریخ اور امم سابقہ کے واقعات پر عبور حاصل کرتے ہیں، وہ بھی انصاف کے تقاضوں سے منحرف ہوتے ہیں، جب تک

قرأت، تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ کے تمام علوم حاصل نہیں کئے جائیں گے۔ ذہن سمٹے اور سکڑے رہیں گے، ان کے سامنے دلوں کی تازگی اور شگفتگی کے دریچے نہیں کھل سکیں گے۔ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی متبع ہوں، ان کی فقہ اور ان کے فقہی رجحانات وافکار کو صحیح سمجھتی ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کی فقہ انسانی ذہن کے مطابق ہے اور مسائل کے بارے میں ان کی تعبیر ووضاحت پر اعتماد کرنا چاہئے۔ لیکن میں علم کو اسی دائرے میں محصور نہیں سمجھتی۔ میرے نزدیک علم کے حدود بہت وسیع ہیں اور اس کا دائرہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر نیا سورج نئی ضرورتیں لے کر طلوع ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی غور وفکر کی سمتیں قدرتی طور پر بدل جاتی ہیں۔ بوقلموں ایجادات وضروریات کے ساتھ لازمی طور پر بوقلموں علوم معرضِ ظہور میں آئیں گے، جن کی وجہ سوچ بچار کی نئی سے نئی راہیں کھلیں گی۔

ان کا کہنا ہے کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی علوم وفنون سے بہرہ مند ہونا چاہئے اور اپنے فہم وفکر کے زاویوں کو بدلنے کے لئے کوشاں ہونا چاہئے۔ عورت جتنی زیادہ علم وفضل کی مالک ہوگی، اس کے بچے اسی قدر علوم سے دلچسپی رکھیں گے۔ اگر عورت اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم رہے گی تو بچوں کے دل میں علم کی محبت جاگزیں نہیں ہوسکے گی۔ وہ خوش قسمت ماں ہے جو اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے سازگار ماحول پیدا کرتی اور خود معلّمہ کے فرائض انجام دیتی ہے۔

اسما بنت اسد اگر چہ فقہ امام ابوحنیفہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن دیگر ائمہ محدثین وفقہاء کی بھی دل سے قدر کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک متبع سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

امام شافعیؒ کی فقہ بدرجہ غایت واضح اور منقح ہے۔ وہ بہت بڑے فقیہ تھے اور ان

کی نظر مسائل کے تمام گوشوں کو گھیرے ہوئے تھی۔ نیکی، تقویٰ، فقاہت، حدیث اور اسلوب بیان واظہار میں امام شافعی سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ان امور کو واضح کیا ہے جو وقت کے ساتھ پوری ہم آہنگی رکھتے ہیں اور جن کو لائق اعتناء قرار دینا ضروری تھا۔

اسی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرمایا:

امام مالک اصحاب مدینہ کو خوب سمجھتے ہیں اور ان کے متعلق ان کی رائے بڑی صائب ہے۔ وہ تعاملِ اہل مدینہ کو خاص حیثیت دیتے ہیں اور ان کی یہ رائے بالکل صحیح ہے، کیونکہ مدینہ منورہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کا مسکن تھا۔ درحقیقت اسی بابرکت شہر سے اسلام کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس میں مسلمانوں نے بڑے بڑے معاملات سرانجام دیئے اور یہیں سے اسلام کی تبلیغ وترویج کے لئے راہیں ہموار ہوئیں، لہٰذا اگر امام مالک یا کوئی اور بزرگ تعاملِ اہلِ مدینہ کو فوقیت دیتے ہیں تو ان کا یہ موقف بالکل صحیح ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کی یہ رائے ہے کہ وہ ایک جلیل القدر امام ہیں۔ ان کا تعلق براہ راست رسول اللہ ﷺ کے فرامین وارشادات سے ہے اور وہ اس سے شدید وابستگی رکھتے ہیں۔ خلقِ قرآن کے سلسلے میں انھوں نے جو قربانیاں دیں وہ اسلام کی عظیم خدمت ہے۔ اپنی جان اور مال کو کلیۃً اسلام کے حوالے کر دینا کوئی آسان کام نہیں۔

ایک شخص نے ان سے سوال کیا۔

آپ امام ابوحنیفہ کی متبع ہیں؟

جی ہاں۔

لیکن آپ دوسرے علماء وفقہاء کی بھی تعریف کرتی ہیں۔

کیوں نہ کروں، کیا انھوں نے اسلام کی خدمت نہیں کی؟

یہ حضرات ایک دوسرے کے مخالف نہیں تھے؟

بالکل نہیں۔ یہ مسلمانوں کے سچے خادم۔ اسلام کے نہایت مخلص دوست اور اللہ کے برگزیدہ بندے تھے۔

سوال ہوا کیا ان کی تکریم سب پر فرض ہے؟

سب کے لئے ضروری ہے کہ ان کا اکرام کریں اور انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھیں۔

اسما اسلام کی ایک جلیل القدر بیٹی تھیں، بزرگان دین کی انتہائی تعظیم کرتی تھیں، اگر چہ ان کا شمار فقہاء اہل عراق میں ہوتا ہے، مگر تمام فقہی مسالک پر نظر رکھتی تھیں۔ ان کا انتقال ۲۵۰ھ میں ہوا۔

☆☆☆

بوران بنت حسن

وہ خاتون جس کی فراست اور عقل ودانش کا یہ عالم تھا کہ مامون امور مملکت میں اس سے مشورہ لیتا تھا اور یہ خاتون بہت سی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھاتی تھی۔

بوران بنت حسن ادب واخلاق کے اعتبار سے بلند ترین خاتون تھیں اور علم وفضل میں اس دور کی خواتین میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔ ان کا اصل نام خدیجہ تھا، بوران ان کا لقب تھا، انھوں نے اسی لقب سے شہرت پائی۔

یہ جس خاندان میں پیدا ہوئیں وہ حکومت وفرماں روائی، تدبیر وسیاست اور شجاعت وبسالت میں نہ صرف عرب میں بلکہ تمام اسلامی ممالک بلکہ کہنا چاہئے کہ پوری دنیا میں خاص شہرت کا مالک تھا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ فضل بن سہل اور حسن بن سہل دو بھائی تھے۔ فضل بن سہل عباسی خلیفہ مامون الرشید کا وزیر اور سلطنت عباسیہ کا مدارالمہام تھا اور عباسی خاندان میں اسے قدرومنزلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کی عقل وفراست اور بہادری سے متاثر ہوکر مامون الرشید نے اس کو ذوالریاستین کا لقب دے رکھا تھا یعنی فہم ودانش اور جرأت وجواں مردی میں یہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کا بھائی حسن بن سہل بھی بہت مدبر اور سیاست داں تھا اور اس کی سوچ بچار کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ ابتدا میں یہ مامون الرشید کی طرف سے دیوان الخراج کا نگراں اور منتظم اعلیٰ تھا۔ بعد میں اسے فضل بن حسن کی سفارش پر جبال، فارس، اہواز، بصرہ، کوفہ، حجاز، یمن اور بعض نومفتوحہ علاقوں کا حاکم مقرر کردیا گیا تھا۔ اس کا مرکزی مقام بغداد تھا، جہاں اس نے بہت بڑا دفتر قائم

کر رکھا تھا اور وہاں سے تمام علاقوں کا انتظام کرتا تھا۔

مامون الرشید اور امین الرشید کا سلطنت کے معاملے میں جب جھگڑا ہوا اور یہ جھگڑا شدت اختیار کر کے لڑائی اور باقاعدہ جنگ کی صورت میں بدلا تو ان دونوں بھائیوں نے امین کے مقابلے میں مامون کی مدد کی جو آخر کار امین کے قتل اور مامون کی کامیابی پر منتج ہوئی۔ اس جنگ کے بعد مامون کے دل ودماغ پر انھوں نے مزید تسلط قائم کر لیا اور سلطنت کے معاملات ان کی رائے اور مشورے سے طے ہونے لگے۔ اگرچہ خود مامون بھی بڑا ذی فہم اور صاحب عزم حکمراں تھا، تاہم ان کی رائے کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ مامون کی ملکی فتوحات اور نفاذ سلطنت میں ہر مقام پر انھیں خاص حیثیت حاصل تھی۔ بوران بنت حسن اسی خاندان کی فرد تھی اور عقل و دانش اور فہم و فراست کی دولت اسے ورثے میں ملی تھی۔

اب مامون الرشید اور اس کے عہد پر بھی ایک نظر ڈال لینا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ بوران بنت حسن اسی کی بیوی تھی۔

یہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید کا بیٹا تھا۔ اس کا اصل نام عبداللہ تھا، لیکن باپ نے اس کو مامون کا خطاب دیا۔ اس کی کنیت ابوالعباس تھی۔ یہ جمعہ کے روز ۱۵ ربیع الاول ۱۷۰ھ کو پیدا ہوا۔ اس کی ماں کا نام مراجل تھا جو مجوسی النسل ام ولد تھی۔ یہ نہایت ذہین شخص تھا۔ قرآن پاک کا حافظ اور متبحر عالم تھا۔ علماء کا قدردان تھا۔ فصاحتِ کلام اور برجستہ گوئی میں اسے کمال حاصل تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، کلام اور نحو وغیرہ علوم وفنون معروف اساتذہ سے پڑھے تھے۔ اپنے بھائی امین کے قتل کے بعد ۲۲ محرم ۱۹۸ھ کو مسندِ خلافت پر متمکن ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۷ برس تھی۔ فلسفہ اور دیگر یونانی علوم سے بھی اسے گہرا لگاؤ تھا۔ اس نے فلسفہ کی نشر و اشاعت اور کتب فلسفہ کو عربی میں منتقل کرانے

میں بڑی کوشش کی اور اس مقصد میں کامیاب ہوا۔تالیف و ترجمہ کے لئے اس نے ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا،جس کا نام بیت الحکمت رکھا اور اس اہم کام کی انجام دہی کے لئے اس میں بڑے بڑے اہلِ علم کی خدمات حاصل کیں۔اس نے ترجمے کے سلسلے میں ہندوستان سے بھی بعض ماہرینِ فن کو بلایا اور ان سے بہت علمی کام لیا۔خلافت و سلطنت کے زمانے میں فضل بن سہل اور حسن بن سہل اس کے بہت بڑے معاون تھے۔علوم وفنون کی توسیعِ اشاعت میں بھی انھوں نے اس کی مدد کی۔اس نے بیس سال حکومت کی مسند پر فائز رہنے کے بعد جمعرات کے روز ۱۸؍رجب ۲۱۸ھ کو انتقال کیا۔وفات کے وقت اس کی عمر ۴۸ برس تھی۔بڑا بارعب،صاحبِ عزم و ارادہ اور عالم و فاضل حکمراں تھا۔

بوران بنت حسن بن سہل صفر ۱۹۲ھ کو پیدا ہوئی۔عمر میں مامون الرشید سے بائیس سال چھوٹی تھی۔نہایت عقل مند اور زیرک خاتون تھی،جیسا کہ عرض کیا گیا جس خاندان سے تعلق رکھتی تھی وہ عقل و فہم میں ممتاز تھا۔

بوران کے والد حسن بن سہل اور چچا فضل بن سہل مامون پر خاص اثر و رسوخ رکھتے تھے اور کاروبارِ حکومت بہت حد تک انہی کے اشارے پر چلتا تھا۔حسن بن سہل نے مامون پر اپنی گرفت زیادہ مضبوط کرنے کے لئے مناسب سمجھا کہ بوران کا عقد مامون سے کردے،چنانچہ رمضان المبارک ۲۰۲ھ میں جب کہ بوران کی عمر دس گیارہ برس اور مامون کی چالیس برس تھی،اس کا نکاح کردیا گیا،مامون نے اس نکاح پر بہت مال و زر خرچ کیا۔بڑی دھوم دھام سے شادی کی اور لوگوں میں کثرت سے مال و دولت تقسیم کیا۔ وزراء کو خلعت،اعیانِ حکومت کو درہم و دینار عطا کئے،شعراء کو انعامات سے نوازا،غرباء ومساکین میں خوب دولت بانٹی،غرض اس شادی پر مامون نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا اور لوگوں کو بہت کچھ دیا۔

طبری نے لکھا ہے کہ اس شادی کے موقعہ پر مامون حسن بن سہل کے ہاں انیس روز قیام پذیر رہا اور حسن نے مہمانوں کے مقام ومرتبہ کے مطابق ان کی بہت خدمت کی۔ روزانہ مختلف قسم کے کھانے پکتے رہے اور مہمانوں کی تواضع کا سلسلہ جاری رہا۔

تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ انواع واقسام کے ماکولات ومشروبات پر حسن بن سہل نے پچاس ہزار درہم خرچ کیے۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ ۲۰۲ھ میں منگنی ہوئی تھی یا صرف نکاح ہوا تھا۔ شادی یا رخصتی ۲۱۰ھ میں ہوئی۔

شادی کی تقریب سے مامون جب واپس ہونے لگا تو اس نے عنان بن عباد کو حکم دیا کہ فارس کے مال سے حسن کو دس ہزار درہم دیئے جائیں اور ساتھ ہی فم الصلح عطا کیا جائے۔ "فم الصلح" واسط کے بالائی علاقے میں ایک قصبہ ہے، وہاں ایک نہر ہے جو دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے سے نکلتی اور اس علاقے کو سیراب کرتی ہے۔ یہ قصبہ بڑا سرسبز وشاداب تھا۔ جب یہ قصبہ حسن بن سہل کو دیا گیا تو حسن نے وہاں رہائش کے لئے شاندار محلات تعمیر کیے۔ مامون اپنی بیوی بوران کے ساتھ وہاں اکثر آتا اور کئی کئی روز قیام کرتا۔

بوران کی شادی میں بے شمار سرکردہ لوگوں اور مختلف علاقوں کے معززین کو باقاعدہ الگ الگ خط لکھ کر دعوت دی گئی تھی اور مدعوئیں کے نام اور ان لوگوں کے نام جنھوں نے بوران کو تحائف دیئے تھے، ایک رجسٹر میں لکھے گئے تھے۔ بنو ہاشم کو بھی بہت بڑی تعداد میں مدعو کیا گیا تھا۔

حسن بن سہل اور اس کا خاندان اہلِ بیت سے انتہائی محبت وعقیدت رکھتا تھا، خود مامون بھی اس خاندان کا گرویدہ تھا۔ بوران بنت حسن بھی اس خاندان کو انتہائی احترام کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اسی بنا پر بوران کو تمام طبقوں میں محترم گردانا جاتا تھا۔

بوران کی فراست اور عقل و دانش کا یہ عالم تھا کہ مامون امور مملکت میں اس سے باقاعدہ مشورے لیتا اور متعدد معاملوں میں اس کی رائے پر عمل کرتا تھا۔ بہت سی پیچیدہ گتھیوں کو یہ خاتون سلجھاتی اور مامون کی مدد کرتی تھی۔ مامون اس کے اس پہلو کا بہت مداح تھا اور اس سے متاثر تھا۔ بوران میں ایک خوبی یہ تھی کہ اتنی بڑی خاتون ہونے کے باوجود اس کا دل فخر و غرور سے خالی تھا۔ محلات میں رہنے اور ملکہ ہونے کے باوصف سادگی پسند اور نرم طبیعت تھی۔

شادی سے صرف آٹھ سال بعد ۱۸ رجب ۲۱۸ھ کو مامون الرشید نے وفات پائی۔ بوران کی عمر اس وقت چھبیس برس تھی۔ اس کے لئے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ اب وہ بغداد کے قصرِ مامون میں گوشہ نشین ہوگئی تھی۔ مامون کی وفات کے بعد ۵۴ سال زندہ رہی۔ ۸۰ برس عمر پا کر ۲۷۱ھ کو بغداد میں فوت ہوئی اور وہیں جامع السلطان کے قبے کے سامنے اسے دفن کیا گیا۔

جوہر براثیہ

وہ خداترس خاتون جس نے خلیفہ کی بھیجی ہوئی دس ہزار دینار کی تھیلی کو واپس کردیا تھا۔

''ابوعبداللہ قافلہ چل پڑا ہے، مسافت بہت دور کی ہے اور تم محوِ استرحت ہو۔ سفر طویل ہے اور سامانِ سفر نہ ہونے کے برابر۔ تم نے انجام سے نظر ہٹالی ہے اور فوائدِ عاجلہ کو اپنا مطمحِ نظر ٹھہرالیا ہے۔ غفلت کی نیند سے بیدار ہوجاؤ، آرام وراحت کو تیاگ دو اور امورِ خیر میں منہمک ہوجاؤ، تعجب ہے تم نے جرسِ کارواں نہیں سنا۔ اگر ذہن وفکر اور غور وتعمق کی نعمت سے عاری نہیں ہوگئے ہو تو آنکھیں کھول کر حالات کا جائزہ لو اور بصیرت وبصارت دونوں سے کام لو۔ حال کے جھروکوں سے ماضی کی طرف دیکھو۔ اس دنیا کی طرف دھیان کرو، اس میں کتنی قومیں آئیں، آباد ہوئیں اور چلی گئیں۔ بے شمار لوگ اس میں اپنے آثار چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے رختِ سفر باندھ گئے۔

''یہ کارگاہِ حیات آہستہ آہستہ ایک وسعت پذیر آثارِ قدیمہ کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔ اٹھو اپنے اعمال کا محاسبہ کرو، سونے والے سوتے ہی رہ جائیں گے اور جاگنے والے اپنی منزل پوری کرلیں گے۔''

یہ ہیں وہ الفاظ جو جوہر براثیہ نے ایک روز ہنگامِ سحر اپنے شوہر ابوعبداللہ کو نیند سے بیدار کرتے وقت کہے۔

جوہر براثیہ بغداد کی ایک عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں۔ ان کی زندگی بڑے عجیب

وغریب حالات میں بسر ہوئی اور یہ کئی مراحل سے گزر کر عبادت کی منزل پر پہنچیں۔ ان کی ولادت ۲۳۷ھ کو بغداد میں ہوئی۔ اس زمانے کا بغداد علم وفضل، ادب وانشاء اور زہد وتقویٰ کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ ابتدا میں یہ ایک عباسی خلیفہ کی کنیز تھیں اور نہایت ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتی تھیں اور انھیں وہ تمام آسائشیں حاصل تھیں، جن سے اس دور کی کنیزیں بہرہ ور تھیں۔ لیکن اچانک ان کی حیاتِ مستعار نے پلٹا کھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے زندگی نیکی کے قالب میں ڈھل گئی۔ ہوا یوں کہ ایک دن کہیں جارہی تھیں کہ ایک بزرگ پر نگاہ پڑی جو دنیا اور اس کے جاہ وجلال سے بے نیاز درسِ حدیث میں مصروف تھے اور ان کے سامنے شائقینِ علوم حدیث کثیر تعداد میں بیٹھے قال اللہ وقال الرسول کے نغمے الاپ رہے تھے۔ ان کے کانوں میں یہ اثر انگیز آواز پڑی تو قدم خود بخود رک گئے اور فرامینِ رسالت مآب سے مستفید ہونے لگیں۔ ایک طرف سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کانوں میں پڑا کہ امت میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے بہتر ہو۔

ساتھ ہی ایک اور آواز گونجی، دوسروں کے لئے بھی وہی کچھ پسند کرو جو اپنے لئے کرتے ہو۔

ایک اور آواز آئی ہمسایہ کا خیال رکھنا سب سے بڑی نیکی ہے۔

ساتھ ہی یہ حدیث پردۂ سماع سے ٹکرائی، والدین سے حسن سلوک، عمر اور رزق میں برکت وفراوانی کا باعث ہے۔

اب قدم آگے بڑھائے تو دیکھا بغداد کی جامع مسجد میں ایک محدث طلباء کو حدیث کا درس دے رہے ہیں اور طلباء کئی قطاروں میں بیٹھے احادیث لکھ رہے ہیں۔ حدیثِ رسول کی سماعت وکتابت کا یہ منظر اتنا جاذب اور پرکشش تھا کہ جوہر براثیہ نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسی کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا اور خدمتِ حدیث اور تقویٰ و

عبادت کو اپنا مستقل شعار قرار دے لیا۔ اس زمانے میں ابوعبداللہ براق ایک بہت بڑے محدث تھے اور مشہور محدث وفقیہ ابوجعفر کرینی کے استاذ تھے جو کہ شہرۂ آفاق عابد وزاہد جنید بغدادی کے معاصر تھے۔

جوہر براثیہ کے حالات اگرچہ مختصر الفاظ میں ''صفوۃ الصفوہ'' میں ابن جوزی نے اور ''تاریخ بغداد'' میں خطیب بغدادی نے قلم بند کئے ہیں، مگر نہایت دلچسپ اور اثر انگیز ہیں۔ ان میں سے چند واقعات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

جب یہ احادیث سن کر واپس گئیں تو دنیا بدلی ہوئی تھی اور طبیعت میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔ قصرِ خلافت میں داخل ہوئیں تو خاموشی سے جا کر بیٹھ گئیں۔ ایک دوسری کنیز نے اس خاموشی اور افسردگی کی وجہ پوچھی تو کہا:

''کوئی خاص بات نہیں''۔

''آخر اس طویل سکوت کی چادر کب اتارو گی''؟

''نہیں۔ میں نے سکوت کی چادر تو نہیں اوڑھ رکھی ہے، تم کوئی بات کرو تو جواب دوں گی''۔

''تم تو بہت باتیں کرنے کی عادی ہو، یکایک خاموشی کیوں اختیار کر لی ہے''؟

''باتوں میں کیا پڑا ہے۔ اپنے مفوضہ فرائض انجام دینے چاہئیں اور اللہ سے ڈرنا چاہئے''۔

''یہ اللہ کا خوف کب سے دامن گیر ہو گیا ہے''؟

''جب سے اس کی نظر کرم ہوئی ہے''۔

''کنیز کو خاموش تو نہیں رہنا چاہئے''۔

''میں اللہ کی کنیز ہوں اور اسی کے احکام کی اطاعت میرے فرائض میں داخل ہے''۔

''لیکن خلیفہ کو کیا جواب دو گی''؟

یہی جو تم کو دیا ہے''۔

رفتہ رفتہ بات خلیفہ تک پہنچی تو اس نے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے لئے یکسو ہو گئیں۔

ایک روز گھر میں مصروفِ عبادت تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو خلیفہ کا فرستادہ کھڑا تھا۔ اس نے جھک کر سلام کیا اور کوئی بوجھل سی چیز پیش خدمت کی۔ فرمایا:

یہ کیا ہے؟

کہا: امیر المومنین نے دس ہزار دینار کی تھیلی بھیجی ہے۔

بولیں: میں ان دیناروں کا کیا کروں گی؟

مجھے معلوم نہیں، میں نے امیر المومنین کے حکم کی تعمیل کی ہے۔

اصل حکم تو اللہ کا ہے، نہ کہ امیر المومنین کا۔

اچھا آپ اسے رکھ لیجئے اور مجھے اجازت دیجئے۔

نہیں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں، واپس لے جاؤ۔ درہم و دینار عارضی اور ناپائیدار چیز ہیں۔ ان کی موجودگی دل میں تکبر اور ذہن میں رعونت پیدا کرتی ہے اور میں اس سے دامن چھڑا چکی ہوں۔

ملازم تھیلی لے کر واپس چلا گیا اور سارا واقعہ خلیفہ کو سنایا۔ خلیفہ نے اس میں دس ہزار دینار کا اضافہ کیا اور کہا میری طرف سے جوہر سے کہنا کہ اسے رکھ لو اور غرباء و مساکین میں تقسیم کر دو۔ مگر انھوں نے اس سے بھی انکار کر دیا اور کہا امیر المومنین کے پاس مستحقین کی فہرست ہونی چاہئے اور خود اپنے ہاتھ سے انھیں تقسیم کرنا چاہئے۔ میں ایک تارک

الدنیا اور گوشہ نشین عورت ہوں۔ مجھے کیا معلوم مستحق کون ہے اور غیر مستحق کون۔ مبادا تقسیم میں مجھ سے غلطی ہو جائے اور میں اللہ کے نزدیک قابل گرفتِ قرار پاؤں۔

ایک روز والی بغداد کی بیوی آئیں اور حصولِ برکت کے لئے اپنے گھر تشریف لے جانے کی درخواست کی۔

فرمایا: میں تو ایک سیدھی سادی عورت ہوں، جس نے امراء سے تعلقات منقطع کر کے ایک چھوٹی سی جھونپڑی کو اپنا مسکن بنالیا ہے۔ آپ بلند وبالا محلوں میں سکونت پذیر ہیں۔ نہ میں آپ کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہوں نہ نقصان۔ آپ مجھ سے کسی قسم کی توقع نہ رکھیں اور اپنا کام کریں۔ میری دنیا یہی غریب و بے کس لوگ ہیں، جو میرے اردگرد بیٹھے ہیں۔ میں انھیں چھوڑ کر کہیں جانا پسند نہیں کرتی۔ غریب کی مجلس میں جو اطمینانِ قلب حاصل ہے، وہ امیر کی محفل میں کہاں؟

ایک مرتبہ امیر المومنین نے پیغام بھیجا کہ قصر خلافت میں تشریف لا کر شکریے کا موقع دیجئے۔

جواب دیا: قصر خلافت اور غربت دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ میں آپ کے ہاں آ کر آپ کے عیش و راحت کو مکدر نہیں کرنا چاہتی۔ آپ مجھے اپنے ہاں بلا کر میری محدود دنیا میں مداخلت نہ فرمائیں۔

ان کی شادی ابوعبداللہ براثی سے ہوئی جو انہی کی طرح عابد و زاہد اور محدث وفقیہ تھے۔ اس نیک بخت خاتون نے ساٹھ برس عمر پا کر ۲۹۷ھ میں وفات پائی۔

☆☆☆

خدیجہ بنت محمد بغدادی

وہ واعظہ جن کی تلاوت قرآن سے مجمع پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔

حضرت خدیجہ بنت محمد بن علی شاہ جہانی بغداد کی رہنے والی تھیں۔ ان کے حالات خطیب بغدادی نے ''تاریخ بغداد'' میں، ابن جوزی نے ''المنتظم'' میں، ابن سمعون الواعظ نے ''امالی'' میں، صغدی نے ''الوافی بالوفیات'' میں، ابن العماد نے ''شذرات الذہب'' میں اور ابن تغری نے ''النجوم الزاہرہ'' میں بیان کئے ہیں۔

خدیجہ ۳۷۶ھ کو بغداد میں پیدا ہوئیں۔ اس زمانے میں بغداد میں خلیفہ طائع للہ حکمراں تھا جس کا پورا نام ابوبکر عبدالکریم طائع للہ بن مطیع للہ تھا۔ سیاسی اعتبار سے یہ سخت فتنے کا زمانہ تھا اور بغداد کی حکومت کا نظم وضبط اور استحکام ختم ہو گیا تھا۔ خلفاء پر ترکوں کا غلبہ تھا اور غیر عربی اثرات پوری حکومت کا نظم وضبط اور استحکام ختم ہو گیا تھا۔ خلفا پر ترکوں کا غلبہ تھا اور غیر عربی اثرات پوری حکومت کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھے۔ اسلامی احکام اور ان کی نشر واشاعت کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور لوگ ذہنی اور عملی لحاظ سے اسلام سے دور ہوتے جارہے تھے۔ انفرادی طور سے البتہ کچھ لوگوں نے اپنی اپنی جگہ تبلیغِ اسلام اور نیکی کی اشاعت وترویج کی مہم شروع کر رکھی تھی۔ یہ لوگ اگرچہ محدود تعداد میں تھے، مگر نہایت سرگرم اور اپنے مقاصد کی تبلیغ میں انتہائی تیز تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ عورتیں عورتوں میں جا کر تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دیتیں اور مرد مردوں کے مجمعوں میں جاتے۔ یہ لوگ اخلاص کے پیکر اور اخلاق وکردار کے بے مثال نمونے تھے۔ ان کی زبان میں اثر تھا اور عملی حالت اونچی تھی، اسی پاک باز جماعت میں حضرت خدیجہ بنت محمد شامل تھیں جو خدیجہ واعظہ کے نام سے مشہور تھیں۔

خدیجہ کی تعلیم بہت اچھے طریقے سے ہوئی تھی۔ ان کے والد محمد بن علی نے جہاں ان کی تعلیم کی طرف توجہ مبذول کی، وہاں ان کی تربیت کا بھی خاص خیال رکھا۔ اس دور کے بغداد میں ابوالحسین بن سمعون الواعظ ایک مشہور واعظ اور عالم تھے۔ محمد بن علی نے اپنی اس بیٹی کو ان سے تعلیم دلائی۔ خدیجہ نے اپنے اس استاد کے امالی کی جزو ثانی روایت کی اور اسے اپنے ہاتھ سے ضبط تحریر میں لائیں۔ ان امالی کو جو خدیجہ کے ہاتھ کی کتابت شدہ ہے، محدثین وفقہاء اور واعظین کی ایک جماعت نے اپنے اپنے خط میں لکھا اور اس کی نقلیں کیں۔

شیخ ابوالحسین بن سمعون الواعظ کے مواعظ ونصائح بہت مشہور ہیں۔ کہتے ہیں یہ اس زمانے کے بہت بڑے واعظ تھے اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ ان کے وعظوں میں شریک ہوتے تھے۔ جب یہ وعظ کے لئے کھڑے ہوتے تو مجمع ہمہ تن متوجہ ہو جاتا۔ خطبۂ مسنونہ پڑھتے تو لوگ جھوم جھوم جاتے اور جب ان کو مخاطب کرتے ہوئے یاایھا الناس (اے لوگو) کا لفظ زبان سے نکالتے تو یہ الفاظ اس درجہ اثر کرتا کہ سنتے ہی لوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔

ان کے وعظ کی بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے وعظ کو قرآن کی آیات، رسول اللہ ﷺ کی احادیث، صحابہ کے آثار واقوال اور ائمۂ دین کے ارشادات وفرمودات سے مزین فرماتے۔ قرآن کی تلاوت کرتے تو مجمع پر وجد کا سا عالم طاری ہو جاتا اور فرط اثر سے لوگ تڑپ تڑپ جاتے۔ لوگوں کو یہ ماضی کے واقعات اس لہجے سے سناتے کہ لوگ اس سے سخت متعجب بھی ہوتے اور انتہائی متاثر بھی۔ پھر ان واقعات میں باقاعدہ تاریخی تسلسل قائم رکھتے اور ہر بات باندازِ نصیحت بیان فرماتے۔ حضرت خدیجہ بنت محمد بن علی اپنے اس رفیع المرتبت استاد سے بہ درجہ غایت متاثر تھیں۔

خود خدیجہ بنت محمد بھی باقاعدہ درس دیتی تھیں اور ان کے شاگردوں کا حلقہ بڑا

وسیع تھا۔جن میں اس دور کے مشہور محدث ابوبکر اور بدر کرخی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔انھوں نے ان سے شیخ ابوالحسین بن سمعون الواعظ کی امالی بھی روایت کیں۔ان کے علاوہ ان کے شاگردوں میں ابوغالب احمد بن حسن بن النبا کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔انھوں نے بھی ان سے امالی ابی الحسین روایت کی۔

خدیجہ کے وعظوں کے چند اقتباسات ان کے سوانح نگاروں نے نقل کیے ہیں۔ایک مرتبہ خاندانِ خلافت کی خواتین کی طرف سے کچھ خواتین ان کے پاس آئیں اور محل سرا میں تشریف لے جانے کی التجا کی،مگر انھوں نے انکار کر دیا اور فرمایا میں ایک معمولی عورت ہوں اور معمولی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔میں ان آداب سے واقف نہیں ہوں جن کا شاہی محلات میں بجالانا ضروری ہے۔میں آپ لوگوں سے طرز خطاب کے طریقوں سے بھی واقف نہیں ہوں،لہٰذا مجھے معاف فرمایا جائے۔میں شاہی محل میں جانے اور شاہی خاندان کی خواتین سے ملنے سے معذرت خواہ ہوں۔لیکن وہ عورتیں مصر تھیں کہ آپ ضرور محل سرا میں جائیں اور وہاں جا کر وعظ ارشاد فرمائیں۔آخر انھیں مجبوراً وہاں جانا پڑا۔محل سرا میں پہنچیں تو تمام خواتین احتراماً کھڑی ہو گئیں اور سب نے جھک کر سلام کیا۔یہ تھوڑی دیر بیٹھیں،خیر خیریت دریافت کی اور وعظ وارشاد فرمایا جس کے چند جملے یہ ہیں۔

اے گروہ خواتین!تم اونچے خاندان سے تعلق رکھتی ہو اور شاہی خاندان سے وابستہ ہو،میں ایک مسکین ونادار عورت ہوں،دینوی لحاظ سے میرا تمھارا کوئی مقابلہ نہیں، لیکن میری دلی خواہش ہے اور اللہ سے دعا ہے کہ جس طرح تم دینوی اعتبار سے بلند مرتبے کی حامل ہو،اسی طرح دینی اعتبار سے بھی تمھارا مقام بلند ہو۔تم یہ نہ دیکھو کہ تم دنیوی جاہ وجلال کی مالک اور اصحاب عزوجاہ ہو،اصل دیکھنے کی شے یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک تمھارا کیا مرتبہ ہے اور نیکی میں تم کس مقام پر فائز ہو۔اگر تم نیک ہو،مستحقین کا

خیال رکھتی ہو، حقوق اللہ ادا کرتی ہو، حقوق العباد پورے کرتی ہو، کسی کو نشانہ ظلم نہیں بناتی، حلال وحرام میں امتیاز کرتی ہو، جائز وناجائز میں خط امتیاز کھینچتی ہو اور علوم دینی کی ترویج وتوسیع کا اہتمام کرتی ہو تو تم دنیا میں بھی کامیاب ہو اور آخرت میں بھی۔ اگر خدانخواستہ ان اوصاف سے محروم ہو تو تم اللہ کے دربار میں جواب دہ ہوگی اور ان نعمتوں کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا جن سے تم کو نوازا جاتا ہے۔

ایک موقع پر عورتوں کی جماعت میں وعظ کرتے ہوئے کہا: بہنو! میں تمہاری خیر خواہ اور ہمدرد ہوں، کیونکہ درحقیقت مسلمان وہ ہے جو دوسرے مسلمان کا بہی خواہ اور ہمدرد ہے اور اس کی سلامتی اور عافیت کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ میں تمھیں نصیحت کرتی ہوں کہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی تابع فرمان بن کر رہو، اللہ سے ڈرو، اس کے سوا کسی کے سامنے گردن نہ جھکاؤ اور نہ اپنی ضروریات کسی اور سے طلب کرو، وہی تمھارا مالک، وہی رازق، وہی کالق اور وہی سب کا معاون وناصر ہے۔ اسے چھوڑ کر کسی کے دروازے پر دستک نہ دو، یہ مال ودولت اور یہ جاہ وجلال سب عارضی اور زوال پذیر ہے اور دنیا ہی میں رہ جانے والا ہے۔ تمھارے ساتھ صرف نیک اعمال جائیں گے۔ اگر تم اخروی کامیابی کی خواہاں ہو تو اعمال خیر کی طرف دوڑو اور اللہ کا تقوی اختیار کرو۔

ایک اور موقع پر فرمایا: جو لوگ دنیا کے گرویدہ ہوگئے ہیں اور آخرت پر دنیا کو ترجیح دیتے ہیں، وہ ناکام وخاسر ہیں۔ اے دنیا کی دولت سمیٹنے والو! اور لوگوں کو تنگ کر کے مال وزر جمع کرنے والو! تمہاری ایک ایک حرکت اللہ کے علم میں ہے اور وہ تمھاری فطرت کو خوب جانتا ہے۔ دنیا میں گھٹیا فطرت کا مظاہرہ نہ کرو اور دنیا کے حصول کی خاطر کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ ایسی دنیا جو ظلم وجور سے حاصل کی گئی ہے، مردار سے بھی بدتر ہے۔ کیا تم مردار کھانا پسند کروگے؟ یقیناً نہیں کروگے۔ اگر واقعی یہی بات ہے تو پھر کسی پر ظلم کیوں کرتے ہو؟ اور حصول دنیا کے لئے آخرت کو کیوں خراب کرتے ہو؟ اپنے

قدموں کو روکو، خود کو برائی کے گڑھے میں نہ پھینکو۔

خدیجہ نہایت اونچے ذہن اور بلند فکر کی حامل تھیں اور بہت بڑی واعظہ تھیں۔ انھیں دنیا کے مال و دولت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ درویش صفت خاتون تھیں جو ہر وقت لوگوں کو نصیحت کرتی رہتی تھیں۔

ان کی وفات ۱۳ محرم ۴۶۰ھ میں ہوئی۔ ۸۴ برس عمر پا کر داعی اجل کو لبیک کہا۔

☆☆☆

جروہ بنت مرہ تمیمی

حاضر جوابی میں عدیم المثال خاتون۔ جنھوں نے یاد خدا کو اپنا شعار بنالیا تھا۔

حضرت جروہ بنت مرہ بن غالب تمیمی بلند حوصلہ اور بے خوف خاتون تھیں، فصاحت و بلاغت میں یکتا، ادب و شعر میں بے نظیر اور حاضر جوابی میں عدیم المثال تھیں۔ قبائل عرب کے تمام پہلوؤں پر عمیق نظر رکھتی تھیں اور ان کی عادات واطوار سے پوری طرح آگاہ تھیں۔ طیفور نے ''بلاغات النساء'' میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی زندگی کے بعض گوشوں کو نمایاں کیا ہے۔

جروہ بنت مرہ تمیمی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں پیدا ہوئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت، ملوکیت کے قالب میں ڈھل چکی تھی اور مسلمانوں پر ظاہری طمطراق اور ٹھاٹھ باٹھ نے قبضہ کرلیا تھا۔ پرانی قبائلی عصبیتیں جو اسلامی تعلیمات کی وجہ سے ماند پڑگئی تھیں، پھر سے سر اٹھارہی تھیں اور مسلمان ایک دوسرے سے دست وگریباں تھے۔ لیکن اس دور کے بعض لوگ اس چیز سے انتہائی نفور تھے اور وہ ان علائق سے کنارہ کش ہوکر اللہ کی یاد میں محو ہوگئے تھے۔ حضرت جروہ بھی انھی خوش بخت لوگوں میں سے تھیں، جنھوں نے یاد خدا کو اپنا شعار بنالیا تھا اور ذکر الٰہی میں اپنی ذات کو غرق کرلیا تھا۔

ان پر اللہ کی خشیت کا اس درجے غلبہ تھا کہ ایک مرتبہ نماز میں اچانک رونے لگیں اور روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ نماز سے فارغ ہوئیں تو کسی نے رونے کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگیں مجھے یوں معلوم ہورہا تھا کہ جنت اور دوزخ میرے سامنے آگئے ہیں اور میں سخت پریشانی کے عالم میں گھر گئی ہوں۔ یہ بات کرہی رہی تھیں کہ پھر بے ہوش ہوگئیں اور انھیں بڑی مشکل سے ہوش میں لایا گیا۔ فرمایا کرتیں جس دل میں اللہ کا ڈر

نہیں ہے وہ انسان کا دل نہیں ہوسکتا۔انسانیت اور خوف خدا دونوں لازم وملزوم ہیں۔ مصیبت سے بچنے کی صورت صرف اللہ کا ڈر ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا: آؤ اللہ سے خشیت کا عہد کریں اور یہ فیصلہ کریں کہ کسی کو زبان اور ہاتھ سے کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔ جو لوگ اللہ کی نافرمانی کے مرتکب ہوتے ہیں، ان کا مقاطعہ کریں گے اور خود کو اللہ کی عبادت کے لئے وقف کردیں گے۔

قرآن مجید کی تلاوت کثرت سے کرتیں۔جن آیات میں اللہ کے خوف اور وعید کا ذکر ہے، ان کی تکرار کرتیں۔ان کا تلاوتِ قرآن کا انداز یہ نہ تھا کہ ابتداء قرآن سے سلسلۂ تلاوت چلایا جائے بلکہ ان کا طریق یہ تھا کہ قرآن مجید کھولتیں اور جو آیات سامنے آتیں پڑھنا شروع کردیتیں۔اگر کوئی قریب ہوتا تو اسے بھی ان آیات کے معانی سے آگاہ فرماتیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتیں۔

علاوہ ازیں فصاحت وبلاغت میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔قبائل عرب کی خصوصیات وعادات سے بہت باخبر تھیں۔جب ان کا تذکرہ کرتیں تو ایسے الفاظ سے ان کا تعارف کراتیں کہ ان کی خصوصیات نمایاں ہوکر سامنے آجاتیں۔ جو لوگ ان قبائل سے آگاہ تھے، وہ ان کے تعارفی الفاظ سے لطف اندوز ہوتے۔اپنے قبیلے کے بارے میں بالخصوص محتاط الفاظ استعمال کرتیں اور کلام میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی کا اظہار نہ فرماتیں۔

جروہ بنت مرہ مکہ مکرمہ کی رہنے والی تھیں۔ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مکہ گئے تو ان کی صالحیت اور فصاحت وبلاغت کی بات ان کے کانوں میں پہنچی۔ حضرت معاویہ نے انھیں بلایا۔یہ ایک لمبی چادر اوڑھے ہوئے باپردہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔حضرت معاویہ نے ان کے قبیلے اور خاندان کے بارے میں سوال کیا۔ کہنے لگیں۔

میری قوم تعداد کے اعتبار سے لوگوں سے بہت زیادہ ہے، ان کی آبادیاں دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور طمع وحرص سے بہت دور ہیں۔ یہ لوگ خالص اور سرخ سونے کی مانند ہیں اور حسب کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتے ہیں۔

حضرت معاویہ نے کہا: تم نے بالکل ٹھیک کہا، تمھاری قوم واقعی انھی اوصاف کی حامل ہے۔ ذرا ان کی تمام شاخوں کی خصوصیات الگ الگ بیان کرو۔

کہا: ان کی شاخ بنوعمرو بن تمیم کا یہ حال ہے کہ وہ مصائب سے دوچار ہوئے، بے شمار لوگوں سے ان کا تصادم ہوا، وہ بارہا میدان جنگ میں اترے اور انھیں انتہائی سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن وہ کبھی دشمن کے مقابلے میں میدان وغی سے ذلیل ہوکر واپس نہیں ہوئے۔ انھیں حریف کبھی مطیع نہیں کرسکا۔ ان کے نیزے اور تلواریں ہمیشہ دشمن کے سروں پر منڈلاتے رہے اور ان پر ان کا رعب چھایا رہا۔

فرمایا: تم نے سچ کہا اور بالکل صحیح کہا۔ اب اپنے قبیلے کی دوسری شاخ کے بارے میں بتاؤ۔

بولیں: بنوسعد بن زید تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ ہیں، نسب کے لحاظ سے انتہائی پاکیزہ ہیں، اگر غصے میں آجائیں تو نہایت اذیت ناک ثابت ہوتے ہیں اور اگر مدد کے لئے پکارے جائیں تو تیزی کے ساتھ پہنچتے ہیں۔ ان کے شب و روز تیغ وسناں کی رفاقت میں گزرتے ہیں، لڑائی ان کا پیشہ اور بہادری ان کا شیوہ ہے۔

اب آیئے بنوحنظلہ کی طرف۔ ان کا معاملہ یہ ہے کہ یہ لوگ بلند مکانوں میں رہتے ہیں، اونچی حیثیت کے مالک ہیں، لوگوں میں عزت واکرام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ہمسائے کی تکریم کرتے ہیں، دشمن کے لیے سخت گیر ہیں، مظلوم کی مدد کرنا فرض سمجھتے ہیں اور وعدہ پورا کرتے ہیں۔ دوست کے سچے دوست اور دشمن کے شدید دشمن ہیں۔

معاویہ نے کہا: بنو حنظلہ ایسے درخت کی مانند ہیں جس کی شاخیں پھیل کر لوگوں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتی ہیں۔

بولیں: امیر المومنین! ان پر یہی مثال صادق آتی ہے۔ آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا۔

اب بنو براجم کے سنیے! یہ لوگ یک مشت ہیں، مخالفین کے مقابلے میں ان کی انگلیاں مجتمع ہیں اور ہتھیلیاں ایک دوسری سے پیوست ہیں۔

بولے: تم نے ٹھیک کہا۔

بنو ربیعہ کا یہ حال ہے کہ وہ پتھر کی طرح سخت اور سانپ کی طرح زہریلے ہیں، غیروں کے ساتھ لڑتے اور اپنے قبیلے پر فخر کرتے ہیں۔

فرمایا: بالکل صحیح ہے۔

کہا: بنو یربوع نیزے لہراتے ہوئے گھوڑوں پر سوار رہتے ہیں، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے ساتھیوں کو دشمن کی دست برد سے محفوظ رکھتے اور ان کی ہر ممکن امداد کرتے ہیں، اور دشمن کے سواروں پر ایک دم ٹوٹ پڑتے ہیں۔

اس طرح وہ اپنے قبیلے سے تعلق رکھنے والی تمام شاخوں کے اوصاف بیان کرتی رہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کی تصدیق کرتے رہے۔ آخر میں کہنے لگے تمھاری معلومات کا سلسلہ بہت وسیع ہے اور قبائل عرب کے بارے میں تم نے جو کچھ کہا بالکل صحیح ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ علی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟

بے ساختہ بولیں: اللہ نے ان کو بے حد شرف سے نوازا ہے، ان کے فکر و فہم کی حدود انتہائی وسیع ہیں، وہ اللہ کے مقدس ترین بندے ہیں، پھر گرج کر بولیں۔

امیر المومنین میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ علی اس دنیا کے بہترین انسان تھے۔ اخلاص اور شجاعت میں کوئی ان کا حریف نہ تھا اور کسی میں یہ جرأت نہیں کہ تقوی

وتدین کے کسی پہلو میں بھی ان سے برابری کا دعویٰ کرسکے۔

امیر معاویہ نے کہا: تمہاری تمام باتیں سچ ہیں اور تم ہر معاملے میں صادق ہو۔ حضرت علی کے بارے میں بھی تم نے صحیح کہا۔

جب وہ بات ختم کر چکیں تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو عمدہ ترین لباس عطا کیا اور دس ہزار درہم کے عطیے سے نوازا۔

☆☆☆

امۃ الحبیب

وہ خاتون جس نے تیمور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور آہنی خود سر سے اتار کر دلیرانہ جواب دیا تھا۔

ترکی کی عثمانیہ سلطنت کا حکمراں بایزید یلدرم نہایت جری اور بہادر شخص تھا۔ اس کی فوجوں کے جرنیل کا نام سلطان یزدانی تھا۔ وہ ایرانی نسل تھا۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس کا سلسلۂ نسب کیخسرو سے ملتا ہے اور بعض مورخین اسے ایران کے کاؤس خاندان سے وابستہ کرتے ہیں۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عربوں نے جب ایران کی طرف رخ کیا تو بے شمار خاندان حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے اور لاتعداد بلاد وقصبات کے لوگوں نے اسلام کی حقانیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا، لیکن سلطان یزدانی جس علاقے اور خاندان سے متعلق تھا، وہ اسلام کی روشنی سے محروم تھا۔ یہ شخص مجوسی مذہب کا حامل اور آتش پرست تھا اور زرتشتیوں کی مذہبی کتب وساتیر کی صداقت پر یقین رکھتا تھا، لیکن اس میں یہ خوبی تھی کہ اس کا دل تعصبات سے خالی اور ضمیر مذہبی عناد سے دور تھا۔ یہ مسلمانوں کی تبلیغی مجلسوں اور ان کی دینی محفلوں میں بھی شریک ہوتا تھا اور اس کے احکام وتعلیمات کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مسلمان ہو گیا اور اپنے قدیم مذہب کو ترک کر دیا۔ اس کے قبولِ اسلام کے بعد اس کی بیوی بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئی۔

امۃ الحبیب اس کی پیاری بیٹی تھی اور بڑی زیرک اور سمجھدار تھی۔ جب اس کے والدین نے اسلام قبول کیا تو اس وقت اس کی عمر گیارہ برس تھی۔ یہ اگرچہ کم سن تھی مگر فہر

وفراست کی دولت سے بہرور تھی۔اس نے ماں باپ سے متاثر ہوکر اسلام قبول نہ کیا بلکہ اس مسئلے پر برابر غور کرتی رہی۔دو سال حالتِ غور وفکر میں گزار دیئے، مشفق والدین بیٹی کی پریشانی اور تذبذب کو گہری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ایک روز دونوں میاں بیوی نے بیٹی کو بلایا اور شفقت بھرے لہجے میں کہا بیٹی ہمیں معلوم ہے تم ہماری وجہ سے بہت پریشان اور متفکر رہتی ہو، ہم کسی جبر کے قائل نہیں اور نہ اسلام جبر کی اجازت دیتا ہے، ہمیں اسلام کی تعلیمات پسند آئیں، ہم نے اسے بطیب خاطر بغیر کسی جبر واکراہ اور خارجی اثرات کے قبول کرلیا۔ہم نے آج تک اس موضوع سے متعلق نہ تمہیں کچھ کہا، نہ آئندہ کہیں گے۔ہمارے قبولِ اسلام پر دو سال گزر چکے ہیں اور ہم اپنے اس عمل پر خوش ہیں، ہمارا قلب مطمئن ہے۔تم اگر اس سلسلے میں ہمارا ساتھ نہیں دینا چاہتی تو بے شک نہ دو، ہم قطعاً تمہیں مجبور نہیں کریں گے۔مگر تم خوشی سے رہو، تمہیں وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو ایک بیٹی کو حاصل ہونے چاہئے۔

والدین کی اس تقریر سے امۃ الحبیب بہت متاثر ہوئی۔ان کی اجازت سے اسلام کے بارے میں اس نے چند باتیں دریافت کیں اور وہ باتیں سمجھنے کے بعد مسلمان ہوگئی۔اس وقت اس کی عمر تیرہ برس تھی۔

امۃ الحبیب کو والدین نے بہترین طریق سے تعلیم دلائی۔اس کا والد سلطان یزدانی اسے مردانہ لباس پہنایا کرتا تھا، اس نے لڑکوں کی طرح اس کی تربیت کی اور سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنایا۔پہلے اس کو گھڑ سواری سکھائی، پھر فن تیر اندازی میں پختہ کیا اور سپاہ گری کے اصولوں سے آگاہ کیا، یہاں تک کہ اس میں بہادری کے جوہر پیدا ہوگئے اور اس میں اعلیٰ درجے کا فوجی افسر بننے کی صلاحیتیں ابھر آئیں۔چونکہ اس کو امراء وشرفاء کی مجلسوں میں رہنے کے مواقع میسر تھے، اس لئے اس میں وہ اخلاق وعادات بھی پیدا ہوگئے جو ملوک وخلفاء اور امراء ووزراء کے لئے مخصوص ہیں۔اس کو خود خلیفہ بایزید یلدرم

کے محل میں آمد ورفت کی سہولتیں بھی حاصل تھیں۔ اور اس کی اولاد سے بھی مراسم تھے، لہٰذا اس میں قدرتاً وہ اونچے آداب واوصاف پیدا ہو گئے تھے جن سے خلفاء کی اولاد متصف ہوتی تھی۔

امۃ الحبیب کو مدرسہ سلطانیہ حربیہ میں داخل کرادیا گیا تا کہ فن حرب کے مختلف شعبوں پر عبور حاصل کرلے۔ اس مدرسے میں یہ سولہ مہینے رہی اور حرب وجنگ کے مروجہ قواعد میں اس درجہ ماہر ہوگئی کہ تمام رفقاء مدرسہ سے آگے بڑھ گئی۔ اس دوران میں مختلف شہزادوں اور سرکردہ افراد کی طرف سے نکاح کے پیغام آئے، مگر امۃ الحبیب نے رد کردئے، کیونکہ اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوگئی تھی کہ نکاح کے بعد عورت کی آزادی سلب ہوجاتی ہے اور وہ شوہر کی تابع فرمان ہوکر رہ جاتی ہے، اس کی سرگرمیاں ختم ہوجاتی ہیں اور اسے صرف ایک ہی شخص کے حکم کی پابندی کرنے پر مجبور کردیا جاتا ہے۔ پھر اسے یہ بھی خیال تھا کہ بعض لڑکیوں کے شوہر انتہائی بداخلاق اور بداطوار ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے ان کی زندگی کی مسرتیں ختم ہوجاتی ہیں۔ امۃ الحبیب کی شادی کے بارے میں خود اس کا باپ سلطان یزدانی بھی خاموش تھا اور وہ بیٹی کی مرضی کے سوا کوئی قدم اٹھانے کے لئے تیار نہ تھا۔

جب امۃ الحبیب کی عمر انیس برس کو پہنچی تو یزدانی بایزید کی فوج کے سیاہ وسپید کا مالک ہو چکا تھا اور ترکی کے عثمانی خلیفہ کو فوج کے ایرانی نسل حاکم اعلیٰ پر کامل اعتماد تھا۔ اسے یقین تھا کہ فوج کے سلسلے میں یزدانی جو قدم بھی اٹھائے گا وہ ملک وفوج کی بہتری کا ضامن ہوگا۔ امۃ الحبیب بھی فوجی معاملات میں باپ کی معاون تھی اور باقاعدہ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہو چکی تھی۔ خلیفہ کو بھی اس کا علم تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ مردانہ لباس میں رہتی ہے اور فوج کے اصول وقواعد اور ضوابط سے آگاہی رکھتی ہے۔ بایزید اس کی فوجی اور فنی صلاحیتوں کا لوہا مانتے اور اہم امور میں اس سے بالمشافہ مشورہ

کرنے پر مجبور ہو گیا۔

بایزید کا یہ معمول تھا کہ جب فوج کو کسی بڑی جنگی مہم پر روانہ کرتا یا اپنی فوج کے درمیان مصنوعی جنگوں کا اہتمام کرتا تو امۃ الحبیب کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دیتا۔ وہ باقاعدہ مرد سپاہیوں کے ساتھ مردانہ لباس میں آتی اور معرکۂ کارزار میں شریک ہوتی۔ بایزید خوش ہو کر جن فوجیوں کو انعام واکرام سے نوازتا ان میں امۃ الحبیب کا نام سرفہرست ہوتا۔ اسی اثناء میں بایزید کو امیر تیمور کے ساتھ معرکہ آرا ہونا پڑا۔ بایزید نہایت بہادر حکمراں تھا۔ اس کی فتوحات کا دائرہ بہت دور تک پھیل گیا تھا۔ وہ کسی مسلمان کے ساتھ نبرد آزما نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ تیمور سے تصادم نہ ہو لیکن تیمور نے ایک نہ مانی اور مقابلے پر اتر آیا۔ مجبوراً بایزید کو تمام مہمات چھوڑ کر اس کے مقابلے پر آنا پڑا اور بایزید کی جو فوج تیمور کے مقابلے پر آئی اس میں امۃ الحبیب بھی شامل تھی۔ تیمور اور بایزید کی جنگ کا قصہ طویل بھی ہے اور دردناک بھی، کیونکہ یہ اس وقت کی دنیا کے دو عظیم مسلمان بہادروں کا باہمی مقابلہ تھا۔ لیکن ہمیں اس کی تفصیلات سے تعلق نہیں۔ ہمیں دلچسپی صرف اس کردار سے ہے جو اس وقت امۃ الحبیب نے ادا کیا۔ اسی کردار کے نتیجے میں اس نے زندگی کا نیا موڑ کاٹا۔ وہ تیمور کے نکاح میں آئی اور امۃ الحبیب کے بجائے حمیدہ بانو بیگم کہلائی۔ اس وقت وہ زندگی کی چوبیس بہاریں دیکھ چکی تھی۔

تیمور اور بایزید کے درمیان خوں ریز جنگ جاری تھی۔ بہادری وشجاعت کے دو پہاڑ آمنے سامنے کھڑے تھے۔ بایزید یلدرم شکست کے لفظ سے ناآشنا تھا، مگر یہ اولین موقع تھا کہ بایزید کو تیمور کی خون خوار تلوار کے سامنے جھکنا پڑا اور تاریخ میں پہلی مرتبہ چشمِ آسمان نے اس کو شکست سے آشنا ہوتے دیکھا۔ بایزید کے بہت سے فوجی یا تو مارے گئے یا گرفتار کر لئے گئے۔ گرفتار شدہ فوجیوں میں چوبیس سالہ امۃ الحبیب بھی تھی۔

تیمور کی عادت تھی کہ وہ جنگ کے خاتمے پر فریق مخالف کے گرفتار لوگوں کو حاضر ہونے کا حکم دیتا۔ ان میں معذوروں اور زخمیوں کے ساتھ رحم دلانہ سلوک روا رکھتا اور انھی رہا کر دیتا۔ سرکش اور مغرور لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ سخت دشمنوں کو طویل سزا دے کر حوالہ زنداں کر دیتا، اور بہادر اور جری لوگوں کی قدر کرتا اور ان میں سے اکثر کو رہا کر کے ان کی قابلیت اور تجربے سے فائدہ اٹھاتا۔

اس لڑائی کے بعد بھی اس نے یہی کیا۔ گرفتار شدہ لوگوں کو طلب کیا اور ان سے گفتگو کی۔ اتفاق کی بات کہ سب سے پہلے اس کی خدمت میں امۃ الحبیب کو پیش کیا گیا۔ یہ حسب معمول مردانہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ تیمور اس کو دیکھ کر نہایت متاثر ہوا۔ اس نے دیکھا کہ ایک طویل قامت، تنومند اور حسین وجمیل جوان انتہائی بے نیازی سے سامنے کھڑا ہے۔ اپنے مستقبل سے قطعی بے پرواہ ہے۔ تیمور نے اسے دیکھتے ہی حکم دیا کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا جائے مگر امۃ الحبیب نے جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے کہا:

”بادشاہ! مجھے کچھ عرض کرنا ہے“۔

اگر چہ تیمور ایسے عظیم فاتح کے لئے یہ فقرہ زیادہ اثر انگیز نہ تھا مگر نہ معلوم اس کے دل میں کیا بات آئی۔ فوراً کہا:

”کہو کیا بات ہے؟“

یہ حوصلہ افزا فقرہ سن کر امۃ الحبیب آگے بڑھی، مودبانہ سلام کیا، آداب شاہی بجالائی اور دوبارہ اجازت طلب کر کے مردانہ انداز میں بولی:

اے امیر! آپ کے سامنے میں کچھ گزارشات پیش کرنا اور چند حقائق کی نقاب کشائی کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کے حضور جو کچھ عرض کروں گا، وہ صحیح واقعات اور صداقت پر مبنی ہوگا۔ نہ میں کسی قسم کے تصنع کا اظہار کروں گا، نہ کسی مصنوعی اور غلط تعریف

سننے کے لئے آپ کو مجبور کروں گا۔ نہ کسی کے بارے میں غلط گوئی اور کذب بیانی سے کام لوں گا۔ میری زبان سے وہی الفاظ نکلیں گے جو صداقت کی میزان پر پورے اتریں گے۔ میری درخواست ہے کہ جب تک میں واقعات کی تمام تفصیلات کا آپ کے سامنے پوری طرح اظہار نہ کردوں مجھے تقریر کرنے سے روکا نہ جائے۔ میں دنیا کے ایک عظیم فاتح اور اولوالعزم انسان سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ میری اس استدعا کو شرف قبول بخشے گا۔

امۃ الحبیب کے درد میں ڈوبے ہوئے ان الفاظ نے تیمور کو متاثر کیا اور اس کے ارکان دربار اور خود تیمور اس جرأت مندانہ انداز کلام سے انتہائی متعجب ہوئے اور بادشاہ نے نہایت متانت سے جواب دیا:

فرمایئے۔

اب دربار میں سناٹا چھایا ہوا ہے اور چاروں طرف خاموشی طاری ہے۔ امۃ الحبیب کی آواز نے اس سناٹے کو توڑا اور جرأت مندانہ لہجے میں تقریر شروع کی:

تو نے بایزید پر حملہ کر کے ہزاروں بندگانِ خدا کو خاک وخون میں تڑپایا، تیری بے رحم تلوار نے بے شمار بے گناہوں کے سر تن سے جدا کردیئے، لاتعداد معصوم بچوں کو یتیم کردیا اور ان گنت عورتوں کا سہاگ اجاڑ دیا، تیرا یہ گناہ ہمیشہ تیرے گلے کا طوق بنا رہے گا۔ یاد رکھ! تو نے صرف ترکوں کی خون ریزی نہیں کی، اس کی جڑوں کو اکھاڑنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وہ ترک ہیں جنھوں نے سارے یورپ پر یلغار کرکے ان کو عاجز وبے بس کردیا تھا۔ یہی وہ بہادر ترک ہیں، جنھوں نے محض اسلام کی خاطر بڑی بڑی سلطنتوں کو تہ وبالا کرڈالا۔ تم مسلمان کہلاتے ہو، کیا بتاسکتے ہو کہ اہل اسلام کو اس بے رحمی سے قتل کرنا اور ان کی جان ومال کو تلف کرنا کہاں جائز ہے؟ بایزید وہ عظیم الشان فاتح ہے جس نے سارے یورپ کی بنیادوں کو ہلا ڈالا، تم نے اس کی قدر کرنے کی بجائے اسے نشانۂ ستم بنایا، اس نے تمھیں عاجزی سے صلح وآشتی کا پیغام بھیجا، لیکن تم نے اس کا پیغام

حقارت سے ٹھکرا دیا۔ تم نے یہ سوچا کہ جب تک بایزید پر فتح نہ حاصل کی جائے، تمہارا نام فاتحین کی فہرست میں درج نہ ہوگا۔ بتاؤ اس اللہ حکم الحاکمین کے سامنے کیا جواب دو گے، جس کے حضور حاضری کا وقت نہایت قریب ہے اور جس کی سزا انتہائی سخت ہے۔ کیا تمہیں اپنی موت یاد نہیں؟ کیا تمہیں اس حقیقت کا علم نہیں کہ تمہیں اللہ کے سامنے اپنے اعمال کے لئے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ یاد رکھو اس دنیا کی زندگی چند روزہ ہے، آخر کار موت کے منہ میں جانا اور اپنے اعمال کی جزا یا سزا بھگتنا ہے۔ بتاؤ جب اللہ تم سے مظلوموں پر ظلم کے بارے میں سوال کرے گا تو کیا جواب دو گے؟ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتاؤ کیا اس شخص پر بہادر اور فاتح کے لفظ کا اطلاق ہوسکتا ہے جو مظلوم اور بے بس قیدیوں پر تلوار اٹھائے اور ان کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے درپے ہو؟ کیا تمہارے نزدیک یہ شجاعت ہے کہ قیدیوں کو پابہ زنجیر کرکے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے؟ اگر یہ شجاعت ہے تو بتاؤ بزدلی اور بے رحمی کسے کہتے ہیں؟''

امۃ الحبیب نے سلسلۂ تقریر ختم کرکے ہاتھ اوپر کو اٹھایا اور آہنی خود سر سے اتار کر زمین پر رکھ دیا اور نہایات خشم گیں انداز سے کہا:

''تیمور دیکھو میں ایک عورت ہوں، تو اس سے اندازہ کرسکتا ہے کہ جس قوم کی عورتیں اس قسم کی بہادر ہوں، اس کے مرد کتنے بے خوف اور دلیر ہوں گے''۔

امۃ الحبیب نے بے باکانہ اور دلیرانہ انداز میں تیمور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''مجھے معلوم ہے تم نہایت سخت مزاج اور تند خو ہو، تمہارے ظلم کے حدود انتہائی وسعت پذیر ہیں، تمہیں اپنے مظالم کی وجہ سے اللہ کے نزدیک شدید ترین عذاب کا مستوجب گردانا جائے گا۔ تم نے بایزید کے ساتھ جنگ کرکے اسلامی فتوحات کی راہ میں جو رکاوٹیں پیدا کی ہیں اس کی تمہیں بہر حال سزا بھگتنا ہوگی۔

تیمور نے امۃ الحبیب کی یہ باتیں فراخ حوصلگی کی سے سنیں اور کہا:

''اے جرأت مند خاتون! تو نے جو کچھ کہا وہ بالکل بجا اور صحیح ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں بھی فاتح تھا اور بایزید یلدرم بھی۔ میرے لئے یہ برداشت کرنا مشکل تھا کہ اس دنیا میں دو فاتح ہوں۔ میں نے سوچا کہ دنیا کے باقی ماندہ حصوں کی طرف پیش قدمی کرنے سے پیشتر ہمیں پہلے آپس میں فیصلہ کر لینا چاہئے کہ فاتح کون ہے؟ جو جیت جائے گا وہی فاتح کہلانے اور مزید فتوحات کے لئے آگے بڑھنے کا مستحق ہوگا۔ لیکن اے بہادر خاتون! جو کچھ ہوا اسے اب نظر انداز کر دینا چاہئے۔ میرے دل میں تمہاری انتہائی عزت ہے اور میں بہادروں کی قدر کرنے کا عادی ہوں۔ جاؤ میں نے تجھے اور تیرے بہادر ساتھیوں کو جو تیرے ساتھ گرفتار ہو کر میرے قبضے میں آ ئے ہیں، معاف کیا۔ اس قسم کے جانبازوں کو قید میں رکھنا یا قتل کرنا بہادری اور شجاعت کی توہین ہے''۔

تیمور کے یہ الفاظ سن کر امۃ الحبیب نے اسے سلام کیا اور اپنے گرفتار شدہ ساتھیوں سمیت بایزید کے لشکر سے جا ملی۔ اس کے جانے کے بعد تیمور کے دل میں کئی قسم کے خیال آئے اور مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو موضوع فکر بنایا۔ آخر سلطان یزدانی کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا، جو غور وفکر، کچھ تامل اور امۃ الحبیب سے مشورے کے بعد قبول کر لیا گیا۔

دوسرے روز نکاح کی غرض سے تیمور گیارہ ہزار منتخب بہادر فوجیوں کو ساتھ لے کر جبل الطیر کے مقام پر پہنچا، جہاں یزدانی نے ایک بلند مقام پر وسیع خیمہ نصب کر رکھا تھا۔ قاضی نے نکاح پڑھایا اور تیمور نے چین کا علاقہ امۃ الحبیب کو حق مہر میں عطا کیا۔ یزدانی نے بھی بیٹی کو جہیز میں بہت کچھ دیا اور چند نصیحتیں کر کے رخصت کیا۔ امۃ الحبیب جوں ہی تیمور کے شاہی خیمے میں داخل ہوئی، اسے حمیدہ بانو بیگم کے نام سے پکارا جانے لگا۔

حمیدہ بانو بیگم سے پہلے تیمور کی تین بیویاں اور تھیں۔ یہ اس کی چوتھی بیوی تھی۔

مگر تیمور کا زیادہ پیار اسی سے تھا۔اس کی ایک وجہ اس کی بہادری اور جرأت تھی۔دوسری وجہ اس کا حسن و جمال تھا۔تیسری وجہ اس کی اخلاقی پاکیزگی،شائستگی،بیدار مغزی،روشن دماغی اور فہم وفراست تھی۔ان اوصاف نے نہ صرف تیمور کو بلکہ اس کی بیگمات اور دوسرے لوگوں کو بھی حمیدہ بانو کا فریفتہ اور مداح بنادیا تھا۔تیمور تمام معاملات میں اس سے مشورہ لیتا اور اس کی ہدایات پر عمل پیرا ہوتا تھا۔یہ میدان جنگ میں مسلح ہوکر بڑے بڑے خطرناک مقامات پر اس کے ساتھ رہتی اور دشمن کے مقابلے میں بہادری وشجاعت کے جوہر دکھاتی۔

جنگ وحرب اور جرأت وشجاعت کے علاوہ حمیدہ بانو بیگم اور بھی متعدد خوبیوں کی مالک تھی۔عربی،فارسی اور ترکی زبان پر اس عبور حاصل تھا۔چینی اور زرتشتی زبانوں سے بھی باخبر تھی،فن موسیقی میں بھی درک رکھتی تھی،شعروشاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ترکی اور عربی زبان میں اکثر شعر کہا کرتی تھی۔الفاظ کی بندش،فقروں کی برجستگی اور مطالب کا خاص خیال رکھتی۔اس کے اشعار،جنگ جو لوگوں کے بہادرانہ واقعات پر مشتمل ہوتے۔

نظم وشعر کے علاوہ نثر میں بھی اس دور کے لوگوں پر فائق تھی۔تیموری علاقوں کے مختلف حاکموں،والیوں اور عہدے داروں کے نام جو احکام اور فرامین جاری کیے جاتے،سب کے مسودے وہی تیار کرتی اور وہی انھیں آخری مشکل میں مرتب کر کے ارسال کرتی اور سب تحریریں اپنے ہاتھ سے لکھتی۔مختلف زبانوں میں حرم سرا کی خط وکتابت اور تیمور کی بیگمات کی تمام تر ڈاک کی ترسیل کی ذمہ داری بھی اسی کے سپرد تھی۔علاوہ ازیں تیمور کے حضور جو درخواستیں،عرض داشتیں،استغاثے،پیش ہوتے اور روزانہ حکومتی معاملات سے متعلق مختلف مقامات سے جو رپورٹیں آتیں،ان سب کے بارے میں احکام وتجاویز حمیدہ بانو بیگم ہی لکھتی اور جواب طلب امور کے ضروری جواب بھی وہی تحریر کرتی۔اس کا اسلوبِ کلام اور طرزِ تحریر نہایت عمدہ تھا اور وہ فصاحت وبلاغت میں

بڑی شہرت رکھتی تھی۔خوش خلقی، متانت وسنجیدگی اور عقل وخرد میں بھی اس کا ایک مقام تھا۔اپنے مفوضہ فرائض نہایت حسن وخوبی سے ادا کرتی اور تمام انتظامی امور بہترین نہج سے انجام دیتی۔

کتب بینی اور مختلف علوم کے مطالعہ کا اسے بے حد شوق تھا۔روزمرہ کے پیش آمدہ معاملات کو ضبط تحریر میں لانے کی عادی تھی۔اس سلسلے میں اس کی تصنیف کردہ دو کتابیں قابلِ ذکر ہیں، جو اس نے اپنی یادداشت اور نوٹس کی مدد سے امیر تیمور کی وفات کے بعد اپنے زمانۂ قیام قسطنطنیہ کے دوران میں لکھی تھیں۔ان کتابوں سے اس کی ذاتی قابلیت اور وسعت معلومات کا پتا چلتا ہے۔ایک کتاب کا نام ''ترکی خواتین'' ہے اور دوسری کا ''تیمور کی فتوحات ہند''۔یہ دونوں کتابیں درحقیقت اس کے ذاتی مشاہدات اور کثرت مطالعہ کا نچوڑ ہیں،اوران میں وہ واقعات بہتر ترتیب کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں جو اسے جنگی اور انتظامی سفر کے دوران مختلف مقامات پر پیش آئے۔

ترکی خواتین کی تاریخ کے موضوع سے متعلق کتاب خاصی ضخیم ہے۔اس میں شرفاء اور مشاہیر ترکوں کی خواتین کی عادات واطوار، طرز معاشرت، ان کے باہمی تعلقات، شوہروں کے ساتھ روابط، امور خانہ داری میں نظم ونسق، تہذیب وشائستگی، اخلاق وجذبات اوران کے رسوم ورواج کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور وضاحت کی گئی ہے کہ ترک خواتین دوسری عورتوں سے کن کن معاملات میں منفرد اور ممتاز ہیں اور کن خصوصیات کی بناپر دیگر ممالک کی خواتین پر فوقیت رکھتی ہیں۔

دوسری کتاب جو ''تیمور کی فتوحات ہند'' کے نام سے موسوم ہے، ایک عظیم الشان اور دلچسپ تاریخی دستاویز ہے۔اس کے حصۂ اول میں ان مورخین کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جنھوں نے تیمور کی ابتدائی دور کی فتوحات کو ظلم سے تعبیر کیا اور غیر نتیجہ خیز قرار دیا ہے۔اس کتاب میں تیمور کی عادات، اخلاق، تمدنی وملکی حالات اور عام طرزِ

زندگی کی وضاحت کی گئی ہے۔ آخری حصے میں حمیدہ بانو بیگم نے مختصر طور پر خود اپنی تاریخ اور واقعات بیان کیے ہیں۔ ان دونوں کتابوں کا ترجمہ سب سے اول فرانسیسی زبان میں ہوا۔ اس کے بعد دوسری زبانوں میں بھی منتقل کی گئیں اور مقبول ہوئیں۔

حمیدہ بانو اور بھی بہت سے اوصاف کی مالک تھی۔ مثلاً زرہ بکتر بنانے میں بڑی ماہر تھی۔ تیمور معرکۂ کارزار میں جو زرہ بکتریں استعمال میں لاتا، وہ سب اسی کی تیار کردہ تھیں۔

مذہب اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں ایک مکتوب میں وہ زرتشتی مذہب کے ایک پیشوا کو وضاحت اور بے تکلفی سے لکھتی ہے:

''آپ کا مکتوب مجھے ملا۔ آپ نے میری تبدیلی مذہب اور موجودہ حالت کے بارے میں جس انداز سے اظہار خیال اور اظہار افسوس کیا ہے، حیران ہوں کہ اس کا کیا جواب دوں۔ آپ کا یہ لکھنا کہ میں امیر تیمور کی بیگم بننے کے بعد دائرۂ اسلام میں داخل ہوئی، قطعی غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے شہنشاہ تیمور کے عقد میں آنے سے پہلے ہی بلا کسی جبر و اکراہ اور خوف و طمع کے محض اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لیا تھا۔ البتہ یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ میں کیوں مسلمان ہوئی اور اسلام میں کون سی ایسی خوبی دیکھی جو اس درجہ قابلِ تعریف تھی کہ مجھے زرتشت کو چھوڑ کر اسلام سے وابستگی اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ بات یہ ہے کہ یہ سوال بڑا ہی نازک ہے اور میں اس کے جواب میں علاوہ اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتی کہ میرا قلبی میلان خود بخود اسلام کی طرف ہو گیا اور آپ کو خوب معلوم ہے کہ دل پر کسی کا بس نہیں۔ آپ نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ زرتشت کی محبت اور عزت میرے دل میں پہلے کی طرح موجزن ہے یا نہیں اور مذہب آتش پرستی کو میں کس نظر سے دیکھتی ہوں؟''۔

''اس سوال کے جواب میں میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اسلام قبول کرنے

کے بعد بھی میرے دل میں زرتشت کی عزت اور عظمت موجود ہے۔ میں مسلمان ضرور ہوں، لیکن کسی مذہب کی توہین اور مذمت کو قطعی غلط سمجھتی ہوں‘‘۔

حمیدہ بانو بیگم کے اس قسم کے خیالات کی وجہ سے بعض لوگ اس کے قبولِ اسلام کو مشتبہ قرار دیتے ہیں اور بعض مورخین اسے الحاد اور نیچری افکار کی حامل بتاتے ہیں لیکن ہمارے خیال میں یہ صحیح نہیں۔ شاید اس میں عملی کمزوریاں تو ہوں گی، مگر وہ مسلمان بہر حال تھی اور اخلاق و کردار، تواضع و انکسار، شرم و حیا، عفت و پاک دامنی اور شجاعت و بہادری میں وہ ممتاز تھی۔ علاوہ ازیں علوم و فنون سے بھی اسے انتہائی لگاؤ اور تعلق تھا۔ کسی مذہب کی عزت کرنے سے اس کے اسلام پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کیونکہ اسلام اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ دوسرے مذاہب کی توہین کریں۔

اس کی زندگی کے بعض واقعات نہایت تعجب خیز اور حیرت انگیز ہیں۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ یہ خاتون بڑی بڑی مشکلات برداشت کرنے کی خوگر تھی۔ اس ضمن میں ایک بہت بڑا اور انتہائی اہم واقعہ قلعہ اصطخر کی تسخیر کا ہے۔ یہ واقعہ تیمور کی زندگی میں پیش آیا اور حمیدہ بانو بیگم کے جرأت مندانہ اقدام سے تیمور کو اس پریشانی سے نجات ملی۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ قلعہ اصطخر کا گورنر شریف حسن تھا جو تیمور کی طرف سے اس پر متعین تھا۔ شروع میں یہ ایک بے ضرر آدمی معلوم ہوتا تھا، مگر اصطخر کا گورنر مقرر ہوتے ہی اس کے دل کی دنیا بدل گئی اور وہ فساد پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ تیمور کے ماتحت نہیں رہے گا اور اصطخر کے قلعہ کو اپنا مستقل ٹھکانا بنا کر تیمور کے تمام مقبوضہ علاقوں کو فتح کرنے اور اپنی تحویل میں لینے کی سعی کرے گا، چنانچہ کچھ لوگوں کو اس نے اپنا ہم نوا بنایا اور تھوڑی سی طاقت فراہم کر کے بغاوت و خودسری پر اتر آیا اور قلعہ اصطخر پر قابض و مسلط ہو گیا۔

چند روز کے بعد تیمور کو بھی تمام واقعات کا علم ہو گیا اور اسے پتا چل گیا کہ

شریف حسن کی نیت کیا ہے اور اس سلسلے میں کون کون لوگ اس کے ساتھ ہیں۔ اس کی اس حرکت پر وہ سخت برافروختہ ہوا اور واقعات کی تفصیل سن کر اس کے تن بدن میں غصے کی آگ بھڑک اٹھی اور جنگ کا حکم دے دیا۔ حمیدہ بانو بیگم کو بھی سخت صدمہ پہنچا اور اس نے تیمور سے درخواست کی کہ وہ خود گورنر اصطخر کے مقابلے پر جائے گی اور شریف حسن کو اس کی سرکشی اور بغاوت کی پوری سزا دے گی۔ چنانچہ وہ بارہ ہزار تجربہ کار جوانوں کی فوج لے کر روانہ ہوئی اور وہاں پہنچتے ہی قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ محاصرے کے بعد قلم اٹھایا اور شریف حسن کو درج ذیل مضمون پر مشتمل خط لکھا۔ ملاحظہ کیجئے خط کے الفاظ کتنے زوردار اور فیصلہ کن ہیں:

''شریف حسن! میں نے شہر کا محاصرہ کرلیا ہے، تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم نے بغاوت اور سرکشی کی جو آگ بھڑکائی ہے، وہ تمہارے لئے خطرناک ثابت ہوگی اور اس کے شعلے خود تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ اگر تم اب بھی اپنی سرکشی اور خودسری سے باز آجاؤ گے تو شہنشاہ تیمور کے نزدیک تمہاری وہی تعظیم وتکریم ہوگی جو اس سے پیشتر وفاداری کے زمانے میں تھی، اور اگر تم نے بعض مغرور اور نخوت پسند اشخاص کی شہ پر اس آگ کے شعلوں پر پانی نہ ڈالا بلکہ اس کو مزید بھڑکانے کی کوشش جاری رکھی تو خوب سمجھ لو کہ اس کا نتیجہ نہایت خوف ناک ہوگا اور تم بہت جلد اس کے تمام پہلوؤں سے باخبر ہوجاؤ گے۔ میں تمہیں صاف لفظوں میں بتا دینا چاہتی ہوں کہ تمہاری اور تمہارے مغرور ساتھیوں کی اکڑی ہوئی گردنیں توڑ کر زمین پر پھینک دی جائیں گی اور تمہارے بے سر جسم ہمارے بہادروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پاش پاش کردیئے جائیں گے۔ بے شک میں ایک عورت ہوں، جو تمہارے مقابلے کے لئے میدان میں اتری ہوں، لیکن یاد رکھ! ارادے کی پکی اور عزم کی پوری ہوں۔ میں نے حتمی فیصلہ اور قطعی ارادہ کرلیا ہے کہ جب تک جسم میں روح اور تن پر سر باقی ہے لڑائی

سے منہ نہ موڑوں گی اور تاوقتیکہ تمہاری اور تمہارے سرکش ساتھیوں کی نعشیں گھوڑوں کے سموں کے تلے کچلی ہوئی نہ دیکھ لوں تم سے بات نہ کروں گی۔ میں تمہیں یہ بھی بتادوں کہ جہاں میں سخت دل ہوں وہاں نہایت رحم دل بھی ہوں۔ میں ہرگز نہیں چاہتی کہ مخلوق خدا کے خون سے اپنی تلوار کو رنگین کروں، اس لئے تم سے کہتی ہوں کہ اپنی اس غلط کاری اور عاقبت نا اندیشی پر متنبہ ہو جاؤ اور سرکشی کا جو جال تم نے بچھا رکھا ہے اس کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ دو، کیونکہ تمہارا اور ہمارا اور اللہ کی مخلوق کا بھلا اسی میں ہے۔ اگر میں نے تلوار کمر سے کھول لی تو اس وقت تک اسے میان میں نہ ڈالوں گی جب تک تمہارے سر قلم نہ کردوں۔ والسلام"۔

حمیدہ بانو بیگم کے اس خط سے شریف حسن حواس باختہ ہو گیا اور اس کے پاؤں تلے کی زمین کھسک گئی۔ اب وہ اس سوچ میں تھا کہ اس خط کا کیا جواب دیا جائے اور حمیدہ بانو کو کس طرح خوش کیا جائے یا کم از کم حملے سے روکا جائے۔

شریف حسن فطری طور پر دھوکا باز اور فریبی شخص تھا۔ اس کے کاروبار حکومت کی پوری عمارت دھوکے اور فریب کی بنیادوں پر استوار تھی۔ اسے معلوم تھا کہ حمیدہ بانو بیگم بہادر ہونے کے باوجود بڑی رحم دل اور خدا ترس بھی ہے اور آسانی سے دھوکے کے جال میں پھنس جاتی ہے، چنانچہ اس نے اس خاتون کو فریب دینے کی ٹھانی اور مندرجہ ذیل مضمون پر مشتمل مکتوب لکھا۔ اس نے انتہائی لجاجت سے تحریر کیا:

"میں آپ کا ادنیٰ غلام ہوں۔ میری تمام ترقیاں آپ کی کرم فرمائیوں کا نتیجہ ہیں۔ اگر آپ میری طرف نظر کرم نہ فرمائیں تو میری حیثیت بالکل ختم ہو جاتی ہے، میرا سر حاضر ہے، چاہے اسے تلوار سے کاٹ دیجئے، چاہے اس پر تاج حکومت رکھ دیجئے۔ خدا شاہد ہے نہ میں باغی ہوں نہ آپ کے خلاف بغاوت کا تصور کر سکتا ہوں اور نہ میں نے کبھی اس کی جرأت کی ہے۔ بعض اہم معاملات البتہ ایسے پیش آ گئے ہیں جنھوں نے

میرے متعلق آپ کے دل میں بغاوت کا احساس پیدا کر دیا اور میں حضور کی بارگاہ میں معتوب قرار پایا۔ اگر اس عاجز سے کوئی ایسی بات سرزد ہوگئی ہے جو طبع عالی پر ناگوار گزری ہے تو میں بصد عجز معافی کا خواستگار ہوں۔ یہ ادنی غلام کبھی آپ کے حکم سے باہر نہ جائے گا اور حضور کے فرمان واجب الاذعان کو تسلیم کرنے سے ہرگز انکار کی جرأت نہ کرے گا۔ کل آپ کے لئے قلعہ اصطخر کا دروازہ کھول دیا جائے گا اور یہ غلام بھی دست بستہ حاضر خدمت ہوگا''۔

حمیدہ بانو بیگم چونکہ صاف دل کی مالک تھی اور مکر وفریب اور دجل ودغا بازی سے اس کی لوح قلب پاک تھی اس لئے اس نے شریف حسن کے خلاف دل سے غصے اور بغض کو قطعی طور سے نکال دیا اور اس کے خط کو ایک صادق اور سچے انسان کے دل کی آواز سمجھا، حالانکہ یہ خط سراسر دھوکا دہی پر مبنی تھا اور شریف حسن نے ایک مکار اور فریبی کا روپ دھار کر یہ خط تحریر کیا تھا۔ حمیدہ بانو بیگم یہ خط پڑھ کر نہایت خوش ہوئی اور اس نے یہ سمجھا کہ یہ مشکل مسئلہ بغیر کسی لڑائی اور خون بہانے کے حل ہوگیا ہے اور اس فتح پر تیمور کے نزدیک میری قدر ومنزلت پہلے سے زیادہ ہو جائے گی، لیکن افسوس اس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی اور مسرت کی یہ گھڑیاں بہت جلد ختم ہوگئیں۔

مورخین نے لکھا ہے کہ حمیدہ بانو بیگم بہت بڑی جنگ جو اور معاملہ فہم وبہادر ہونے کے باوصف بہرحال ایک عورت تھی اور اپنی بے پناہ زیرکی کے باوجود بعض جنگی چالوں سے بے خبر تھی۔ لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حمیدہ بانو بیگم حریف کی ان چالوں سے آگاہ تھی جو میدان جنگ میں دشمن کو زیر کرنے اور دھوکا دینے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہیں مگر یہاں معاملہ مختلف تھا۔ یہاں کوئی معرکۂ کارزار گرم نہ تھا بلکہ ابھی سلسلۂ مراسلت جاری تھا جس کی وجہ سے اسے دشمن کے دھوکے کا شکار ہونا پڑا۔

اب آگے چلئے!

رات تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہو کا عالم تھا اور ہر سو خاموشی کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ حمیدہ بانو بیگم کے تمام فوجی جو طویل سفر کی وجہ سے تھکاوٹ سے چور تھے گہری نیند سو رہے تھے۔ تنہا حمیدہ بانو بیگم بیدار تھی۔ اس کا خیمہ چاروں طرف سے بند تھا اور وہ تیمور کو اس مضمون کا خط لکھ رہی تھی کہ شریف حسن بغیر کسی مزاحمت اور فوجی کارروائی کے ہار مان گیا اور وہ کل قلعہ اصطخر کی کنجیاں میرے حوالے کر دے گا۔ اتنے میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں اسے سنائی دیں۔ اسے شبہ گزرا کہ شریف حسن نے مکاری سے کام لیا ہے اور وہ ہماری فوج پر شب خون مارنے کے لئے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس نے تاریکی میں خیمے سے باہر جھانک کر دیکھا تو واقعی بہت بڑی فوج تیز رو گھوڑوں پر سوار اس کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کے پہرے دار بے فکر ہو کر گہری نیند سو رہے تھے۔ اس نے پہرہ داروں کو جگایا اور صورت حال کا پتا لینے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی انھوں نے عرض کیا کہ حضور! شریف حسن مکار اور دغاباز ثابت ہوا ہے اور اس کی حملہ آور فوج آپ کے خیمے کے قریب پہنچ گئی ہے۔ حمیدہ بانو بیگم اس ناگہانی حملے پر پہلے تو کچھ پریشان ہوئی، لیکن جلد ہی حواس پر قابو پا کر اٹھ کھڑی ہوئی، مگر دشمن کی پیش قدمی اتنی تیز تھی کہ ابھی وہ ہتھیار سنبھالنے اور مسلح ہونے نہ پائی تھی کہ غنیم نے خیمے کا محاصرہ کر لیا اور حمیدہ بانو بے بس ہو کر رہ گئی۔ حمیدہ بانو کے لئے یہ وقت بڑا تشویش ناک تھا اور شدید خطرہ تھا کہ دشمن اس کو گرفتار کر لے گا، مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور اسلحہ سے لیس ہو کر خیمے سے باہر نکل آئی۔ وہ بالکل تنہا تھی، کوئی معاون و مددگار نہ تھا۔ ایسے پر خطر وقت میں ہوش و حواس قائم رکھنا اور دشمن سے محفوظ رہنا بڑے سے بڑے بہادر اور شجاع کے لئے بھی انتہائی مشکل ہوتا ہے، لیکن اس جری اور دلیر خاتون کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور اس کی روایتی حمیت نے گوارا نہ کیا کہ وہ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالے یا اپنی شکست کا اعتراف کرے یا کسی طرح اپنی جان بچا کر تو بھاگ جائے اور فوج کو موت

کا لقمہ بننے کے لئے دشمن کے حوالے کر دے۔اس نے پوری جرات سے دشمن کو للکارا۔

''دغاباز اور مکر وفریب کا تھیلا شریف حسن کہاں ہے؟ سامنے آ اور مقابلہ کر''۔

حمیدہ بانو بیگم کی للکار سن کر ایک نوجوان گھڑ سوار جو شریف حسن کا بڑا بیٹا تھا، آگے بڑھا اور گستاخانہ انداز میں بولا۔

''بیگم! تم ہماری دلیر فوج کے گھیرے میں آ چکی ہو۔اب تمہارا جان بچا کر نکل جانا ممکن نہیں۔صرف ایک صورت ہے جو تمہاری جان کی حفاظت کی ضامن ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ تم تیمور کے بجائے مجھے اپنا شوہر سمجھو۔اگر تم اس پر رضامند ہو جاؤ تو ابھی محاصرہ اٹھالیا جائے گا اور اصطخر کا قلعہ توقیر و تکریم کے ساتھ تمہارے حوالے کر دیا جائے گا''۔

یہ سن کر حمیدہ بانو بیگم غصے سے بے قابو ہو گئی۔جذبات سے بے تاب ہو کر ترکش کی طرف ہاتھ بڑھایا'' تیر نکال کر کمان میں جوڑا اور اس زور سے دشمن کی طرف پھینکا کہ وہ گھوڑے سے نیچے گرا اور مر گیا''۔

اب حمیدہ بانو بیگم کا حوصلہ بڑھ چکا تھا۔اس نے اپنے حفاظتی دستے کو فاتحانہ شان سے پکارا۔یہ تعداد میں کل پانچ سو تھے اور پریشانی وحیرانی کے عالم میں ادھر ادھر حمیدہ بانو بیگم کو تلاش کر رہے تھے۔انھیں کچھ پتا نہ تھا کہ بیگم کہاں ہے اور کس عالم میں ہے۔شور وہنگامہ میں بیگم کی آواز ان تک نہ پہنچ سکی۔دوسری آواز دینے کو تھی کہ شریف حسن بے شمار سپاہیوں کے ساتھ اس پر ٹوٹ پڑا۔یہ صورت حال بیگم کے لئے نہایت تشویش ناک تھی۔مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور مقابلے کے لئے تیار ہو گئی۔شریف حسن کا یہ اقدام انتہائی بزدلانہ تھا اور ایک مرد کا اتنی بڑی تعداد کے ساتھ ایک تنہا عورت پر حملہ آور ہونا باعثِ شرم تھا۔لیکن شریف حسن دراصل حمیدہ بانو بیگم کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔یہ اس کو زندہ گرفتار کرنے کا خواہاں تھا اور اس نے اپنی فوج کو بھی یہی حکم دے رکھا تھا کہ اسے زندہ گرفتار کیا جائے ورنہ اگر ارادہ اس کے قتل کا ہوتا تو اتنی بڑی فوج کے لئے یہ کام

مشکل نہ تھا۔

اتنے میں بیگم نے دشمن کی فوج کے ایک دستے کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو گھوڑے کی باگ روک کر کھڑی ہوگئی لیکن جب اس نے دیکھا کہ فوج اس پر حملہ نہیں کر رہی ہے تو فوراً سمجھ گئی کہ دشمن کے ارادے خطرناک ہیں اور وہ اسے قتل کرنے کے بجائے گرفتار کرنے کی تدبیریں سوچ رہا ہے۔ حمیدہ بانو اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے دشمن پر حملہ کرنا چاہتی تھی کہ اس کے حفاظتی دستے نے آگے بڑھ کر شریف حسن کو گھیرے میں لے لیا، جوں ہی وہ پریشانی کی حالت میں پیچھے ہٹا حمیدہ بانو نے عقب سے دشمن پر حملہ کر دیا اور للکار کر کہا ہوشیار ہو جاؤ، بہت بڑی فوج میری مدد کو پہنچ گئی ہے۔ اب فریقین کے درمیان گھمسان کی جنگ ہونے لگی جو طلوع آفتاب تک جاری رہی۔ طرفین کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ خود حمیدہ بانو بیگم کو بھی کئی زخم آئے۔ مگر جنگ کا نتیجہ شریف حسن کے خلاف اور حمیدہ بانو بیگم کے حق میں نکلا۔

صبح کو جنگ ختم ہوتے ہی حمیدہ بانو بیگم اپنی باقی ماندہ فوج کو ساتھ لے کر وہاں سے چل کھڑی ہوئی اور تین میل پیچھے ہٹ کر سلطانہ کے مقام پر آرکی، جہاں زخموں کا علاج کرایا اور چند روز کے بعد صحت یاب ہوگئی۔ اس شب خون میں حمیدہ بانو بیگم کے ساڑھے تین ہزار فوجی مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے، لیکن اس کے پاس سامان رسد اتنا زیادہ تھا کہ اب بھی وافر مقدار میں باقی تھا۔ اس اولوا العزم خاتون نے چند روز کے بعد پھر قلعہ اصطخر کا رخ کیا۔ قلعہ سے سات میل کے فاصلے پر دشمن سے لڑائی ہوئی جو دس روز تک جاری رہی۔ آخر گیارہویں روز حمیدہ بانو نے قلعہ فتح کر لیا۔ شریف حسن میدان جنگ میں مارا گیا اور اس کے اہل وعیال گرفتار کر لئے گئے۔ مگر حمیدہ بانو بیگم نے ان کے ساتھ نہایت رحم دلانہ اور مشفقانہ سلوک کیا اور قلعہ اصطخر اپنی فوج کی تحویل میں دے کر خود تیمور کے پاس جا پہنچی۔

حمیدہ بانو بیگم تیمور کی چوتھی بیوی تھی، دو بیویاں تو تیمور کی زندگی میں ہی وفات پا گئی تھیں، دو بیویاں اس کے بعد زندہ رہیں جن میں سے ایک کا نام حمیدہ بانو بیگم اور ایک کا فخر النساء بیگم تھا۔

تیمور کا مرض جب زیادہ بڑھ گیا اور اس کی طبیعت بگڑنے لگی تو حمیدہ بانو بیگم گھبرائی ہوئی تیمور کے پاس آئی۔ اس کی حالت کا غور سے جائزہ لیا اور عرض کیا کہ میرے متعلق کیا حکم ہے؟ تیمور اس وقت عالم نزع میں تھا اور اس کے ہوش وحواس قائم نہ تھے۔ اس لئے خاموش رہا اور حمیدہ کے سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ تھوڑی دیر بعد جب طبیعت کو کچھ سکون محسوس ہوا اور حواس ٹھیک ہوئے تو اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہا:

''حمیدہ بانو! میں اس وقت نزع کی حالت میں ہوں۔ یہ میری زندگی کا آخری وقت ہے۔ میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے بعد تمہیں میری جگہ تخت حکومت پر متمکن کیا جائے''۔

لیکن ہوا یہ کہ جب تیمور وفات پا گیا تو اس کا لڑکا میران شاہ (جو حمیدہ بانو بیگم کا سوتیلا بیٹا تھا) حکومت کے دعوے دار کی صورت میں میدان میں نکل آیا اور حمیدہ بانو کے ساتھ معرکہ آرا ہو، فریقین کے درمیان خوں ریز جنگ ہوئی جس کا نتیجہ میران شاہ کے حق میں نکلا اور اسے بادشاہ بنالیا گیا، مگر اس کے بعد یہ خاتون وہاں سے چلی گئی اور شہر طفلس میں اقامت گزیں ہوگئی، جاتے ہوئے بہت سا مال وزر اور ساز وسامان ساتھ لے گئی۔

تیمور کا انتقال انزار نامی شہر میں ہوا تھا جو سمرقند سے چھتیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ وہ اسی شہر میں بیمار ہوا اور اسی میں وفات پائی۔ اس کا مقبرہ سمرقند میں ہے۔ تیمور نے ۳۶ برس حکومت کی اور وہ ۸۰۷ھ (۱۴۰۵ء) میں ۷۱ برس عمر پا کر فوت ہوا۔ اس کی تاریخ ولادت، تاریخ حکومت اور تاریخ وفات درج ذیل رباعی میں بیان کی گئی

ہے۔

سلطان تیمر آنکہ مثل او شاہ نبود | در ہفت صدوسی وشش آمد بوجود
در ہفت صد وہفتاد یکے کرد جلوس | در ہشت صد وہفت کرد عالم پدرود

حمیدہ بانو بیگم کے بطن سے تیمور کے سات بچے پیدا ہوئے، لیکن ان میں سے زندہ کوئی بھی نہ رہا اور وہ سب شیر خواری کی حالت میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تیمور کی وفات کے بعد وہ بالکل تنہا تھی۔ اس کا ایک بچہ بھی نہ تھا جس سے دل بہلا سکتی اور نہ کوئی ایسا مشغلہ ہی تھا جو اسے اپنی طرف متوجہ کیے رکھتا۔ چند مہینے پہلے وہ دنیا کے عظیم بادشاہ کی ملکہ تھی اور تمام کاروبارِ حکومت اس کے اشاروں پر چلتا تھا۔ لیکن اب اس کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ اس وحشت انگیز تنہائی میں اس نے کتابوں کو اپنا رفیق بنایا۔ وہ اس دور کے علم وفن کی تمام اصناف میں ماہر تھی اور اس عہد کا کوئی شخص اس باب میں اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا، لیکن حکومت وسلطنت کی مصروفیات نے اس کی توجہ دوسری طرف مبذول کرا دی تھی۔ تیمور کی وفات کے بعد اس نے کتابوں کے مطالعہ کو اپنی دلچسپیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔

حمیدہ بانو جس طرح تیمور کی زندگی میں پردہ نہیں کرتی تھی اور کھلے چہرے ہر جگہ آتی جاتی تھی، اس کی وفات کے بعد بھی اس نے یہی انداز قائم رکھا اور پردے کو غیر اہم سمجھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوتی اور بلا تکلف پوری آزادی کے ساتھ باغوں، جنگلوں اور بازاروں کی سیر کرتی وراس ضمن میں لوگوں کی چہ میگوئیوں کو کوئی اہمیت نہ دیتی۔

وہ بہت بڑی خاتون تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ متعدد بڑے لوگوں نے جو میران شاہ کی حکومت سے مطمئن نہ تھے، اس کو پیغام بھیجا کہ آپ حکم دیں تو ہم میران شاہ کے خلاف بغاوت کر کے اور اسے قتل کر کے تیمور کی وصیت کے مطابق آپ کو سربراہِ سلطنت بنانے کو تیار ہیں۔ ملک کی اہم شخصیتیں میران شاہ کو پسند نہیں کرتیں اور وہ اس سے بیزار ہیں، آپ کا ادنیٰ اشارہ ہمارے لئے کافی ہے اور آپ کی بادشاہت کے

لئے میدان صاف ہے۔

مگر حمیدہ بانو بیگم نے ان کو صاف لفظوں میں جواب دیا کہ میں حکومت وسلطنت کے معاملات کو ترک کر کے مطالعۂ کتب کو ترجیح دیتی ہوں۔ آپ لوگ اگر دین اور دنیا کی کامیابی کے متمنی ہیں تو اس شر وفساد کو دل سے نکال دیں اور وفاداری اور دیانت کے ساتھ اپنے موجودہ حکمراں کی اطاعت کریں۔

حمیدہ بانو بیگم کئی سال طفلس میں مقیم رہی۔ وہاں کا ماحول اسے بہت پسند تھا اور وہ وہیں زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ وہاں اس نے مستقل رہائش کی غرض سے کوہ کری پر ایک رفیع الشان اور خوشنما عمارت بھی بنالی تھی۔ مگر اچانک حالات نے پلٹا کھایا اور اس کے متعلق بعض ایسی نفرت انگیز خبریں مشہور ہوئیں کہ جنھوں نے اس کے ذہنی سکون کو تہہ وبالا کر ڈالا اور اس کے لئے وہاں رہائش رکھنا ناممکن ہوگیا، چنانچہ اس نے طفلس کو خیرباد کہا اور بالحوم کو اپنا مسکن بنالیا۔ بالحوم میں بھی ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ وہاں بھی قیام نہ کرسکی اور قسطنطنیہ چلی گئی اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔

حمیدہ بانو بیگم نویں صدی ہجری اور پندرہویں صدی عیسوی کی بہادر خاتون تھی۔ اس کا انتقال ۶۱ برس کی عمر میں ہوا۔ وفات کے وقت وہ بالکل خالی ہاتھ تھی۔ مال وزر اور نقد وجنس میں سے کچھ بھی اس کے پاس نہ تھا۔ اس نے اپنی تمام دولت جمعِ کتب پر صرف کردی تھی، چنانچہ جب وہ فوت ہوئی تو اس کے پاس ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا جو مرتے وقت اس نے وقف کردیا تھا۔ یہ کتب خانہ اگرچہ مختلف علوم کی بے شمار کتابوں پر مشتمل تھا، تاہم اس میں علم ہیئت اور تاریخ کے موضوع سے متعلق کتابیں زیادہ تھیں۔

حمیدہ بانو بیگم زیادہ عرصہ بیمار نہیں رہی۔ اسے صرف تین روز معمولی بخار ہوا اور چوتھے روز روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

☆☆☆

جاناں بیگم

وہ خاتون جس نے بادشاہ کے شادی کے پیغام کو ٹھکرا دیا تھا اور اسے اس سے باز رہنے کے لئے اپنے تمام دانت اکھڑوا ڈالے تھے اور سر کے بال کٹوا دیئے تھے۔

مرزا عبدالرحیم خان خاناں کو اکبری دربار میں نہایت عزت و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اس عہد کا یہ ایک نامور اور معزز فرد تھا۔ ارکان دولت اور امراء سلطنت میں اس کا مرتبہ سب سے بلند تھا۔ اس کی شجاعت اور بہادری کا یہ عالم تھا کہ اس نے دکن کی بڑی بڑی جنگوں اور چتوڑ کی سنگین معرکہ آرائیوں میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ نقش رہیں گے۔ یہی وہ جاں باز اور دلیر شخص تھا جس کی وجہ سے یہ فتوحات حاصل ہوئیں اور سلطنت مغلیہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوا۔ خان خاناں جس طرح بہادری اور جرأت میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا، اسی طرح فہم و فراست اور عقل و دانش میں بھی بے مثل تھا۔ جاناں بیگم اسی عظیم المرتبت باپ کی بیٹی تھی اور اپنے حسن و جمال اور علم و فضل کی وجہ سے تمام ملک میں مشہور تھی۔ علاوہ ازیں اپنی فطری نیکی، طبعی متانت اور معاملہ فہمی کی بنا پر ہندوستان بھر میں ممتاز تھی۔

جاناں بیگم والدین کی اکلوتی بیٹی تھی اور اس کی رعنائی و زیبائی اور علمیت کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا تھا۔ اسے علومِ دینیہ سے ازحد لگاؤ تھا اور وہ اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا اسی کو سمجھتی تھی۔ گویا قدرت نے اس کو خدمت دین کے لئے ہی پیدا کیا تھا اور یہی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ امورِ دینیہ سے اس کی دلچسپیوں کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اس نے

فارسی میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو اس وقت مضامین و مندرجات کی خوبی وندرت کی بنا پر قبولیتِ عامہ کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ شہنشاہ اکبر نے اس تفسیر کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا اور جاناں بیگم کے اس علمی کارنامے کے صلے میں اسے پچاس ہزار دینار عطا کئے اور انتہائی مسرت کے ساتھ اسے اپنے ذاتی کتب خانہ میں ممتاز جگہ دی۔

جاناں بیگم اچھی شاعرہ اور سخن ور بھی تھی۔ منقول ہے کہ جاناں بیگم نے حج بیت اللہ بھی کیا تھا۔

وہ برجستگی، قادر الکلامی اور شیوا بیانی کے لئے اہلِ سخن میں مشہور تھی اور اس باب میں عمدہ ذوق رکھتی تھی۔ جاناں بیگم سن بلوغ کو پہنچی تو اکبر نے شہزادہ دانیال کے ساتھ اس کی شادی کا خیال ظاہر کیا اور باقاعدہ چند افراد کے ذریعے درخواست کی جو خان خاناں نے منظور کر لی۔ نسبت و نکاح کی یہ تقریب ۱۰۰۶ھ (۱۵۹۸ء) کو تزک واحتشام سے انعقاد پذیر ہوئی۔ اس موقع پر پورے شہر میں چراغاں کیا گیا۔ تمام بازار آراستہ کئے گئے، لوگوں میں دل کھول کر دولت تقسیم کی گئی اور فریقین کی طرف سے ایک دوسرے کی انتہائی خدمت کی گئی۔ شادی کی اس تقریب میں جو چیز لائق تعریف ہے، وہ یہ ہے کہ لڑکی چونکہ عالمہ تھی اور علوم دینیہ سے وابستگی رکھتی تھی، لہٰذا اس نے اپنے طور پر قصر شاہی کی مستورات کو ان بے شمار رسوم سے باز رکھا جو اس زمانے میں رائج تھیں۔ اس نے پوری کوشش کی کہ ان فضول اور بے مقصد رسوم سے اجتناب کیا جائے اور کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہونے پائے جو شریعتِ اسلامی کے منافی ہو۔

کہتے ہیں جاناں بیگم کی احتیاط اور غلط رسوم سے پہلو تہی کے باوجود بے حد سیم وزر لٹایا گیا اور بے شمار مسرفانہ اقدام کئے گئے، مثلاً شہزادہ دانیال، تمام خاندان شاہی، فوج وانتظامیہ کے اہل کاروں اور وزراء کے ساتھ مسلسل آٹھ روز عبد الرحیم خان خاناں کا مہمان رہا اور اس مہمان نوازی پر لڑکی والوں کی طرف سے جو مصارف ہوئے ان کا

تخمینہ دو کروڑ پچاس لاکھ روپے لگایا گیا ہے۔ اسراف وتبذیر کے یہ مظاہرے بادشاہوں اور امراء وارکانِ دولت کے ساتھ مختص ہو چکے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود جاناں بیگم نہایت نیک اور باوقار خاتون تھیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔

شہزادہ دانیال کے انتقال کے بعد جاناں بیگم اکثر مغموم وملول رہتی تھی اور ظاہر ہے وہ بہت بڑے صدمے سے دوچار تھی۔ بھرے گھر کا اجڑ جانا اور شوہر کا مرجانا کوئی معمولی بات نہیں ہے، انتہائی دکھ اور تکلیف کی بات ہے۔ دانیال کے انتقال کے بعد نورالدین جہاں گیر کو تختِ ہند کا وارث قرار دے دیا گیا تھا۔ مسندِ حکومت پر متمکن ہونے کے کچھ روز بعد جہاں گیر نے چند معتبر اشخاص اور بعض عمائدِ سلطنت کو جاناں بیگم کے پاس درخواستِ نکاح دے کر بھیجا اور کہا کہ وہ حسن وجمال اور علم وعرفان کی مالک ہے، یہ بیوگی اس کے لئے سوہانِ روح کی حیثیت رکھتی ہے، بہتر ہوگا کہ وہ میرے ساتھ شادی کرلے، اسے دنیا میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور عزت وآبرو اور شوکت وحشمت سے زندگی بسر کرے گی۔

جہاں گیر کے ان فرستادگان نے جاناں بیگم کو بادشاہ سے عقد کرنے کو کہا تو اس نے اس درخواست کو ٹھکرادیا اور شادی کرنے سے صاف انکار کردیا۔ جاناں بیگم نے کہا میں اب شادی نہیں کروں گی اور بقیہ زندگی بیوگی کے عالم میں گزار دوں گی۔ آئندہ جہاں گیر کی طرف سے اس قسم کی کوئی درخواست نہیں آنی چاہئے۔

اس صاف انکار پر بھی جہاں گیر نے خاموشی سے بیٹھنا گوارا نہ کیا۔ دوبارہ لوگوں کو بھیجا اور اس مرتبہ زیادہ اصرار کیا گیا تو جاناں بیگم نے دوسرے روز خود ہی بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا وعدہ کیا۔ یہ رات اس نے نہایت تذبذب اور بےچینی کی حالت میں گزاری۔ صبح ہوئی تو انتہائی جرأت اور دلیری کا ثبوت دیتے ہوئے تمام دانت اکھڑوا ڈالے اور سر کے بال کٹوادیئے۔ اگلی صبح وہ حسب وعدہ اس حالت میں جہاں گیر

کے پاس پہنچی کہ منہ دانتوں سے خالی ہے اور سر بالوں سے صاف۔ جہاں گیر اسے اس حالت میں دیکھ کر بہت نادم ہوا اور اس کے ساتھ انتہائی تعظیم سے پیش آیا۔

جاناں بیگم شوہر کی وفات سے کافی عرصہ بعد تک زندہ رہی اور وقار اور عزت سے زندگی بسر کی۔

وہ ہندوستان کے ممتاز ترین خاندان کی فرد ہونے کے باوصف دوسروں کے مقابلے میں خود کو حقیر جانتی تھی اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھاتی تھی جس سے کسی کو تکلیف پہنچنے کا احتمال ہو۔ اقتصاد و میانہ روی اس کا معمول تھا اور اسی صفت کی بنا پر ہر حلقے میں اسے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ قصر شاہی کی کسی خاتون سے اس کا کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ وہ غیبت سے مجتنب رہتی اور دوسرے کی برائی بیان کرنے سے احتراز کرتی۔ کسی کو مطعون ٹھہرانا اور کسی کی عیب جوئی کرنا اس کا شیوہ نہ تھا۔ اس خاتون نے ۱۰۷۰ھ (۱۶۵۹ء) میں وفات پائی۔

☆☆☆

جمانہ بنت مہاجرؒ

وہ خاتون صداقت جن کا شعار تھا اور جن کے خمیر میں حق گوئی داخل تھی۔

حضرت جمانہ بنت مہاجر بن خالد بن ولید کے حالات طیفور کی ''بلاغات النساء'' میں درج ہیں۔ یہ خاتون مشہور صحابی اور عہدِ اسلام کے ابتدائی دور کے معروف جنگ جو اور بہادر جرنیل حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی پوتی تھیں۔

ان کی ولادت مدینہ منورہ میں ہوئی۔ اس وقت ان کے دادا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ زندہ تھے۔ ان کی ولادت پر ان کے والدین نے نہایت مسرت کا اظہار کیا اور تمام رشتے داروں نے خوشیاں منائیں۔ والدین کو ہر طرف سے مبارکباد کے پیغام موصول ہوئے۔

حضرت جمانہ کو شجاعت و بہادری کے اوصاف ورثے میں ملے تھے، اس کے ساتھ ہی طیفور کے الفاظ میں یہ کانت من ربات الفصاحة والبلاغة یعنی ان کا شمار ان خواتین میں ہوتا تھا جو فصاحت و بلاغت میں یدِ طولیٰ رکھتی تھیں اور ادب و انشاء میں ممتاز تھیں۔ طیفور ان کی شجاعت کے بارے میں کہتا ہے وکانت فی الشجاعة مشهورة کہ وہ شجاعت میں مشہور تھیں۔ علاوہ ازیں صداقت و بے باکی اور صاف گوئی میں بھی ممتاز تھیں۔ بقول طیفور کانت صادقة اللهجة کہ صدق مقال اور راست گفتاری میں خاص شہرت کی مالک تھیں۔ طیفور نے ان کے بہت سے اوصاف بیان کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے حاضر جوابی اور فہم و فراست میں بھی وہ اپنے دور کی خواتین سے سبقت لے گئی تھیں۔

حضرت جمانہ بنت مہاجر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دور کی

خاتون تھیں۔ عبداللہ بن زبیر رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابی حضرت زبیر بن عوام کے فرزند ارجمند تھے اور حضرت زبیر عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ یعنی یہ وہ بلند بخت صحابی تھے جنھیں رسول اکرم ﷺ نے ان کی زندگی ہی میں جنت کی بشارت دے دی تھی۔ عبداللہ بن زبیر کا شمار بھی صحابہ کی مقدس جماعت میں ہوتا ہے۔ ان کی والدہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا تھیں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بہن تھیں۔ ان کی دادی رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

عبداللہ بن زبیر، آنحضرت ﷺ کے مدینہ منورہ میں ہجرت کر کے تشریف لانے کے بیس مہینے بعد پیدا ہوئے۔ وہ مدینہ منورہ میں مہاجرین کی پہلی اولاد تھے۔ ان کی ولادت سے مہاجرین میں انتہائی مسرت کا اظہار کیا گیا، کیونکہ ہجرت کے بعد مسلمانوں کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اور مدینہ کے یہودیوں نے مشہور کر دیا تھا کہ اب مسلمان اولاد سے محروم رہیں گے، ہم نے ان کو جادو کر دیا ہے، مسلمانوں کے گھر یہ لڑکا پیدا ہوا تو قدرتی طور پر انھوں نے خوشیاں منائیں اور عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح مسلمانوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اسی طرح یہودیوں کو اس سے افسوس ہوا۔ پیدا ہوتے ہی انھیں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لایا گیا اور آپ نے اپنے منہ سے کھجور چبا کر ان کے حلق کو لگائی۔

حضرت عبداللہ بن زبیر بہت سے اوصاف کے حامل تھے۔ حضرت معاویہ کی وفات کے بعد ہی مکہ مکرمہ میں انھوں نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا تھا۔ انھوں نے یزید کے عہد حکومت میں مکہ مکرمہ میں بھی ان کی حکومت قائم نہیں ہونے دی۔ یزید کی موت کے بعد انھوں نے لوگوں سے بیعت خلافت لی اور بہت جلد شام کے بعض مقامات کے علاوہ انھیں تمام عالم اسلامی کا خلیفہ تسلیم کیا گیا۔

بہر حال وہ اولوالعزم، شجاع، دور اندیش، معاملہ فہم، حساس، مسلمانوں کے بھی

خواہ اور بلند سیرت انسان تھے۔ وہ حالات کے تقاضوں سے آگاہ اور عظیم الشان شخصیت کے مالک تھے۔ تمام مسلمانوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔ ایک روز جمعہ کے دن مکہ مکرمہ میں منبر پر کھڑے خطبہ دے رہے تھے کہ جمانہ بنت مہاجر نے انھیں دیکھ لیا۔ قریب آئیں اور کہنے لگیں: اے رفیع المرتبت انسان! پورا عالم اسلام تیرے لئے اللہ کے حضور دست بدعا ہے، تیری نیکیوں کا پلڑا بھاری اور برائیوں کا پلڑا خالی ہے، تمھیں نہ بنوامیہ خوف زدہ کر سکتے ہیں اور نہ ان کے حواری تیری فتح مندیوں کا راستہ روکنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ تو دشمن کے لئے شمشیر خاراشگاف کی حیثیت رکھتا ہے اور تیری ہمتوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔

عبداللہ بن زبیر جمانہ کی پوری بات نہ سن سکے، کیونکہ وہ ان سے دور تھیں۔ کسی نے قریب آکر انھیں بتایا کہ جمانہ نے آپ کو مخاطب کر کے یہ الفاظ کہے ہیں۔ منبر سے اترے اور جمانہ کو بلا کر کہا:

اے عظیم القدر دادے کی بہادر پوتی! کیا کہہ رہی ہو؟

کہنے لگیں: امیر المومنین! حق آپ کی زبان پر جاری ہوگیا ہے، آپ کو گھبرانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اللہ کی نصرت آپ کے ساتھ ہے، وہی شخص کامیاب رہے گا جو آپ کو سچا سمجھے گا اور آپ کی مساعی کی تائید کرے گا۔ آپ ان اسلاف کے بلند مرتبت خلیفہ ہیں جنھوں نے اسلام کی ترقی اور دین کی ترویج واشاعت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ جن لوگوں نے آپ کی مخالفت شروع کر رکھی ہے اور آپ کے درپے آزار ہیں وہ ناکام ونامراد رہیں گے اور ان کی تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ عین ممکن ہے آپ کو اللہ کی راہ میں جامِ شہادت نوش کرنا پڑے، مگر یقین جانیے آپ کے دشمنوں کو ہمیشہ ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا اور انھیں حقارت سے یاد کیا جائے گا۔ آنے والی نسلیں آپ کو خراجِ تحسین پیش کریں گی اور آپ کی کوششوں کو بہتر الفاظ سے یاد کریں

گی۔ جولوگ آپ سے غلط برتاؤ کررہے ہیں انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گی۔

عبداللہ بن زبیر نے کہا، جمانۃ میں اللہ کا ایک حقیر ترین بندہ ہوں۔ میری تگ ودو کا مقصد محض رضائے الٰہی اور اللہ کے دین کی خدمت ہے۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور خلافت کا یہ سلسلہ برے ہاتھوں میں نہ رہے بلکہ اس میں نیک لوگوں کا عمل دخل ہو۔ یہ اللہ کی ایک امانت ہے جو ہمارے سپرد کی گئی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس میں خیانت نہ کریں، لوگوں کو مشکلات میں نہ ڈالیں، خدا کی نافرمانی نہ کریں اور اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے رہیں۔ اگر ہم نیکی کی طرف رجوع کریں گے اور شر کے ارتکاب سے اپنے آپ کو بچا کر رکھیں گے تو اللہ کی مدد ہمارے شامل حال ہوگی اور ہم فوز وفلاح سے سرفراز ہوں گے، اور اگر ہم اللہ کے احکام کو ماننے سے انکار کریں گے تو سخت سزا کے مستحق قرار پائیں گے اور ذلت وخواری ہمارا مقدر بنے گی۔

جمانہ بولیں: امیر المومنین! آپ اللہ کے دین کے حامی ہیں اور ہم آپ کے معاون ہیں۔ آپ مسلمانوں کے بارے میں عفو ودرگزر سے کام لیجئے اور مخالفوں کے ساتھ سختی کا مظاہرہ کیجئے، لوگوں کے طعن نہ آپ کی عزت کو گھٹا سکتے ہیں اور نہ آپ کے راستے میں رکاوٹ ڈال سکتے ہیں۔ قریش کو خوب معلوم ہے کہ آپ ان میں سب سے زیادہ عابد، سب سے زیادہ شجاع، سب سے زیادہ فہیم اور سب سے زیادہ متقی ہیں۔ انھیں آپ کی مدد کو آنا چاہئے اور آپ جو مقصد لے کر میدان میں اترے ہیں، اس میں آپ سے تعاون کرنا چاہئے۔

بہرحال حضرت جمانہ بنت مہاجر بن خالد بن ولید (رحمۃ اللہ علیہم) نہایت فصیح اللسان بہادر خاتون تھیں۔ کسی قسم کے خوف وخطر کا احساس نہ کرتی تھیں۔ صداقت ان کا شعار تھا اور حق گوئی ان کے خمیر میں داخل تھی۔

☆☆☆

حسنہ عابدہ

وہ خاتون جنھوں نے شادی کے لئے شرط لگائی تھی کہ مجھے ایسا شوہر چاہئے جو عبادت میں پکا ہو اور مجھے دنیا کی کوئی تکلیف نہ دے۔ اور اسے ایسا شوہر نہ مل سکا۔

خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانۂ خلافت میں جو شہر آباد کئے گئے، ان میں بصرہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ شہر جسے ایک مضبوط فوجی چھاؤنی کی حیثیت حاصل تھی ۱۴ھ میں آباد کیا گیا اور اس کی آبادی وغیرہ کے تمام انتظامات پر حضرت عمرؓ نے عتبہ بن غزوان کو متعین کیا جو آٹھ سو افراد کو ساتھ لے کر خربیہ کے مقام پر پہنچے، جہاں آج کل بصرہ آباد ہے۔ اس سے پہلے یہ ایک صحرا اور کف دست مقام تھا۔ یہ کنکریلی زمین تھی اور آس پاس پانی اور چارے کا وافر سامان موجود تھا، جو عربوں کی طبیعت اور مزاج کے عین مطابق تھا۔ پھر حضرت عمرؓ نے ایک اور شخص عاصم بن دلف کو اس کام پر مقرر کیا کہ جہاں عرب کے جس قبیلے کو اتارنا مناسب ہو، اتاریں اور کسی کو تکلیف نہ ہونے دیں۔ عام مکانوں کے علاوہ اس شہر میں سرکاری عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ ایوانِ حکومت بنایا گیا۔ مختلف دفاتر قائم کئے گئے۔ قید خانہ تیار کیا گیا، بہترین جامع مسجد تعمیر کی گئی، فوجی بارکیں بنائی گئیں اور دیگر ضروری امور کا پورا خیال رکھا گیا اور روزانہ کی ضرورت کی تمام چیزیں بطریق احسن مہیا کی گئیں۔

بصرہ میں عظیم المرتبت محدث بھی آباد تھے اور جلیل القدر فقیہ بھی، زاہد شب زندہ دار بھی تھے اور نامور سپاہی اور فوجی بھی، اصحاب نحو بھی فروکش تھے اور ارباب علم وفن بھی، بلند مرتبہ شاعر بھی قیام فرما تھے اور ماہرین لغت بھی۔ غرض ہر قسم کے لوگ اس شہر

میں موجود تھے۔

پھر متعدد علوم کا آغاز اسی شہر سے ہوا، مثلاً علم نحو، موسیقی اور عروض کی ابتدا بصرہ ہی سے ہوئی اور اسے ان علوم کا مرکز قرار دیا گیا۔

صلحاء اور زہاد بھی بہت بڑی تعداد میں اس شہر میں پیدا ہوئے اور اس کی طرف ان کا انتساب ہوا، مثلاً حسن بصری اور رابعہ بصریہ جیسے عظیم القدر بزرگ اسی شہر سے تعلق رکھتے تھے۔ لطف کی بات یہ کہ اگرچہ مختلف ذہن وفکر کے لوگوں کے جمع ہونے کی وجہ سے اس شہر کا رنگ روپ بدل گیا تھا اور حضرت عمرؓ ہی کے زمانے میں اس کی حالت میں تبدیلی کے آثار نمودار ہو گئے تھے، مگر بایں ہمہ واقعہ یہ ہے کہ علوم وفنون اور زہد وتقوی کا جوزور اس شہر میں رہا، اسے اپنی جگہ بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں کے لوگ بدرجہ غایت نیک تھے اور حد درجہ کے عابد وزاہد تھے۔ حضرت حسنہ عابدہ رحمۃ اللہ علیہا اسی شہر سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ ایک ایسے خاندان کی فرد تھیں جو مکہ مکرمہ سے آکر یہاں آباد ہوا تھا۔ یہ خاتون جہاں زہد وعبادت اور تقوی وصالحیت میں عدیم المثال تھیں، وہاں علم وفضل میں بھی فقید النظیر تھیں۔ دور دراز سے آکر لوگ ان کی خدمت میں حاضری دیتے اور ان کے خیالات وافکار سے مستفید ہوتے۔

ان پر اس درجہ زہد وتقویٰ کا غلبہ تھا کہ دنیا کی تمام نعمتوں سے کلیۃً دست کش ہو گئی تھیں اور پوری توجہ عبادت پر مرکوز کر دی تھی۔ دن کو روزہ رکھتیں اور رات کو مصلی پر بیٹھ کر اللہ کی عبادت کرتیں۔ انھوں نے اپنے گھر میں کوئی ایسی چیز نہ رہنے دی جوان کے خیال میں عبادت کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہو۔

کہتے ہیں یہ خوب صورت خاتون تھیں۔ شادی نہیں کی تھی اور ان کا کام صرف اللہ کی عبادت تھا۔ ان کے حالات جو ''صفوۃ الصفوہ'' میں ابن جوزی نے لکھے ہیں، ان میں مرقوم ہے کہ ایک دفعہ انھیں شاید پیاس لگی، مگر گھر میں نہ پانی تھا اور نہ کوئی برتن، جس

سے کچھ کھایا یا پیا جا سکے۔ مکان سے تھوڑے فاصلہ پر نہر بہتی تھی۔ یہ پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر نہر کی طرف دوڑیں اور کنارے پر بیٹھ کر پانی پینے لگیں۔ جب اوک میں پانی ڈالا اور منہ کو لگایا تو اچانک ایک عورت آ گئی جو انھیں اچھی طرح جانتی تھی۔ اس عورت نے ان کے حسن و جمال اور بے چارگی کو دیکھ کر رحمت و شفقت کے انداز سے کہا:

''آپ شادی کر لیجئے''۔

بولیں! ''تم جانتی ہو، میں کس طبیعت کی مالک ہوں اور میرے خیالات کس قسم کے ہیں''۔

عورت نے جواب دیا: میں آپ سے خوب واقف ہوں اور آپ کی طبیعت کے تمام گوشوں سے آگاہی رکھتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے آپ کون ہیں اور آپ کے شب و روز کس طرح گزرتے ہیں۔

کہنے لگیں: اگر تم مجھ سے واقفیت رکھتی ہو تو پھر زیادہ بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں شادی کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ میرے لئے کوئی ایسا مرد مہیا کر دو جو زہد و عبادت میں پکا ہو اور مجھے دنیا کی کوئی تکلیف نہ پہنچائے۔

عورت نے کہا: ایسے مرد کا ملنا تو بہت مشکل ہے، بلکہ کہنا چاہئے کہ اس دور میں ناممکن ہے۔

بولیں: میرا خیال بھی یہی ہے کہ ان اوصاف کا حامل مرد نہیں مل سکے گا۔

عورت نے کہا: تو آپ کسی کم درجے کے آدمی سے شادی کر لیجئے اور دنیا کی ان مصیبتوں سے نجات حاصل کیجئے۔

کہا: مجھے یقین ہے کہ میرے لئے تم میرے شعار کا شوہر حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکو گی۔ میں سچ کہتی ہوں کہ میرے دل میں یہ چیز نہیں ہے کہ میں وقتی منافع پر نظر رکھوں اور اس دنیائے فانی میں اپنے آپ کو الجھا لوں۔ میں کسی دنیادار مرد سے

کبھی کوئی دنیوی مفاد حاصل کرنے کی تمنا نہیں رکھتی۔ میں نے اپنے آپ کو اللہ کی تحویل میں دے دیا ہے اور چاہتی ہوں کہ میرے لیل ونہار اسی کی یاد اور عبادت میں بسر ہوں۔

اس عورت نے کہا: آپ کے خیالات بہت بلند ہیں اور آپ کا مطمح نظر سب سے مختلف ہے۔ آپ نے دنیا کو ترک کر کے آخرت کو متاعِ اصلی قرار دے دیا ہے، خدا آپ کو یہ خیالات اور یہ بلند نقطۂ نظر مبارک کرے۔

بولیں: میں شادی سے گریزاں نہیں ہوں، اگر تم کوئی ایسا شخص پاؤ جو خود بھی اللہ کے خوف سے گریہ وزاری کرتا ہو اور مجھے بھی یہی تعلیم دے، خود بھی روزے رکھے اور مجھے بھی روزہ دار رہنے کی تلقین کرے، خود بھی رات کو جاگ کر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو اور مجھے بھی یہی حکم دے، خود بھی اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے اور مجھے بھی شاکر رہنے کا درس دے، خود بھی صدقہ وخیرات کرے اور مجھے بھی یہی تعلیم دے، تو میں ایسے شخص سے شادی کرنے کو تیار ہوں اور اگر ایسا شخص نہ مل سکے تو میرا مردوں کو دور سے سلام۔

یہ بصرہ کی عظیم الشان خاتون تھیں اور مستجاب الدعوات تھیں۔ اللہ ان کی دعاؤں اور دعاؤں کو شرف قبول بخشتا تھا۔ دور دور سے لوگ ان کی خدمت میں مختلف امور متعلق دعا کی درخواستیں لے کر حاضر ہوتے اور اللہ ان کی مخلصانہ دعائیں قبول فرماتا۔

ان کے والدین اور رشتے دار بھی نہایت نیک اور عبادت وزہد میں بے مثل تھے۔ انھیں کسی کے کسی کام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کا اوڑھنا بچھونا محض یادِ الٰہی تھا۔

یہ خاصی بڑی عمر کو پہنچ کر فوت ہوئیں۔ ان کے جنازے میں بصرہ کے بے شمار لوگوں نے شرکت کی، اگرچہ اس زمانے میں آمد ورفت اور پیغام رسانی کی زیادہ سہولتیں حاصل نہ تھیں اور حمل ونقل کے ذرائع محدود تھے، پھر بھی تیزی کے ساتھ گرد ونواح میں ان کی وفات کی خبر پہنچ گئی اور بصرہ کے قریبی قبائل اور دیہات کے بہت سے لوگ ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔

☆☆☆

ہند بنت عتبہ

ایک بہادر خاتون جس کے اندر قومی عصبیت بھی تھی اور ہمدردی و رواداری کا جذبہ بھی۔

ہند عرب کی ایک جرأت مند اور بلند حوصلہ خاتون تھی۔ باپ کی طرف سے اس کا سلسلۂ نسب یہ ہے: ہند بنت عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس بن عبد مناف اور ماں کی طرف سے یہ ہے: ہند بنت صفیہ بنت اسید بن حارثہ بن اوقص بن مرہ بن بلال۔

ہند بڑی فہیم وذی شعور خاتون تھیں۔ اسد الغابۃ میں لکھا ہے کہ:

وہ ایک خوددار، باحمیت وغیرت مند، صائب الرائے اور نہایت ذی فہم عورت تھیں۔

اس کا پہلا نکاح فاکہہ بن مغیرہ مخزومی سے ہوا تھا، لیکن کسی وجہ سے یہ ازدواجی تعلق قائم نہ رہ سکا تو دوسرا نکاح ابوسفیان بن حرب سے ہوا، جس سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔

ہند کا باپ عتبہ، شوہر ابوسفیان اور خود ہند اسلام اور رسول اکرم ﷺ سے شدید عداوت رکھتے تھے: ابوجہل اس گروہ کا قائد تھا۔ اس کی قیادت میں یہ لوگ مسلمانوں کو مبتلائے مصائب کرنے میں کوئی دقیقۂ سعی فروگزاشت نہ کرتے۔ جب ابوجہل میدانِ بدر میں مارا گیا تو مشرکین وکفار کا یہ گروہ ابوسفیان کی قیادت میں مسلمانوں کے خلاف سرگرم عمل ہوگیا اور بدر میں ہزیمت اٹھانے کے بعد ان کا جوشِ انتقام اور بھڑک اٹھا۔ ۳ ہجری میں جنگ احد کا واقعہ اسی جذبۂ انتقام کا نتیجہ تھا۔ اس جنگ میں لشکر کفار کے

ساتھ ہند بھی شامل تھی جو مسلمانوں کے خلاف سخت نفرت وعداوت کا جذبہ رکھتی تھی ۔لڑائی کے موقعے پر یہ رجزیہ اشعار پڑھتی اور مخالفین اسلام کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف حقارت ودشمنی کے جذبات پیدا کرتی رہی ۔ جنگ احد سے ایک سال پیشتر جنگ بدر میں ان کا باپ عتبہ رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مارا گیا تھا، اس لئے اس کا جوشِ انتقام انتہائی تیز تھا، بالخصوص حضرت حمزہ سے نہایت دشمنی کا اظہار کرتی تھی اوراس تاک میں تھی کہ موقع ملے تو حمزہ کا کام تمام کردیا جائے ۔

اس کام کی تکمیل کے لئے اسی کی نظر وحشی پر پڑی ۔ وحشی ایک شخص جبیر بن مطعم کا غلام تھا۔ ہند نے اس سے وعدہ کیا کہ اگر وہ حمزہ کو قتل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو اس کو آزاد کرادیا جائے گا۔ وحشی فن حربہ اندازی میں بہت تیز اور پوری مہارت رکھتا تھا۔ موقع کا منتظر رہا، جوں ہی حضرت حمزہ اس کے داؤ میں آئے ،اس نے حربہ پھینکا جوان کی ناف میں پیوست ہوکر جسم کے دوسری طرف نکل گیا۔ حضرت حمزہ نے آگے بڑھ کر وحشی پر تلوار کا وار کرنا چاہا، مگر زخم اتنا کاری تھا کہ قدم لڑکھڑا گئے اور وہ چکرا کر زمین پر گر پڑے۔ گرتے ہی روح اور جسم کا رشتہ منقطع ہوگیا۔

ہند جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے خلاف شدید منتقمانہ جذبات رکھتی تھی ،حمزہ کو زمین پر گرتے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑی اوران کی لاش پر آ بیٹھی ۔ اس موقعے پر اس نے انتہائی سنگ دلی اور قساوتِ قلبی کا مظاہرہ کیا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کا مثلہ کیا یعنی اس کے ناک اور کان کاٹ دیئے اوران کا ہار بنا کر گلے میں ڈالا ۔ پھراسی پر بھی اکتفا نہیں کیا، اس سے بھی بڑھ کر یہ کیا کہ ان کا پیٹ چیر کر کلیجہ نکالا اور جوشِ عصبیت اور فرطِ غضب سے کلیجہ چباڈالا ،مگر حلق سے نیچے نہ اتر سکا تو مجبوراً اگل دیا۔

یہ المیہ انتہائی دل خراش اور بہ درجہ غایت اذیت رساں تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے حقیقی چچا کے ساتھ یہ بہیمانہ اور وحشیانہ سلوک کیا گیا، جو آپ کے بہت بڑے معاون

اور مددگار تھے۔ نہایت جری اور شجاع تھے۔ ہر موقعے پر آپ کا ساتھ دیتے تھے، مخالفین اسلام ان سے لرزاں رہتے تھے، کیونکہ حمایتِ حق کے ہر مقام پر وہ پیش پیش رہتے تھے۔ ان کی شہادت اور پھر لاش کے ساتھ اس قسم کا غیر انسانی سلوک رسول اللہ ﷺ کے لئے انتہائی موجبِ اذیت تھا۔

وقت گزرتا گیا تا آنکہ شہادت حمزہ یعنی جنگ احد سے پانچ سال بعد ۸ ہجری میں فتح مکہ کا واقعہ رونما ہوا۔ مسلمان فوز وفلاح اور فتح وکامرانی کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے۔ یہ وقت بھی بڑا عجیب منظر پیش کرتا تھا۔ کفار مکہ یا تو مکہ سے بھاگ کھڑے ہوئے یا پھر دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے۔ ہند کے دل میں بھی انقلاب وتغیر کی ایک پر جوش لہر اٹھی اور اس کی زندگی کو ایک نئے موڑ پر ڈال گئی، یعنی اسلام اور پیغمبر اسلام کی ایسی سخت ترین دشمن خاتون ہند کا دل نور اسلام سے جگمگا اٹھا۔ وہ دوسری عورتوں کے ساتھ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئیں، مگر اس حالت میں کہ عورتوں کے جھرمٹ میں چھپی ہوئی تھیں اور چہرے پر نقاب ڈال رکھا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ کوئی پہچان نہ سکے اور اپنی خلافِ اسلام سرگرمیوں پر کسی کے سامنے اظہارِ ندامت نہ کرنا پڑے، تاہم آنحضرت نے پہچان لیا۔ بیعت کا وقت آیا تو رسول اکرم ﷺ کے ساتھ نہایت دلیری سے ہم کلام ہوئیں۔ بولیں:

یارسول اللہ! آپ ہم سے کن کن باتوں کا اقرار لیں گے؟

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: اس بات کا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

بولیں: یہ شرط آپ نے مردوں پر تو عائد نہیں کی، تاہم ہمیں منظور ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ کہ چوری نہ کرو۔

ہند بولیں میں کبھی کبھار اپنے شوہر کے مال سے کچھ خرچ کرلیا کرتی ہوں، معلوم نہیں یہ جائز ہے یا ناجائز؟

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔

ہند نے جواباً کہا: ہم نے تو اپنی اولاد کو بچپن سے پالا تھا، لیکن جب بڑے ہوئے تو آپ نے انھیں بدر میں قتل کر ڈالا۔

رسول اللہ ﷺ کا دامنِ رحمت نہایت وسیع تھا۔ ہند کی گزشتہ تمام حرکات اور سرگرمیاں آپ کے سامنے تھیں۔ مگر پیشانی پر غصے کی کوئی شکن نمودار نہیں ہوئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہند سچے دل سے دائرہ اسلام میں داخل ہو گئیں اور بغیر کسی جھجک اور خوف ملامت کے آنحضرت ﷺ کی صداقت وحقانیت کا اعلان کیا۔ وہ اسی مجلس میں بے ساختہ پکار اٹھیں۔

یارسول اللہ! آج سے پہلے کوئی شخص آپ سے زیادہ میرے نزدیک قابلِ نفرت اور لائقِ عداوت نہ تھا، مگر آج کے بعد کوئی شخص مجھے آپ سے زیادہ محبوب نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے بیعت کے بعد حضرت ہند رضی اللہ عنہا واپس گھر پہنچیں تو یکسر بدل چکی تھیں اور اسلام نے ان کے اندازِ حیات میں ایک عظیم انقلاب بپا کر دیا تھا، گھر جاتے ہی بتوں کو توڑ دیا اور کہا کہ اب تک ہم تمہاری وجہ سے گم راہی کے عمیق گڑھے میں گرے ہوئے تھے۔

ہند نہایت بہادر خاتون تھیں۔ اسلام کے خلاف باقاعدہ جنگوں میں شریک ہوتی تھیں۔ قبولِ اسلام کے بعد بھی بہادری کی اس روایت کو پورے اہتمام سے اس طرح قائم رکھا کہ اب وہ اسلام کی حمایت اور کفر کی مخالفت میں سرگرم عمل تھیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ابتدائی زمانہ خلافت میں علاقہ شام کی مشہور لڑائی جنگ یرموک لڑی گئی تو حضرت ہند رضی اللہ عنہا اس میں شامل تھیں اور رجزیہ اشعار پڑھ کر مسلمانوں میں جذبہ وجوش پیدا کرتی تھیں۔ ان کے شوہر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ بھی اس جنگ میں

شریک تھے۔ ہند بہت بڑی شاعرہ، نہایت فیاض اور لوگوں کی مددگار تھیں۔

سیرت ابن ہشام میں مذکور ہے کہ ہجرتِ نبوی کے بعد جب نبی ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب نے مکے سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ کی تیاری کی تو ہند ان کے پاس آئیں اور کہا:

"اے دخترِ محمد (ﷺ) تم اپنے باپ کے پاس مدینے جا رہی ہو، اگر کچھ سامان سفر اور زادِراہ وغیرہ کی ضرورت ہو تو بتاؤ میں مہیا کر دوں گی"۔

اس سے پتا چلا کہ حالت کفر میں اور اسلام سے کھلی دشمنی کے باوجود ان میں روا داری اور ہم دردی کا جذبہ موجود تھا۔

حضرت ہند رضی اللہ عنہا کا انتقال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوا۔ یہ اسی دن فوت ہوئی تھیں۔ جس دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد محترم حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے وفات پائی تھی۔ بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت ہند کی وفات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوئی تھی۔ ان کی اولاد سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

☆☆☆

حضرت ام معبد خزاعیہ

ایک بدوی خاتون جس نے آپ ﷺ کا حلیہ بیان کرتے ہوئے فصاحت وبلاغت کا دریا بہادیا تھا۔

حضرت ام معبد خزاعیہ رضی اللہ عنہا ایک بدوی خاتون تھیں، جنھوں نے صحرا میں خیمہ لگا رکھا تھا۔ ان کے شوہر حضرت ابومعبد رضی اللہ عنہ بھی وہیں تھے۔ چند اونٹ اور بکریاں ان کا کل سرمایہ تھا اور بکریوں کا دودھ ان کی گزربسر کا اصل ذریعہ تھا۔ سرورِ کائنات ﷺ ہجرت کے موقع پر ان کے خیمے کے آگے سے گزرے تو چند لمحے وہاں بھی قیام فرمایا۔ آپ کے چند ارشادات سن کر حضرت ام معبد نہایت متاثر ہوئیں۔ اس وقت ان کے شوہر خیمے میں موجود نہ تھے۔ وہ آئے تو خالی برتنوں کو دودھ سے بھرے ہوئے پایا اور ام معبد سے پوچھا: یہ دودھ کہاں سے آیا؟

انھوں نے جواب دیا: ایک شخص کی برکت ویمن کا نتیجہ ہے جو ابھی ادھر سے گزرا ہے۔

انھوں نے تعجب سے سوال کیا، وہ ایسا کون بابرکت شخص ہے، ذرا اس کے بارے میں کچھ بیان تو کرو۔

اس پر ام معبد نے زبان کو حرکت دی اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں چند لمحوں میں جو کچھ معلوم ہوسکا تھا، اس طرح بیان کرنا شروع کیا کہ فصاحت وبلاغت کا دریا بہادیا۔ انھوں نے اپنے مافی الضمیر کا پوری روانی سے اظہار کیا۔ الفاظ نہایت جچے تلے اور ادب واحترام کے سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ ذیل میں ان کے عربی الفاظ کا

ترجمہ ملاحظہ ہو۔

میں نے ایک معزز شخص کو دیکھا جن کی نفاست نمایاں، چہرہ روشن اور خلق وبناوٹ میں حسن، نہ موٹاپے کا عیب، نہ دبلاپے کا نقص، خوش رو، خوب صورت، آنکھ کشادہ اور سیاہ، پلکیں لمبی، آواز میں کھنک، گردن صراحی دار، داڑھی گھنی، بھویں کمان دار اور جٹی ہوئی، خاموشی میں وقار کے مجسمہ، گفتگو میں صفائی اور دلکشی، سراپا حسن، جمال میں یگانۂ روزگار، دور سے دیکھو تو حسین ترین، قریب سے دیکھو تو شیریں ترین بھی اور جمیل ترین بھی، بات چیت میں مٹھاس، نہ زیادہ باتیں کریں اور نہ ضرورت کے وقت خاموش رہیں۔ گفتگو اس انداز کی جیسے پروئے ہوئے موتی، قد وقامت ایسا میانہ اور متوازن کہ جس میں نہ درازی ہے، نہ کوتاہی، اگر دو شاخوں کے درمیان ایک شاخ ہو تو وہ دیکھنے میں ان تینوں شاخوں سے زیادہ تر وتازہ دکھائی دے، قدر وقیمت میں سب سے بہتر نظر آئیں، ان کے کچھ جاں نثار بھی ساتھ تھے جو انھیں گھیرے ہوئے تھے۔ وہ بولتے تو سب خاموش ہو جاتے، کوئی حکم دیتے تو اس کی تعمیل کے لئے ٹوٹ پڑتے۔ سب کے مخدوم سب کے مطاع۔ ترش روئی سے پاک اور قابلِ گرفت باتوں سے مبرا۔

ابو معبد بولے: خدا کی قسم یہ شخص وہی قریشی معلوم ہوتے ہیں جن کا ذکر میں مکہ میں سن چکا ہوں، میں ارادہ بھی کر چکا ہوں کہ ان کی صحبت کا شرف حاصل کروں۔ اگر کوئی ذریعہ میسر آیا تو ضرور ان کی خدمت میں حاضری دوں گا۔

یہ عرب کی ایک بدوی خاتون کا انداز بیان ہے جس میں نبی ﷺ کے حلیہ مبارک اور سراپا کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اندازہ فرمایئے! کیا حسن کلام ہے، کیا فصاحت وبلاغت ہے، کیا ادبیت ہے، کیا زبان کا نکھار ہے۔

☆☆☆

حضرت امۃ اللہ بنت ابوبکرہ ثقفی

ایک گوشہ نشین خاتون جس کے قبول اسلام کا واقعہ بڑا دلچسپ اور عجیب وغریب ہے۔

حضرت امۃ اللہ بنت ابوبکرہ رضی اللہ عنہا ایک گوشہ نشین خاتون تھیں۔ عبادت وزہد کا پیکر، صالحیت کا سراپا اور حسن اخلاق وحسن طبیعت کا مجسمہ۔ بقول ذہبی رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت اسلام کی تھی۔ ان کے شاگردوں کی جماعت میں قتادہ بن ابومیمونہ جیسے عظیم الشان حضرات شامل ہیں۔

ان کے قبولِ اسلام کا واقعہ بڑا دلچسپ اور عجیب وغریب ہے۔ ان کی زندگی خالص قبائلی نوعیت کی تھی اور اسی ماحول میں طفولیت کی منزلیں طے کی تھیں۔ ایک روز اپنے قبیلہ بنوثقیف کی کسی خاتون سے ملنے گھر سے نکلیں، رات کا وقت تھا، فضا ساکن اور ماحول خاموش تھا۔ شب کی تاریکی پوری طرح پھیل چکی تھی۔ یہ ایک کم سن بچے کو ساتھ لئے تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھیں کہ ایک خیمے سے جو چاروں طرف سے بند تھا کچھ پڑھنے کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ پڑھنے والے کا لہجہ اتنا دلکش تھا اور آواز میں اس درجہ لوچ اور جاذبیت تھی کہ اس نے وہیں ان کے قدم روک لئے، وہ قرآن کی ایک سورہ تھی جس کی تلاوت ہورہی تھی، امۃ اللہ سن رہی تھیں اور بے حال ہورہی تھیں۔ اس قسم کا پیارا کلام نہ کبھی سنا تھا اور نہ فکر وخیال کے کسی گوشے میں آیا تھا۔ انھوں نے اس دنیا کی ناپائیداری اور آخرت کی دوامی زندگی کے بارے میں سنا تو بالکل بے بس ہوگئیں اور آکر وہیں بیٹھ گئیں۔ خیمے کے اندر سے مسلسل تلاوتِ قرآن کی آواز آرہی تھی اور یہ سن رہی تھیں۔ اتنے میں بچہ بھی جو حیرت واستعجاب کے عالم میں ڈوبا ہوا تھا، سوگیا۔ اب

حضرت امۃ اللہ نے بچے پر ایک کپڑا ڈالا اور خود خیمے کے اردگرد چکر کاٹنے لگیں۔ جدھر جاتی ہیں خیمے کو بند پاتی ہیں۔ شب کی تاریکی تیزی سے بڑھ رہی ہے تا آنکہ رات تابہ کمر پہنچ گئی ہے، مگر قرآن کی آیات برابر پردۂ سماع سے ٹکرا رہی ہیں اور قاری بعض آیات کی بہ تکرار تلاوت کر رہا ہے۔ اتنے میں ان کے بھائی کی آنکھ بھی کھل گئی۔ اس نے اٹھ کر دیکھا تو بہن کی چارپائی خالی ہے۔ وہ گھبرا کر باہر نکلا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن بہن کا کچھ پتا نہ چلا۔ اب بھائی کو باہر نکلے اور بہن کی تلاش کرتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی اور رات کے اندھیرے نے خود اپنے اندر ایک روشنی سی پیدا کر دی تھی۔ اس روشنی کی مدد سے بھائی نے جو لمبی نظر دوڑائی تو دور کے ایک خیمے کے اردگرد ایک سایہ حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس سائے کی طرف بڑھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا خیمے کے قریب آ گیا اور دوسری طرف خیمے کے قریب کھجور کے درخت کے تنے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ بچہ کپڑا اوڑھے لیٹا ہوا ہے، اندر سے کچھ پڑھنے کی آواز آ رہی ہے اور وہ سایہ جو دور سے متحرک نظر آ رہا ہے، وہ اس کی بہن امۃ اللہ ہے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر جذب و شوق کے عالم میں ڈوبی ہوئی خیمے کے اردگرد چکر کاٹ رہی ہے۔ بھائی نے آواز دی:

امۃ اللہ!

لیکن وہ خاموش تھیں۔

اس نے پھر آواز دی۔ اب بھی جواب نہ آیا تو وہ قریب گیا اور بہن کے دونوں شانوں کو ہلاتے ہوئے کہا:

امۃ اللہ یہاں کیوں کھڑی ہو اور کیا سن رہی ہو؟

بہن نے بھائی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دونوں خاموشی سے قرآن سننے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اس کلام کی عمدگی

اور حسنِ بیان پر تعجب کا اظہار کیا۔ بھائی آہستہ سے آگے بڑھا اور خیمے پر دستک دی۔ معاً پڑھنے کی آواز رک گئی۔ بھائی نے پھر دستک دی اور قاری سے باہر آنے کی درخواست کی۔ صحرا کا بدوی قاری باہر آیا اور اس بے وقت بلانے کی وجہ پوچھی۔ دونوں نے بہ یک وقت سوال کیا:

یہ کیا پڑھ رہے تھے؟ یہ کسی شاعر یا ادیب کا کلام تو نہیں ہو سکتا۔

بدوی نے جواب دیا:

یہ اللہ کا کلام ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے۔

پوچھا: وہ کون ہیں؟

کہا: مدینہ میں سکونت پذیر ہیں اور اللہ کے سچے پیغمبر ہیں۔

بہن اور بھائی نے اسی وقت کلمۂ شہادت پڑھا اور دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ چند روز کے بعد حضرت امۃ اللہ رضی اللہ عنہا نے مدینہ منورہ کا رخ کیا اور سرورِ کائنات فداہ ابی وامی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی سعادت حاصل کی۔

حضرت امۃ اللہ رضی اللہ عنہا نے مدینہ منورہ کی عورتوں سے کہا۔

اے جماعت خواتین! اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں بت پرستی سے نکلنے اور اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ تم اللہ کے سچے نبی محمد ﷺ کی امت میں شامل ہو، آپ کے احکام کی تابع رہو، آپ کی اطاعت ہی میں دین ودنیا کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ قرآن کی تلاوت کثرت سے کرو، جتنا زیادہ قرآن پڑھو گی اور سرورِ کائنات کے ارشادات پر عمل کرو گی، اسی قدر تمہارا دل روشن ہوگا اور فوز وکامرانی کی راہیں ہمارے لئے وا ہوں گی۔ حرص وطمع سے ہاتھ کھینچ لو، خدا کی راہ میں خرچ کرو اور مستحقین کی امداد کو اپنا شیوہ بنا لو۔

ان کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

☆☆☆
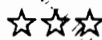
حضرت خلیدہ بنت قیس

ایک بلند منزلت خاتون جنھیں اسلام کی پاداش میں گوناگوں تکلیفیں پہونچائی گئیں مگر جبین استقلال پر کبھی کوئی شکن نمودار نہ ہوئی۔

خلیدہ بنت قیس بن ثابت بن خالد بن اشجع قبیلہ دہمان سے تعلق رکھتی تھیں۔ جلیل القدر صحابیہ تھیں۔ ان کا نکاح خاندان بنی سلمہ کے ایک شخص براء بن معرور انصاری سے ہوا تھا، جو قبیلہ خزرج کے خاندان بنوسلمہ کے رئیس تھے۔ یہ ان بلند منزلت خواتین میں سے ہیں جنھوں نے اپنا سب کچھ اسلام کی راہ میں قربان کردیا تھا، حتی کہ اپنی اولاد تک اللہ اور اس کے رسول کے سپرد کردی اور اس سلسلے میں جو تکلیفیں پہنچیں انھیں نہایت صبر اور استقلال سے برداشت کیا۔

قبولِ اسلام کے بعد ان کے اعزہ واقارب نے انھیں متنبہ کیا کہ اگر اسلام ترک نہ کیا اور بہ دستور محمد ﷺ کے حلقۂ اطاعت سے وابستہ رہیں تو تمھیں انتہائی اذیتوں میں مبتلا کیا جائے گا، اور لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کر دھوپ میں پھینک دیا جائے گا، اور صبح سے شام تک تپتی ریت میں لٹایا جائے گا۔ مگر اس پیکرِ استقلال اور سراپا عزیمت خاتون کے دل میں خوف کی قطعاً کوئی جنبش پیدا نہیں ہوئی اور خطرے کی کسی لہر نے ان کے اندر کروٹ نہیں لی۔ نہایت متانت سے کچھ اس قسم کے الفاظ میں گویا ہوئیں۔

”مجھے نہ دنیا کی کوئی پرواہ ہے، نہ اس کے آرام وآسائش اور مصائب و مشکلات کی۔ اگر کوئی حقیر وناپائیدار شے ہے تو وہ دنیا اور اس میں پیدا ہونے والی چیزیں ہیں۔ اب تک میری جو زندگی گزری ہے اس کی حیثیت ایک خواب سے زیادہ نہیں، جو

وقت گزر جاتا ہے اس کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور محض چند موہوم یادیں ذہن میں باقی رہ جاتی ہیں۔ تکلیفوں کا زمانہ بھی ماضی کی نذر ہو جاتا ہے اور سکون و آرام کے دن بھی شب و روز کی رفتار میں تحلیل ہو جاتے ہیں، دورِ گزشتہ کے کسی بڑے سے بڑے واقعہ پر بھی غور کریں وہ محض ایک خواب معلوم ہوتا ہے۔ جس وقت کوئی حادثہ پیش آ رہا ہو اس وقت بے شک اس کی تلخیوں کا احساس ہوتا ہے، لیکن جوں ہی وہ حادثہ حال سے نکل کر ماضی کی گرفت میں آیا، اس کی وقعت ختم ہو گئی اور اس کی تلخیاں ماضی کا ایک واقعہ بن کر رہ گئیں۔

تم مجھے قبولِ اسلام سے روکتے ہو اور اسلام کی وجہ سے مبتلائے مصائب کرنے کے درپے ہو۔ آخر مجھے کیا تکلیف پہنچاؤ گے، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے نتیجے میں جو تکلیف بھی آئے گی میں اسے اپنی بلند بختی پر محمول کروں گی اور ہر اذیت خندہ پیشانی سے برداشت کروں گی۔ میں اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی تابعداری کا عزم کر چکی ہوں، اب مجھے کوئی لالچ، کوئی حرص، کوئی طمع اور کسی قسم کا ڈر اور خوف اس سے ہٹا نہیں سکتا اور کوئی بڑی سے بڑی شے بھی میرے لئے سدِّ راہ نہیں ہو سکتی۔ تم جتنے تیر آزمانا چاہتے ہو آزما دیکھو، سب ناکام رہیں گے اور اللہ کا جو رنگ مجھ پر چڑھ چکا ہے، یہی غالب رہے گا، اس کے مقابلے میں تمام رنگ ماند پڑ جائیں گے۔ اللہ ہی میرا حامی و ناصر ہے۔

چنانچہ یہی ہوا۔ حضرت خلیدہ بنت قیس رضی اللہ عنہا دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں تو انھیں انتہائی پریشان کیا گیا اور گوناگوں تکلیفیں پہنچائی گئیں، مگر اس عظیم المرتبت خاتون کی جبینِ استقلال پر کبھی کوئی شکن نمودار نہ ہوئی اور تادمِ واپسیں خدمتِ اسلام میں منہمک رہیں۔

حضرت خلیدہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو ایک بہت بڑا حادثہ بیٹے کی شہادت کا پیش آیا۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ۶ ہجری میں صلح حدیبیہ ہوئی اور اس سے تھوڑا عرصہ

بعد جنگ خیبر کا واقعہ پیش آیا۔ خیبر کا علاقہ بڑا زرخیز تھا اور یہودیوں کے قبضے میں تھا۔ یہودی اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے سخت ترین مخالف تھے اور ہر وقت آنحضرت اور مسلمانوں کے درپے آزار رہتے تھے۔ خیبر یہودیوں کے آٹھ قلعوں کا مجموعہ تھا۔ ان قلعوں کے نام یہ تھے۔

نطاۃ، شبق، ناعم، کتیبہ، وطیع، سلالم، قموص، جسے قلعہ ابی الحقیق بھی کہتے تھے اور قلعہ صعب بن معاذ۔ اس زمانے یہ نہایت مضبوط قلعے تھے اور خیبر کے مختلف علاقوں میں واقع تھے۔ زراعت، باغات اور کاشت کے علاوہ جنگی اعتبار سے یہ قلعے نہایت اہم تھے۔

خیبر کے یہ آٹھوں قلعے کس طرح فتح ہوئے اور کن کن صحابہ کرام کے ہاتھوں فتح ہوئے؟ یہ تفصیلات بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں، مگر ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ ان قلعوں میں قلعہ قموص بہت مستحکم تھا۔ اس کے فتح کرنے پر بیس روز کوشش کی گئی لیکن ناکامی ہوئی، آخر رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علَم عنایت فرمایا تو قلعہ فتح ہوا۔ فتح خیبر کے بعد یہ افسوس ناک حادثہ پیش آیا کہ خیبر کے ایک یہودی رہنما سلام بن مشکم کی بیوی زینت بنت حارث نے ایک بکری پکار کر رسول اللہ ﷺ کو بطور ہدیہ پیش کی۔ اس بکری کے گوشت میں زہر ملا دیا گیا تھا۔ یہودی کہتے تھے، اگر اس شخص (یعنی محمد ﷺ) نے گوشت کھا لیا تو اس کا اسی وقت خاتمہ ہو جائے گا اور ہم نجات پا جائیں گے۔ اگر یہ فی الواقع اللہ کے رسول اور نبی برحق ہیں تو گوشت نہیں کھائیں گے اور چکھ کر چھوڑ دیں گے۔

جب رسول اللہ ﷺ کو یہ زہر آلود گوشت پیش کیا گیا تو خلیدہ بنت قیس کے بیٹے بشر بن براء بن معرور بھی آپ کے ساتھ تھے۔ آپ نے گوشت چکھا اور تھوک دیا، لیکن حضرت بشر بن براء رضی اللہ عنہ نے لقمہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا اور اسے حلق سے نیچے اتار گئے، پھر اسی وقت وفات پا گئے۔ حضرت بشر کو بھی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس میں

زہر ملا ہوا ہے، مگر حضور کے سامنے تھوکنے کو سوء ادب سمجھا اور باوجود علم واحساس کے گوشت کھا گئے۔ اس واقعہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں اور اس عورت کو بلا کر پوچھا تو انھوں نے اقرار کیا اور کہا کہ ہم نے زہر اس لئے ملا دیا تھا کہ اگر آپ سچے ہیں اور اللہ کے پیغمبر ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا اور اگر آپ جھوٹے ہیں تو ہم آپ سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

کہنا یہ ہے کہ حضرت خلیدہ بنت قیس رضی اللہ عنہا نے راہِ اسلام میں بڑی قربانیاں دیں اور رسول اللہ ﷺ سے ان کی اولاد کو اتنا تعلق خاطر تھا کہ ان کے بیٹے حضرت بشر بن براء رضی اللہ عنہ بالعموم آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی زندگی کا خاتمہ بھی آنحضرت ﷺ کی رفاقت میں ہوا، اور پھر وہ رسول اللہ ﷺ کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ آپ کے سامنے تھوکنا گوارا نہ کیا اور جان دے دی۔

حضرت خلیدہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے زمانۂ ولادت اور وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

☆☆☆

ام مطاع اسلمیہ

ایک ادیبہ وشاعرہ بہادر خاتون جنھیں رسول اللہ ﷺ نے جنگ خیبر کے مال غنیمت سے ایک مجاہد مرد کے برابر حصہ دیا۔

حضرت ام مطاع رضی اللہ عنہا مدینہ منورہ کے نواح میں رہائش پذیر تھیں، شعر وادب کا خاص ذوق رکھتی تھیں، فہم مسائل میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ان کے حالات طبقات ابن سعد، اسد الغابۃ اور الاستیعاب میں بیان کئے گئے ہیں۔

عرب فصاحت وبلاغت میں ممتاز تھے اور ادب وشعر ان کا دل پسند موضوع تھا۔ عرب کے بدوی قبائل اور دور دراز علاقوں میں رہنے والے لوگ زبان کی نزاکتوں کا خصوصیت سے خیال رکھتے تھے اور اس سلسلے میں کسی لغزش کا شکار نہ ہوتے تھے۔ حضرت ام مطاع رضی اللہ عنہا بھی اس ضمن میں بڑی شہرت کی مالک تھیں اور اس موضوع سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کو صحت کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ ان کی زبان میں اثر اور کلام میں زور تھا۔ حشو وزوائد سے ان کی بات مبرا ہوتی۔

فیاض بھی بہت تھیں، ضرورت مند ان کے پاس آتے اور طالبِ امداد ہوتے۔ یہ سب کی امداد کرتیں، کوئی ان کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جاتا۔ جس دن کوئی حاجت مند ان کے دروازے پر دستک نہ دیتا تو خود جاتیں اور تلاش کر کے ان کی ضروریات کی تکمیل کرتیں۔ اس اعتبار سے غرباء کا سہارا اور محتاجوں اور مساکین کا مرجع تھیں۔ عورتیں بالخصوص حاجت روائی کے لئے ان سے رجوع کرتیں اور یہ ان کی امداد کے لئے کوشاں ہوتیں۔ بسا اوقات اپنی ضروریات روک کر ان کی ضرورتیں پوری کرتیں۔ غرض فیاضی وسخاوت میں مشہور تھیں۔

عادات واطوار میں بھی ان کی مثال نہیں ملتی۔سب سے حسن اخلاق سے پیش آتیں کسی کی تکلیف برداشت نہ کرتیں۔کذب بیانی کونہایت براسمجھتیں،صدق مقال ان کا شیوہ تھا۔کسی معاملے میں دوسرے کوتنگ نہ کرتیں۔مقروض کو پریشان نہ کرتیں، مفلوک الحال کے لئے آرام وسہولت کے مواقع مہیا کرتیں،حتی الامکان کسی کوشکایت کا موقع نہ دیتیں،کوئی خفگی کا اظہار کرتا تو محسوس نہ کرتیں،مظلوم کی امداد کو پہنچتیں اور ظالم کا ہاتھ ظلم کی طرف بڑھنے سے روکتیں،کسی کے خلاف دل میں بغض وعداوت کوجگہ نہ دیتیں اور غصے کی پرورش نہ کرتیں۔دوسرے کی امداد کا جذبہ ان کے اندراس قدر راسخ تھا کہ ایک مرتبہ ان کی بہن کا کسی عورت سے جھگڑا ہوگیا،جو معاملہ باعث نزاع تھا اس میں ان کی بہن برسرحق اور دوسری عورت غلطی پر تھی،لیکن معاملہ ان کے علم میں آیا تو انھوں نے بہن کے مقابلے میں اس عورت کی حمایت کی اور بہن کوسرزنش کی،بہن نے ہر چند سمجھانے اوراپنے آپ کوحق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی،مگرانھوں نے ایک نہ مانی اور بہن کواس سے معافی مانگنے پر مجبور کیا۔

حضرت ام مطاع رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کے ہجرتِ مدینہ کے بعد اسلام قبول کیا۔جب آنحضرت ﷺ مکہ سے مدینہ منورہ تشریف لائے تو مدینہ کے قرب ونواح کے قبائل میں اسلام پھیلنے لگا اور لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔جب ام مطاع کومعلوم ہواتو یہ بھی آنحضرت کی خدمت میں آئیں، اسلام قبول کیااور آپ سے بیعت ہوئیں۔

٦ہجری میں خیبر کی مشہور جنگ لڑی گئی،اس جنگ کومسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان فیصلہ کن معرکے کی حیثیت حاصل تھی۔حضرت ام مطاع رضی اللہ عنہا نے بھی اس جنگ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شرکت کی اوراہم خدمات انجام دیں۔اس جنگ میں انھوں نے مجاہدین کو پانی پلانے اورزخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کے فرائض انجام

دیئے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس موقعے پر انھوں نے متعدد خدمات انجام دیں اور انتہائی شجاعت کا ثبوت دیا، جس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت کی تقسیم میں انھیں مجاہد مرد کے برابر حصہ دیا، لیکن علامہ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں اس پر شبہے کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت ام مطاع رضی اللہ عنہا جنگ خیبر میں تو بے شک حاضر ہوئیں اور انھوں نے میدانِ جنگ میں خدمات بھی سرانجام دیں، لیکن اس میں شبہ ہے کہ آنحضرت نے مالِ غنیمت کی تقسیم میں ان کو مجاہد مرد کے برابر حصہ دیا۔ بہر کیف معاملہ کچھ بھی ہو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت ام مطاع رضی اللہ عنہا بہت سی خصوصیات کی مالک تھیں اور عورتوں میں ان کا درجہ بڑا بلند تھا۔ بارگاہِ رسالت میں بھی ان کو اہمیت حاصل تھی۔

راویہ حدیث کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بلند تھا اور اس باب میں ان کا مکان ایک مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ بعض حضرات نے ان سے احادیثِ رسول روایت کرنے کا شرف حاصل کیا۔ لوگ ان کی خدمت میں آتے اور احادیث روایت کرتے۔ روایتِ حدیث کے سلسلے میں عورتیں بہت بڑی تعداد میں ان کے پاس آتیں اور یہ ان سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتیں۔ ان کے شاگردوں اور راویانِ حدیث میں ان کی خادمائیں اور کنیزیں بھی شامل ہیں۔ ان کے مرد شاگردوں میں ابومروان ایسے مشاہیر کے نام بھی آتے ہیں۔

حضرت ام مطاع رضی اللہ عنہا کی وفات حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کے آخری دور میں ہوئی۔ جنازے میں جلیل القدر صحابہ نے شرکت کی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ان کی وفات کی خبر پہنچی تو فرمایا آج عورتوں سے علم رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

معاذہ غفاریہ

ایک بہادر خاتون جس نے امیر معاویہ کے دروازے پر دربان رکھنے کے معاملہ میں پوری دلیری کے ساتھ بات کی اور امیر معاویہ اس کی گفتگو سن کر نادم ہوئے اور معذرت طلب کی۔

حضرت معاذہ غفاریہ رضی اللہ عنہا اس قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں جس سے مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تعلق رکھتے تھے۔ اسد الغابۃ میں ابن اثیر نے ان کے حالات تحریر کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

ان کا شمار اپنے دور کی فاضل عورتوں میں ہوتا تھا، اور رسول ﷺ سے یہ بے حد انس اور محبت رکھتی تھیں۔ آپ کے ہر قول وحکم پر عمل کو ضروری قرار دیتی تھیں۔ جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کے فرمان اور عمل کا حوالہ دیتیں۔ عقل و دانش میں حصہ وافر پایا تھا۔ حضور کے ساتھ جنگ میں تشریف لے جاتیں اور مجاہدین کی خدمت کرتیں، مریضوں کی نگہداشت اور زخمیوں کی مرہم پٹی کے فرائض انجام دیتیں۔ اس میں انھیں بڑی مہارت حاصل تھی۔

کشادہ دست تھیں اور نادار لوگوں کا خیال رکھتیں۔ اگر غریب اور امیر کا جھگڑا ہوتا تو امیر کو غریب اور نادار پر رحم کے برتاؤ کی تلقین کرتیں۔ ایک مرتبہ کھجور کے باغ کے ایک ملازم کا مالک سے تنازعہ ہو گیا انھیں معلوم ہوا تو مالک کے پاس گئیں اور اسے اللہ کے غضب سے ڈرایا اور فرمایا:

جب یہ تمہارا کام کرتا ہے، تمہارے باغ کی نگرانی اور حفاظت کے فرائض

انجام دیتا ہے، کھجوریں اتارتا اور بازار میں فروخت کرتا ہے اور اس میں دیانت داری سے کام لیتا ہے، تو اس سے تلخ کلامی سے پیش آنے کا کیا مطلب؟ اگر تم اس پر ترس نہیں کھا سکتے اور اس سے مہربانی کا برتاؤ نہیں کر سکتے تو ڈانٹ ڈپٹ بھی نہ کرو اور اللہ کی گرفت سے ڈرو۔

صحابہ ان کی انتہائی تکریم کرتے اور عزت واکرام سے پیش آتے۔

حضرت معاذہ غفاریہ رضی اللہ عنہا عورتوں کے فرائض منصبی بیان فرماتیں اور انھیں نصیحت کرتیں کہ قول وعمل میں اللہ کی تابع فرمان رہیں۔ وہ فطرتاً سادگی پسند تھیں اور دنیوی جاہ وجلال اور شوکت وحشمت کے اظہار اور کروفر کی زندگی سے نفرت کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ مدینہ تشریف لائے تو کسی کام سے یہ ان کے ہاں گئیں۔ دروزے پر دربان نے روک لیا اور اندر جانے سے منع کیا، انھوں نے فرمایا معاویہ ہم ہی میں سے ایک فرد ہیں، ان کی ماں بھی عرب کی ایک عورت تھی اور باپ بھی عرب تھا اور اونٹ چراتا تھا، اگر معاویہ ایک منصب پر فائز ہو گیا ہے تو کیا ہوا، میں بہر حال اندر جاؤں گی اور معاویہ سے ملوں گی۔

دربان نے سختی سے اندر جانے سے روکا تو ان کی آواز غصے سے بلند ہو گئی۔

امیر معاویہ نے سن لیا کہ دربان ایک عورت سے الجھ رہا ہے اور اسے اندر آنے سے روکتا ہے، انھوں نے باہر نکل کر دیکھا تو حضرت معاذہ غفاریہ رضی اللہ عنہا دروازے پر کھڑی تھیں۔ انھوں نے احترام سے سلام کیا، انھیں اندر لے گئے اور تشریف لانے کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگیں۔

معاویہ کیا اب تم بڑے آدمی ہو گئے ہو تم اپنا ماضی بھول گئے، تم عرب کے رہنے والے ایک عام آدمی ہو، تم اب دروازے پر دربان مقرر کرتے ہو، تم نے جس نہج کی زندگی اختیار کر رکھی ہے، نہ وہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ سے مطابقت رکھتی ہے،

نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں اس نوع کی تکلفات کا سراغ ملتا ہے، نہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس کے عادی تھے، نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس اسلوب کو اپنایا اور نہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کبھی اس قسم کی باتیں کیں۔ یہ حضرات اس دنیا کے بہترین انسان تھے، ان سے مخالفین اسلام خوف زدہ رہتے تھے۔ ان کے صبح وشام یادِ خدا میں گزرتے تھے اور پوری دنیا ان سے مرعوب تھی۔ ان کے رعب کی وجہ ان کے دربان نہ تھے، نہ ان کا یہ پرتکلف معاشرتی انداز تھا، بلکہ ان کی نیکی، نرمی اور لوگوں کی بھی خواہی کا جذبہ تھا جو اللہ کی طرف سے انھیں ودیعت ہوا تھا۔ اگر وہ ان عادات وخصائل کے حامل ہوتے جن کے تم ہو، تو اسلام کی تبلیغ کی راہ میں شدید مشکلات پیش آتیں اور سخت رکاوٹیں حائل ہو جاتیں۔ تم اللہ سے ڈرو اور لوگوں کے میل جول کی راہ میں دربانوں کی ناقابل عبور دیواریں کھڑی نہ کرو۔

ان کی اس گفتگو سے حضرت معاویہ بہت نادم ہوئے اور ان سے معذرت طلب کی۔

کہنے لگیں معاویہ! تم اس وقت شام میں نہیں ہو۔ مدینہ میں مقیم ہو۔ تمہیں یہاں کے لوگوں کے ذہنی اور فکری رجحان کی رعایت رکھنا چاہیئے۔ اس شہر کے لوگوں نے خلفاء کے دروازوں پر کبھی دربان نہیں دیکھے، ان کی آنکھیں حکمرانوں کے شان وشکوہ سے ناآشنا ہیں۔ یہ سادہ معاشرے اور خیر کے عادی ہیں۔ تم مدینہ کا رخ کرو تو تکلفات کی دنیا کو شام ہی میں چھوڑ آیا کرو۔ ہم انہیں لوگوں کی عزت کرتے ہیں جو ہمارے جذبات کا خیال رکھتے ہوں، جو مساکین کو امیروں پر ترجیح دیتے ہوں اور جن کے دروازے دربانوں سے خالی ہوں۔

ان کی اس گفتگو سے متاثر ہو کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اپنے دروازے سے دربان ہٹا دیئے اور جب تک وہ مدینہ میں رہے بلا روک ٹوک ہر شخص کو

آنے جانے اور بات کرنے کی آزادی دے رکھی۔

حضرت معاذہ رضی اللہ عنہا کی سادگی اور حق گوئی کی وجہ سے ان کے عزت واحترام کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، وہ بڑی عزت سے پیش آئے۔

ان کی وفات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوئی۔ وفات سے کچھ عرصہ پیشتر کسی بیماری میں مبتلا ہوئیں۔ اس سے افاقہ ہوگیا، لیکن بعدازاں بیماری پھر عود کر آئی۔ کہا کرتی تھیں گزرے ہوئے دنوں پر نظر ڈالتی ہوں تو نیکی کی مقدار بہت کم دکھائی دیتی ہے، میں اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوں۔ اس کی رحمت کی فراوانیوں سے وہی لوگ مایوس ہوتے ہیں جن کا ایمان کمزور ہو، تاہم اس کا کیا کروں کہ برائیوں کا پلڑا بھاری اور نیکیوں کا ہلکا دکھائی دیتا ہے۔ اللہ کی رحمت کے سوا میرا کوئی سہارا نہیں۔

بیٹوں اور ایک بھائی نے انھیں قبر میں اتارا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو کئی روز کے بعد موت کی اطلاع پہنچی تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور دعاء مغفرت کی۔ عامل مدینہ کی وساطت سے بھائی اور بیٹوں کو تعزیت کا پیغام بھیجا۔

☆☆☆

ام مغیث

مشہور خطیبہ خاتون جو بڑے بڑے مجمعوں میں زوردار اور موثر تقریریں کرتی تھیں اور انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قبلتین کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے۔

الاستیعاب (ابن عبدالبر) میں مرقوم ہے کہ حضرت ام مغیث رضی اللہ عنہا مدینہ کی ان خواتین میں سے تھیں جو روایتِ حدیث کا خاص ذوق اور شوق رکھتی تھیں۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے کئی احادیث روایت کیں اور پھر انھیں یہ سعادت بھی حاصل ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ قبلتین (یعنی بیت المقدس اور کعبۃ اللہ) طرف منہ کر کے نماز ادا فرمائی۔

یہ عرب کی ان عورتوں میں سے تھیں جو تقریر اور زورِ بیان میں شہرت رکھتی تھیں۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ بڑے بڑے مجمعوں میں زوردار اور موثر تقریر کرتیں اور ان کی سلاست و روانی اور فصاحت و بلاغت پر لوگ حیران ہو ہو جاتے۔ گفتگو میں تیز تھیں، مگر مدبرانہ انداز اختیار کرتی تھی۔ اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے دلائل مہیا کرنا ان پر ختم تھا۔ نپے تلے جملے اور عمدہ الفاظ استعمال کرتیں اور جو بات زبان سے نکالتیں پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ نکالتیں۔ اگر اپنی بات میں کوئی کم زور پہلو محسوس کرتیں تو اسے مزید دلائل سے مزین کرنے کی سعی کرتیں۔ زمانۂ اسلام میں ان کے انداز وخطابت نے اور بھی ترقی کی اور ان کی یہ فصاحت و بلاغت اور زورِ بیان اسلام کی تبلیغ میں بڑا ممد ثابت ہوا اور بڑے بڑے فصیح اللسان ان سے متاثر ہوئے۔

خطابت انسان کی بہت بڑی خوبی ہے، اگر اس کا مصرف بہتر ہو اور خطیب

خلوص وصداقت سے بہرہ ور ہوتو ذہنوں کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کردیتا ہے اور آن کی آن میں فکروفہم کی کایا پلٹ دیتا ہے۔حضرت ام مغیث رضی اللہ عنہا کی اس خداداد نعمت سے بے شمار لوگ اثر پذیر ہوئے اور ان کی فکری رجحان میں تغیر کی لہریں نمودار ہوئیں۔ایک مرتبہ انھوں نے ایک مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

لوگو! تم اپنے نفع ونقصان سے اتنے بے خبر کیوں ہو، کیا تمھیں معلوم نہیں ایک روز اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے، جہاں تمہارے اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا اور تمہاری نیکیوں اور برائیوں کو پرکھا اور جانچا جائے گا۔تم اس دنیا میں اتراتے پھرتے ہو، اپنے اموال واولاد پر نازاں ہو، قوت وشوکت پر فخر کرتے ہو اور محلات وقصور میں دل لگائے بیٹھے ہو۔یادرکھو یہ سب چیزیں عارضی ہیں، دوام صرف اللہ کی ذات کو ہے۔جو شخص خیرات وحسنات کے لئے کوشاں ہے، وہی فوز وفلاح کا مستحق ہے اور جو برائی کو مرکزِ توجہ ٹھہراتا ہے، وہ ناکام ونامراد ہے۔آؤ نیکی کے سرچشموں کو تلاش کریں اور اللہ کے حضور گردن جھکا دیں۔

سادہ اور صاف معاشرے میں اس قسم چند جملے نہایت موثر ثابت ہوتے ہیں اور لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ فی الواقع ہمیں اپنے عمل وفعل کا جائزہ لینا چاہئے اور غلط اور صحیح میں حد فاصل کا سراغ لگانا چاہئے۔

حضرت ام مغیث رضی اللہ عنہا میں ایک خوبی یہ تھی کہ غلط بات کو برداشت نہ کرسکتیں، اگرچہ اظہارِ حق سے کتنا ہی نقصان پہنچتا ہو اور غلط چیز کی حمایت سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہوں، مگر یہ ہر حال میں حق کی حمایت اور برائی کی تردید کرتیں۔

دوسری خوبی ان میں یہ تھی کہ اپنا نقصان کرکے بھی دوسرے کو نفع پہنچاتیں اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھاتیں جس سے دوسرے کے نقصان کا ذرا بھی احتمال ہو۔

تیسری چیز جو ان میں نمایاں تھی وہ انسانی ہمدردی تھی۔اس سلسلے میں یہ بعض

اوقات مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی امتیاز روانہ رکھتیں۔کوئی کافر اور منکر اسلام بھی تکلیف میں مبتلا ہوتا، یا بھوک پیاس سے دوچار ہوتا، یا معاشی ابتلاء کا شکار ہوتا تو اس کی امداد کرتیں، اس سے ہم دردی کا برتاؤ کرتیں اور اس کو بہتر سلوک کا مستحق گردانتیں۔

چوتھی صفت ان میں یہ تھی کہ خدمتِ خلق کے لئے ہر آن تیار رہتیں، عورتوں کو بازار سے سودا سلف لا کر دیتیں اور ہر کام میں ان کی مدد کرتیں۔

یہ اور اس قسم کے بہت سے اوصاف تھے جو ان کی ذات میں جمع ہو گئے تھے اور جن پر یہ عمل پیرا تھیں۔

حضرت ام مغیث رضی اللہ عنہا کا انتقال مکہ مکرمہ میں ہوا۔ عاملِ مکہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ جنازے میں بہت سے حضرات نے شرکت کی، جن میں صحابہ اور مشہور تابعین کی خاصی بڑی تعداد شامل تھی۔

ایک روایت کے مطابق ان کی نماز جنازہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے پڑھائی اور وہ دفن کے وقت بھی قبر پر موجود تھے۔

☆☆☆

معاذہ بنت عبداللہ عدویؒ

وہ خاتون جن کے شوہر کا عین جوانی ہی کے عالم میں انتقال ہو گیا تھا اور ان کی وفات کے بعد تمام عمر انھوں نے اپنے لئے بستر کا اہتمام نہیں کیا۔

معاذہ بنت عبداللہ عدوی بصرہ کی رہنے والی تھیں اور پہلی صدی ہجری کی ان خواتین میں سے تھیں جو فصاحت و بلاغت اور تفقہ میں خاص شہرت رکھتی تھیں۔ عبادت گزاری اور زہد میں ان کا شمار بصرہ کی ممتاز خواتین کے زمرے میں ہوتا تھا۔

صفوۃ الصفوہ، تہذیب التہذیب، طبقات الاتقیاء، مسند ابی داؤد، مرآۃ الجنان، البیان والتبیین، شذرات الذہب، طبقات ابن سعد، ذکر رجال الصحیحین، لواقع الانوار فی طبقات الاخیار اور کتاب الحیوان وغیرہ میں ان کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔

یہ تابعین کے دور کی خاتون ہیں اور اس مقدس جماعت میں ان کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ انھیں صحابہ اور تابعین کے اونچے لوگوں سے استفادہ کا موقع ملا۔ ان کے اساتذہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، ہشام بن عامر، ام عمرو بنت عبداللہ بن زبیر وغیرہ (رضی اللہ عنہم) شامل ہیں۔ ان سے انھیں سماعِ حدیث کا شرف حاصل ہوا۔

پھر جن حضرات نے خود ان سے تحصیلِ علم کی اور ان کی شاگردی کے دائرے میں آئے، وہ بھی اپنے دور کے جلیل القدر لوگ ہیں۔ ان میں سے ابوقلابہ، قتادہ، یزید الرشک، سلیمان بن عبداللہ بصری، اسحاق بن سعید، عاصم الاحول، ایوب، اسحاق بن سوید اور ابوبکر العدوی کی دادی ام الحسن وغیرہ لائقِ تذکرہ ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کی رائے اور فکر و قول کی اس دور میں علم حدیث، اور ثقاہت میں حرفِ آخر سمجھا جاتا تھا۔

معاذہ بنت عبداللہ کے متعلق بڑے بڑے محدثین نے بہترین آراء کا اظہار کیا

ہے۔ایک بہت بڑی جماعت نے ان کی توثیق کی ہے اور انھیں مستند مانا ہے۔مثلاً یحییٰ بن معین کہتے ہیں: معاذہ بنت عبداللہ عدویہ مرتبۂ ثقاہت پر فائز ہیں اور ان کی سند سے بیان کی ہوئی روایاتِ قابل استناد ہیں۔ابن حبان کا کہنا ہے کہ معاذہ کا شمار ثقات میں ہوتا ہے۔

ہر وقت موت کو یاد رکھتیں، کسی وقت بھی اسے دل سے نہ نکالتیں، سورج طلوع ہوتا اور دن کی روشنی پھیلتی تو کہتیں کیا معلوم یہ میری زندگی کا آخری دن ہو اور اس میں میری موت واقع ہو جائے۔اس خیال سے تمام دن ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتیں۔اسی طرح جب سورج غروب ہوتا اور شب کی تاریکی پھیلنے لگتی تو فرماتیں ممکن ہے میں اسی رات موت کی آغوش میں چلی جاؤں، لہٰذا رات بھی جاگ کر گزارتیں اور صبح تک بیدار رہتیں۔

عبادت کھڑے ہو کر کرتیں، ہر آن یادِ خدا میں مصروف رہتیں، قیام لیل کا اس درجہ اہتمام کرتیں کہ سخت سردیوں میں باریک کپڑے پہنتیں تاکہ وہ سردی کی شدت کو روک نہ سکیں اور نیند کا غلبہ نہ ہونے پائے۔رات کو عبادت میں نیند کا اثر غالب آتا تو کھڑی ہو جاتیں اور گھر کے صحن میں ٹہلنا شروع کر دیتیں۔اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتیں۔

نیند کا عالم تو تیرے آگے دنیوی زندگی کے بعد آنے والا ہے۔اگر تم نے اس جہان کے لئے عمل صالح کئے اور نیکیوں کا ذخیرہ جمع کیا تو قبر میں آرام سے قیامت تک سوتی رہے گی، ورنہ قبر میں حسرت و یاس کے ساتھ جاگنا ہوگا۔پھر صبح تک اسی کیفیت میں صحن میں چکر لگاتیں رہتیں کہ ایسا نہ ہو میں سو جاؤں اور غفلت و نوم کی حالت میں موت واقع ہو جائے۔وہ بالالتزام دن رات میں چھ سو (۶۰۰) رکعتیں پڑھتیں۔نماز اور عبادت کے سوا دنیا کا کوئی کام نہ کرتیں۔انھوں نے چالیس برس تک آسمان کی طرف منہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔فرمایا کرتیں اللہ کو کس طرح منہ دکھاؤں، میں اس قابل نہیں کہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھوں۔اس کثرتِ عبادت کے باوجود انکسار کا یہ عالم کہ فرماتیں برائیوں کا پلڑا نیکیوں سے بہت بھاری ہے۔

ان کا قول ہے کہ مجھے اس آنکھ پر سخت تعجب ہے جو سونے کے لئے بے قرار رہتی ہے، حالانکہ اسے معلوم ہے کہ وہ قبر کے اندھیروں میں طویل مدت تک جاگتی رہے گی۔

ایک عورت جسے بچپن کے زمانے میں معاذہ نے دودھ پلایا تھا، کہتی ہیں کہ حضرت معاذہ کہا کرتی تھیں کہ اللہ کی ملاقات کا انتظار ڈر اور امید کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کرو، مجھے یقین ہے اس کی رحمت کا امیدوار اس سے ملاقات کے روز بہتر مدارج میں ہوگا۔ جس دن لوگ رب العالمین کے حضور پیش ہوں گے وہ ڈر کے مارے کانپ رہا ہوگا۔ یہ کہہ کر رو پڑیں۔

جوانی کے عالم ہی میں ان کے شوہر فوت ہو گئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد تمام عمر اپنے لئے بستر کا اہتمام نہیں کیا۔

ان کی ایک بیٹی کا نام صہبا تھا، جس کے نام کی وجہ سے ان کی کنیت ام الصہبا تھی۔ یہ لڑکی عالمِ طفولیت ہی میں وفات پا گئی تھی۔ فرمایا کرتیں میں صرف اس بنا پر زندہ رہنا چاہتی ہوں کہ اس قدر نیک عمل کرلوں کہ جو جنت میں میرے اور میری بیٹی اور اس کے والد کے درمیان ملاقات کا ذریعہ بن جائیں۔

جب ستر سال کی عمر کو پہنچیں تو فرمایا: میں نے عمر کی ستر منزلیں طے کرلی ہیں، مگر گزشتہ ساری زندگی خواب کی مانند معلوم ہوتا ہے اور بیتے ہوئے طویل ماہ وسال چند ثانیوں میں بدل گئے ہیں۔ پوری زندگی ناپائیدار اور بے وقعت ہے۔ جب مر جائیں گے تو پچھلی ساری عمر کل کی بات معلوم ہوگی۔ میری ستر سال کی عمر میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جس میں آنکھوں نے ٹھنڈک اور مسرت کی لہر دیکھی ہو۔

حضرت معاذہ بنت عبداللہ عدوی رحمہا اللہ نے ۱۰۱ھ کو بصرہ میں وفات پائی۔
پانچویں خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا انتقال بھی اسی سال ہوا۔

☆☆☆

قدسیہ بیگم

مغل حکمراں فرخ سیر کی بیٹی جس نے اپنے نام سے دہلی میں قدسیہ باغ لگوایا تھا

قدسیہ بیگم کا اصل نام اودھم بائی تھا۔ یہ مغل حکمراں فرخ سیر کی بیٹی تھی۔ اس کی شادی محمد شاہ سے ہوئی تھی جو ۱۱۳۱ھ سے ۱۱۶۱ھ (۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء) تک ہندوستان کا بادشاہ رہا۔ شادی کے بعد اسے نواب قدسیہ زبانی کا لقب دیا گیا تھا۔ یہ خاتون انتہائی سمجھ دار اور بے حد عقل وفراست کی مالک تھی۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ جب محمد شاہ بتیس برس حکومت کرنے کے بعد ۲۷ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ (۱۶/اپریل ۱۷۴۸ء) کو اچانک فوت ہوا تو نہایت راز داری سے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور سات روز تک کسی کو اس کی موت کی اطلاع نہیں دی۔ یہ راز داری اس لئے اختیار کی گئی کہ وہ ملک میں نہایت افراتفری اور شدید فتنے کا زمانہ تھا اور خطرہ تھا کہ معلوم نہیں حالات کیا رخ اختیار کرلیں اور پھر انھیں قابو میں رکھنا مشکل ہوجائے۔

مغلیہ خاندان میں تعمیر وتزئین اور آرائش کا جو ذوق پایا جاتا تھا، قدسیہ بیگم اس سے خوب بہرہ مند تھی۔ چنانچہ اس کے شوہر محمد شاہ کے بعد جب اس کا بیٹا احمد شاہ تخت حکومت پر متمکن ہوا تو اس نے بعض عمارتیں بنوائیں اور باغ لگوائے۔

اپنے نام سے اس نے دہلی میں ''قدسیہ باغ'' لگوایا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ باغ رعنائی وخوب صورتی میں پورے ہندوستان میں اپنی مثال نہ رکھتا تھا۔ باغ دہلی میں کشمیری دروازے کے باہر تھا۔ اس باغ میں بارہ دری اور شان دار مسجد تھی۔ لوگ دور دور سے سیر کے لئے اس میں جاتے تھے۔ مغلوں کی حکومت ختم ہونے کے کچھ عرصہ بعد تک بھی یہ باغ رہا اور اس کی عمارتیں بھی رہیں۔ بعد میں سب کچھ کھنڈروں میں تبدیل

ہو گیا۔ الغ۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی چار دیواری کافی دیر باقی رہی۔ پھر ایک وقت آیا کہ یہ سب چیزیں ماضی کا قصہ بن گئیں اور اس کی ٹوٹی ہوئی دیواریں، شکستہ چھتیں اور بے ترتیب بکھرے ہوئے پتھر اس کی وسعت کی شہادت دیتے رہے۔

قدسیہ باغ کے وسط میں ایک پختہ نہر تھی جو دریائے جمنا سے نکلتی تھی اور باغ کے سایہ دار درختوں کی دورویہ قطاروں کو سیراب کرتی تھی۔ یہ نہر بھی امتداد زمانہ اور حالات کے تغیر سے خشک ہو گئی تھی، تاہم اس کے آثار بہت عرصے تک باقی رہے۔

دہلی میں قلعہ سے متصل اپنے بیٹے احمد شاہ کو حکم دے کر ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۱ء) میں اس نے سنہری مسجد کے نام سے ایک مسجد تعمیر کرائی تھی۔ مسجد کے دروازے پر مرمر کے پتھر میں یہ اشعار کندہ تھے۔

شکر حق در عہد احمد شاہ غازی بادشاہ — خلق پرور دادگر شاہان عالم را پناہ
مسجدے کردہ بنا نواب قدسی مرتبت — باد دائم فیض عام آں ملائک سجدہ گاہ
سعی نواب بہادر صاحب لطف و کرم — ساخت تعمیر چنیں جاوید عالی دست گاہ
چاہ و حوض و صاف صحنش ابروے زمزم است — ہر کہ از آبش طہارت کرد شد پاک از گناہ
سال تاریخش چو خورم یافت از الہام غیب — مسجد بیت مقدس مطلع نور الٰہ

منقول ہے کہ تیسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں جس ''نواب بہادر'' کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے جاوید خاں خواجہ سرا مراد ہے۔ قدسیہ بیگم کی سفارش سے بادشاہ نے اسے ''نواب بہادر'' کا خطاب دیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ نواب قدسیہ بیگم نے دہلی میں ایک اور عمارت تعمیر کرائی تھی۔ یہ عمارت ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۹ء) میں نواب بہادر جاوید خاں سے کہہ کر تعمیر کرائی گئی تھی۔ اس عمارت کا نام ''شاہ مرداں'' رکھا گیا تھا۔

قدسیہ بیگم نہایت مخیّر اور سلیم الطبع خاتون تھی۔ چھوٹے پر شفقت، کمزور کی

اعانت، غریب پروری اس کی زندگی کے لازمی اجزاء تھے۔ تلاوت قرآن اور عبادت الٰہی اس نے اپنے لئے ضروری ٹھہرالیا تھا۔ اس کی ایک عجیب وجہ بیان کی جاتی ہے۔

کہتے ہیں ایک روز یہ محل کی کھڑکی میں بیٹھی کسی کتاب کے مطالعہ میں محو تھی کہ نیچے سے ایک فقیر نما شخص نے زور سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا جو اس کے کانوں سے ٹکرایا۔ اس نعرے میں ایک خاص اثر و رعب کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ اس اثر انگیز اور مرعوب کن صدا نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ نیچے دیکھا تو ایک گلیم پوش فقیر ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا لئے کھڑا تھا۔ اس نے نگاہیں اس فقیر پر گاڑ دیں۔ فقیر نے فارسی کے چند نصیحت آموز اشعار پڑھے اور چلتا بنا۔

اب قدسیہ بانو بیگم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ غسل خانے میں گئی، غسل کیا، کپڑے بدلے اور تلاوت قرآن میں مشغول ہوگئی۔ اس کنیز نے جو ہر وقت اس کی خدمت میں مصروف رہتی تھی، ملکہ کی یہ کیفیت دیکھی تو دست بستہ عرض کیا:

اے ملکۂ ہند! آج یہ کیفیت آپ پر یکایک کیوں طاری ہوگئی؟

جواب دیا: مجھے اپنی حالت پر رہنے دو، دخل اندازی نہ کرو؟

کنیز نے عرض کیا: حضور! میں آپ کے تغیر احوال سے خوش ہوئی ہوں۔ صرف یہ دریافت کرنے کی اجازت چاہتی ہوں کہ یہ کس مرد خدا کی دعا کا اثر ہے، جس سے یکایک طبیعت بدل گئی۔

بولیں: اس راز سے تم پردہ اٹھانے کی اتنی ہی متمنی ہو تو جاؤ اس مرد درویش کی تلاش کرو، جس نے چند ساعتیں قبل محل کے نیچے کھڑے ہوکر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا تھا۔ وہ نعرہ میرے لئے نہایت اثر انگیز تھا۔ میرے دل کی دنیا کو بدلنے کا باعث وہی نعرہ ہوا ہے۔

مگر وہ درویش اب اتنی دور جا چکا تھا کہ اسے تلاش کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کے بعد وہ کبھی ادھر نہ آیا لیکن قدسیہ بانو بیگم کی زندگی کا رخ بالکل بدل گیا۔

قدسیہ بانو بیگم شعر بھی کہتی تھی اور اس سلسلے میں اس نے بڑی موزوں طبع پائی تھی۔

مرقوم ہے کہ اس فقیر کے جانے کے بعد یہ بہت بے چین رہنے لگی تھی۔ اس بے چینی کو رفع کرنے کی غرض سے اس نے مختلف ملازموں اور کنیزوں کے ذریعے اس فقیر کو تلاش کیا، مگر وہ نہیں ملا۔ اس اثناء میں اس نے بہت سے شعر کہے جو اس کے دل کی بے تابی پر دلالت کناں ہیں۔ ایک اردو شعر بھی اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو یہ ہے:

ہم جانتے تھے آنکھ لگی دل کو سکھ ہوا
کم بخت کیسی آنکھ لگی، اور دکھ ہوا

کہتے ہیں، یہ شعر وہ اکثر پڑھتی اور دل کو تسکین دینے کی سعی کرتی۔ لیکن اس کی بے چینی دور نہ ہوئی اور دل کی دنیا میں جو آگ ایک مرتبہ سلگ چکی تھی، وہ بجھ نہ سکی۔

ہندوستان کے سیاسی اور حکومتی حالات اس وقت نہایت ابتر تھے۔ اس کا بیٹا احمد شاہ باپ کے مرنے کے بعد ۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ (مئی ۱۷۴۸ء) کو وارث تخت ہند ہوا تھا۔ لیکن چھ سال کے بعد جمادی الاولیٰ ۱۱۶۷ھ (مارچ ۱۷۵۴ء) کو اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی اور معدوم البصارت کر کے اسے سلیم گڑھ میں قید کر دیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق اس واقعہ سے بیس سال بعد ۲۷ شوال ۱۱۸۸ھ (جنوری ۱۷۷۵ء) کو قید خانے میں اس کی موت واقع ہوئی اور دہلی میں ہمایوں کے مقبرے میں اسے دفن کیا گیا۔

یہ بھی روایت بیان کی جاتی ہے کہ بیٹے کی معزولی اور قید کے بعد نواب قدسیہ بانو کا ہندوستان میں رہنے کو جی نہیں چاہا۔ اس نے اپنی بھانجی صاحبہ محل کی شادی افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی سے کر دی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہی افغانستان چلی گئی تھی۔ وہیں ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۵ء) میں فوت ہوئی۔

☆☆☆

حفصہ بنت سیرینؒ

سیدۃ التابعیات جن کے نکاح کی تقریب میں اٹھارہ بدری صحابی شریک تھے

حفصہ بنت سیرین کے حالات تاریخ ورجال کی کتابوں میں مذکور ہیں۔مثلاً ''صفوۃ الصفوہ'' میں ابن جوزی نے، ''تہذیب التہذیب'' میں حافظ ابن حجر نے، ''الکمال فی معرفۃ الرجال'' میں عبدالغنی مقدسی نے، ''التہذیب'' میں ذہبی نے، ''مرآۃ الجنان'' میں یافعی نے، ''شذرات الذہب'' میں ابن العماد نے اور ''الوافی بالوفیات'' میں صفدی نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔

حفصہ بنت سیرین ۳۱ھ میں پیدا ہوئیں۔ایک روایت میں ۲۰ھ بتایا گیا ہے۔ تابعی حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی بہن تھیں۔ان کے والد کا نام سیرین تھا جو عراق کے ایک مقام جرجرایا کے باشندے تھے اور عین التمر میں ٹھٹھیرے کا کام کرتے تھے۔اسی عین التمر کی جنگ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ گرفتار ہوئے اور مالِ غنیمت کی تقسیم میں غلام کی حیثیت سے کسی مجاہد کے حصے میں آئے۔بعد میں مشہور صحابی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی غلامی میں آگئے۔انھوں نے بیس ہزار درہم پر مکاتبت کرکے انھیں آزاد کردیا۔یہ سب باتیں ابن خلکان کی ''وفیات الاعیان'' کی جلد اول میں مذکور ہیں۔

''شذرات الذہب'' کی پہلی جلد میں لکھا ہے کہ محمد بن سیرین (اور حفصہ بنت سیرین) کی والدہ کا نام صفیہ تھا اور وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کنیز تھیں، لیکن وہ کنیز اس عزت واحترام کی مالک تھیں کہ جب ان کے نکاح کا وقت آیا تو تین ازواج مطہرات نے ان کی مشاطگی کا فریضہ انجام دیا اور اٹھارہ بدری صحابہ جن میں

حضرت ابی بن کعبؓ بھی شامل تھے، ان کے نکاح کی تقریب میں شریک ہوئے۔ آراستگی وتیاری کے بعد امہات المومنین نے حضرت صفیہؓ کے لئے دعا مانگی۔ مردانہ مجلس میں حضرت ابی بن کعب دعا مانگتے جاتے تھے اور صحابہ آمین کہتے جاتے تھے۔

ابن خلکان کے بقول حضرت حفصہ کے والد سیرین کثیر الاولاد بزرگ تھے۔

ان کی یہ صاحبزادی حضرت حفصہ ۳۱ھ میں خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے چار سال قبل پیدا ہوئیں۔ یہ غلام خاندان کی بیٹی تھیں لیکن انتہائی عابدہ وزاہدہ اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ اور اس باب میں یہ تابعی خواتین میں ایک بلند مقام رکھتی تھیں۔ عبادت گزاری وتقوی شعاری کے ساتھ ساتھ علوم قران اور حدیث وفقہ کی بہت بڑی عالمہ تھی۔

معروف تابعی ایاس بن معاویہؒ کہتے ہیں: میں نے حفصہ بنت سیرینؒ سے بڑھ کر کسی کو افضل اور بہتر نہیں پایا۔

ان سے پوچھا گیا: کیا وہ حسن بصری اور (اپنے بھائی) محمد بن سیرین سے بھی برتر حیثیت کی مالک تھیں؟

جواب دیا: میں ان میں سے کسی کو کسی پر فضیلت دینے کو تیار نہیں۔

علماء نے ان کو سیدات التابعیات میں شمار کیا ہے۔ ابن داؤد کا کہنا ہے کہ حفصہ بنت سیرین، عمرہ بنت عبدالرحمٰن اور ام الدرداء صغریٰ تینوں علم ومعرفت اور تقویٰ وپرہیزگاری میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔

حفصہ نہایت ذہین خاتون تھیں۔ بارہ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرلیا تھا اور قرأت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوگئی تھیں۔ اس کے معانی ومطالب پر بھی عبور حاصل کرلیا تھا۔ ان کے بھائی محمد بن سیرین بے شک بہت بڑے عالم تھے، لیکن انھیں قرآن حکیم کا کوئی مشکل مقام پیش آتا تو کہتے، اس کے بارے میں حفصہ سے پوچھو اور

یہ بھی دریافت کرو کہ وہ اس کی قرأت کس طرح کرتی ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ حفصہ قرآن کی سب سے بڑی عالمہ اور قاریہ ہیں۔

عبادت سے انھیں انتہائی شغف تھا۔نمازیں کثرت سے پڑھتی تھیں۔مکان کے ایک کونے میں نماز کے لئے مسجد کی صورت میں ایک جگہ مقرر کر رکھی تھی، اس مسجد میں نماز ظہر کے لئے جاتیں تو ظہر، عصر، مغرب اور عشا کی نمازیں پڑھ کر باہر نکلتیں۔تہجد اور نمازِ فجر بھی وہیں ادا کرتیں اور کافی سورج نکلنے تک اس مسجد میں عبادت کرتی رہتیں۔ نمازِ اشراق پڑھ کر باہر آتیں۔ظہر کی اذان کی آواز کانوں میں پڑتی تو پھر مسجد میں چلی جاتیں۔ان کا زیادہ تر وقت مکان کی اسی مسجد میں گزرتا تھا۔مہدی بن میمون کہتے ہیں کہ حفصہ متواتر تیس برس اس مسجد میں رہیں اور شدید ضرورت کے بغیر کبھی اس سے باہر قدم نہیں نکالا۔

قرآن مجید کی تلاوت کثرت سے کرتیں اور ایک ایک لفظ کے معنی ومطلب کو غور وفکر کے زاویوں میں لاتیں۔کہا جاتا ہے کہ حفصہ ہر رات نصف قرآن کی تلاوت فرماتیں۔قرآن پاک سے انھیں بے حد لگاؤ تھا۔ بات بات میں قرآن کی آیات پڑھتیں۔لوگوں کو اس کا مطلب سمجھاتیں اور اس کے فضائل بیان کرتیں۔

روزے کثرت سے رکھتیں۔ایک جگہ مرقوم ہے کہ عیدین، ایام تشریق اور بعض دیگر ایام کے علاوہ ہمیشہ روزے سے رہتیں۔''صفوۃ الصفوہ'' میں ابن جوزی لکھتے ہیں کہ حفصہ صائمۃ الدہر تھیں۔بہت کم لوگوں نے ان کو روزے کے بغیر دیکھا ہے۔

کہتے ہیں انھوں نے ایک کفن بنا رکھا تھا، جسے حج کے موقع پر پہنتی تھیں، اسی سے احرام باندھتیں، رمضان المبارک کا آخری عشرہ آتا تو رات کو قیام کرتیں اور یہ کفن اس عشرے میں بالالتزام زیب تن کرتیں۔

ایک مرتبہ انھوں نے نوجوانوں (مردوں اور عورتوں) سے خطاب کرتے

ہوئے کہا:

نوجوانو! تمھارا شباب کا عالم ہے۔اس عمر میں کثرت سے عبادت کرو اور اللہ کے ذکر میں اپنے آپ کو مشغول رکھو۔اس عمر کا نیک عمل زیادہ وقیع اور اللہ کے نزدیک زیادہ قابلِ احترام ہے۔ میں نے اپنی ساری جوانی اللہ کی راہ میں وقف کر دی ہے۔اٹھو اللہ کی رضا جوئی کو اپنا شعار بنالو۔

ان کے اساتذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے، جن حضرات سے انھوں نے قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کی اور شرف روایت حاصل کیا، ان کے اسماء گرامی یہ ہیں جن میں کئی صحابہ کرام بھی شامل ہیں۔ ان کے بھائی یحییٰ، حضرت انس بن مالک، حضرت ام عطیہ انصاریہ، رباب ام الرائح، ابوالعالیہ، ابوذبیان، خلیفہ بن کعب، ربیع بن زیاد حارثی، حضرت حسن بصری کی والدہ محترمہ حضرت خیرہ۔

طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ حسن بصری کی والدہ حضرت خیرہ رحمۃ اللہ علیہا ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی کنیز تھیں اور خود حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے گھر میں تربیت پائی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خیرہ کسی کام سے گھر سے باہر جاتیں یا کسی ضروری کام میں مشغول ہوتیں تو حضرت ام سلمہ حضرت حسن بصری کو اپنا دودھ پلاتیں۔ یہ بات ''تہذیب الاسماء واللغات'' کی جلد اول میں مرقوم ہے۔ بہرحال ان کے علاوہ حضرت حفصہ بنت سیرین نے سلمان بن عامر ضبی اور ایک جماعت سے روایت کی ہے۔

حفصہ کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن میں ان کے بھائی محمد بن سیرین، قتادہ، عاصم الاحول، ایوب بن خالد الحذاء، ابن عون، ہشام بن حسان خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

حضرت حفصہ ثقہ راویہ تھیں۔ یحییٰ بن معین نے ان کو ثقہ اور ان سے مروی

روایت کو لائقِ حجت گردانا ہے۔ احمد بن عبداللہ نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے۔ ابن حبان نے ان کا تذکرہ ثقات اصحاب حدیث میں کیا ہے۔

ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ ایک روایت کے مطابق ستر برس عمر پا کر ۱۰۱ھ میں فوت ہوئیں۔ یہ حافظ ابن حجرؒ کی تحقیق ہے جو ''تہذیب التہذیب'' میں مرقوم ہے۔ ایک روایت کی رو سے ۹۲ھ میں وفات پائی۔ یہ روایت ابن جوزیؒ نے ''صفوۃ الصفوہ'' میں بیان کی ہے۔

☆☆☆

حمدہ بنت واثق

ایک نیک کردار خاتون جن کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔

حمدہ بنت واثق اپنے دور کی معروف خواتین میں سے تھیں۔ ان کے حالات صفدی کی الوافی بالوافیات میں اور محمد ذہبی کی ''مشاہیر النساء'' میں بیان کیے گئے ہیں۔

حضرت حمدہ بنت واثق بن علی رحمۃ اللہ علیہا بغداد کی ایک نواحی بستی میں ۴۶۶ھ میں پیدا ہوئیں۔ جس خاندان سے یہ تعلق رکھتی تھیں، وہ علم وفضل اور تدین وتقویٰ کے اعتبار سے عرب میں نہایت بلند مقام رکھتا تھا۔ اس کے تمام افراد پرہیز گاری، حسن اخلاق اور نیکی میں سب سے فائق تھے۔ لڑائی جھگڑوں اور سازشوں سے بالا رہ کر زندگی بسر کرتے تھے۔

حمدہ کا خاندان جن اوصاف سے متصف تھا وہ ان میں بھی منتقل ہوئے۔ بچپن ہی میں بہتر طریقے سے ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا گیا تھا۔ ان کے والد واثق بن علی خود بھی ایک عالم دین اور نیک کردار شخص تھے، اپنی اس لڑکی کی بھی انھوں نے بہتر انداز سے تربیت کی اور ان کی تعلیم کے مسئلے کو خصوصیت سے مرکز توجہ ٹھہرایا۔ والدہ نے بھی اس میں پوری دلچسپی لی۔

ابتدائی تعلیم والد نے گھر پر دی۔ پہلے قرآن حکیم پڑھایا، پھر حدیث وفقہ کی بعض کتابیں پڑھائیں۔ تعلیم کے علاوہ ان میں صالحیت کی روح پیدا کی اور کم سنی میں ہی نیکی کی صاف ستھری راہوں پر لگایا۔

عمر کی مزید منزلیں طے کیں تو انتہائی تعلیم کے لئے دیگر اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ حدیث کے لئے اس زمانے کے نامور محدث ابوبکر احمد بن علی بن بدران حلوانی کی طرف رجوع کیا گیا۔ یہ اس دور کے جلیل القدر عالم تھے اور حدیث اور اس کے متعلقات پر عبور رکھتے تھے۔ فقہ کے لئے مشہور فقیہ امام ابن سمعانی کے سامنے

زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ ابن سمعانی فقہ کے علاوہ حدیث میں بھی اس زمانے کے بہت بڑے عالم تھے۔ حمدہ بنت واثق نے ان دونوں سے حدیث وفقہ کی کتابیں پڑھیں اور اپنی قابلیت اور ذہانت کی وجہ سے بڑا نام پایا۔

وہ عمدہ عادات وخصائل کی مالک تھیں۔ مسائل کی تحقیق کا بڑا شوق تھا۔ ہر پیش آئند مسئلے کے حل کے لئے علماء کی طرف رجوع فرماتیں۔ جہاں ان کو اللہ نے علم وفضل کی نعمت بے بہا سے نوازا تھا۔ وہاں صلہ رحمی، دوسروں کے احترام وغرباء کی امداد ونصرت کے جذبے سے بھی سرشار فرمایا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ ان لوگوں کے پاس ضرور جاتیں جنھیں معاشرے میں کمزور سمجھا جاتا تھا، بیماروں کی عیادت اور ناداروں کی مدد کو فرض گردانتیں اور ان کی دلجوئی کرتیں۔ بوڑھوں کا انتہائی احترام کرتیں، بچوں سے شفقت سے پیش آتیں۔

اپنے گھر کے تمام کام خود کرتیں، کپڑے دھوتیں، کھانا پکاتیں، مہمانوں کی خدمت کرتیں، عورتوں اور بچوں سے اچھی طرح پیش آتیں اور کسی کو شکایت کو موقع نہ دیتیں۔ سادہ زندگی بسر کرتیں اور ہر معاملے میں عجز وانکسار کا ثبوت دیتیں، والدین کی حددرجہ خدمت گزار تھیں اور وہ ان کے حسن اخلاق اور علمیت پر بہت خوش تھے۔

ان کی شادی اپنے خاندان ہی کے ایک شخص سے ہوئی تھی۔ ان کے شوہر بھی عالم اور عاقل وفہیم تھے۔ شادی بالکل سادگی سے انجام پائی۔ نہ جہیز کا تکلف، نہ زیورات کی کثرت اور نہ نوع بنوع کپڑوں کی بھرمار۔ چند لوگ دولہا کے ساتھ آئے، لڑکی والوں نے اپنی حیثیت کے مطابق انھیں کھانا کھلایا، نکاح ہوا اور قصہ ختم۔

تعلیم سے فراغت اور شادی کے بعد مدینہ منورہ میں منتقل ہو گئی تھیں۔ وہاں کے محدثین اور فقہاء سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد بغداد میں بھی عرصے تک مقیم رہیں، وہاں کے علماء وفقہاء سے بھی تحصیل کی۔

مدینہ اور بغداد کے دورانِ قیام میں انھوں نے معاشرے کی اصلاح کے لئے

مجالس وعظ وارشاد کا آغاز فرمایا۔ ہر محلے میں اس قسم کی کمیٹیاں قائم کیں جو اچھے لوگوں پر مشتمل تھیں اور جن کا مقصد محض لوگوں میں اسلام کی تبلیغ اور ان کی اصلاح تھا۔ ان محلّہ وار کمیٹیوں کی طرف سے ہر محلے کی عورتوں میں مجلس وعظ منعقد کرتیں، وعظ کا اسلوب بالکل سادہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بہترین باتیں کہہ دیتیں۔ وعظ میں قرآن کی آیات پڑھتیں، رسول اللہ ﷺ کے ارشادات وفرمودات کے حوالے دیتیں، صحابہ کے آثار اور ائمہ کے اقوال سے اپنی بات میں وزن پیدا کرتیں۔ ان کے وعظوں میں کثرت سے عورتیں آتیں اور غور وتوجہ سے ان کی باتیں سنتیں۔

ایک مرتبہ عورتوں کے مجمع میں مدینہ منورہ میں دوران وعظ فرمایا، بہنو! تمہیں معلوم ہے، یہ کون سا شہر ہے، اس کی تاریخ کیا ہے اور اس کے ساتھ ہمارے کیا جذبات وابستہ ہیں۔ یہ وہی مبارک مقدس مقام ہے، جہاں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے تشریف لائے تھے۔ یہاں سے انھوں نے اسلام کی نشر واشاعت اور جنگ وجہاد کے لئے بے شمار قافلے مختلف مقامات کو روانہ کئے اور فوجوں کی فوجیں اس سلسلے میں میدان میں نکلیں۔ یہ وہی مقام ہے جہاں آنحضرت ﷺ کا روضۂ اقدس ہے اور جہاں لاتعداد صحابہ کرام استراحت فرما ہیں۔ یہ وہی متبرک خطۂ ارض ہے جس میں بڑے بڑے ائمہ اور علماء حدیث وفقہ پیدا ہوئے اور انھوں نے دین کی خدمت کے لئے بے حد تگ وتاز کی۔ تم اپنے آپ کی اصلاح کرو اور دین کی اشاعت وترویج کا فرض جو تم پر عائد ہوتا ہے، اسے پورا کرو۔ اٹھو، اللہ کے دین کی تبلیغ کے لئے کمربستہ ہو جاؤ۔

حضرت حمدہ بنت واثق بہت سی خوبیوں کی مالک تھیں اور ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

حضرت حمدہ بنت واثق بن علی رحمۃ اللہ علیہا نے ۵۶ برس عمر پا کر ۵۲۱ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

☆☆☆

بنفشا بنت عبداللہ

وہ معزز خاتون جو اپنے دور کے مروجہ علوم پر نظر رکھتی تھیں۔

بنفشا بنت عبداللہ رومیہ، عباسی خلیفہ مستضی بامر اللہ کی کنیز تھیں اور نہایت متقی خاتون تھیں۔ اپنے زمانے میں امور خیر میں بڑی شہرت رکھتی تھیں۔

بنفشا بنت عبداللہ کے حالات سے پہلے اس خلیفہ کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا ضروری ہے جس کی یہ کنیز تھیں۔

خلیفہ مستضی بامر اللہ عباسی خلیفہ تھا اور خلیفہ مستنجد باللہ کا بیٹا تھا۔ مستضی بامر الله ۵۳۶ھ میں ایک ارمنی ام ولد کے بطن سے پیدا ہوا اور تیس سال کی عمر میں ۵۶۶ھ کو تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ یہ صاف کردار اور متدین خلیفہ تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے عوام کے مسائل پر غور کیا اور ان کی مشکلات پر نظر ڈالی۔ اس نے وہ تمام ٹیکس معاف کر دئے جو اس سے قبل رعایا پر عائد کئے گئے تھے اور لوگوں سے وصول کئے جاتے تھے۔ اس کے زمانے میں عدل وانصاف عام ہو گیا اور لوگوں کی حالت بالکل بدل گئی۔ اس کی تخت نشینی کے پہلے سال ہی مصر میں عبیدیوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور سلطان صلاح الدین ایوبی کی حکومت مستحکم ہو گئی۔ سلطان نور الدین زنگی جو شام، جزیرہ اور موصل کا حکمراں تھا اور جسے بعد میں مصر، دیار بکر، بلاد روم اور سواد عراق کا حکمراں بھی خلیفہ مستضی بامر اللہ نے مقرر کر دیا تھا، اس عباسی خلیفہ کی انتہائی قدر کرتا تھا۔ اس کے زمانہ خلافت میں سلطان نور الدین زنگی نے سلطان صلاح الدین ایوبی کو مصر میں لکھا کہ اس عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جائے، چنانچہ سلطان صلاح الدین نے اس کے نام کا خطبہ پڑھا۔ اس واقعہ کی اطلاع خلیفہ کو ہوئی تو اس نے بہت مسرت کا اظہار کیا اور سلطان

نورالدین اور صلاح الدین کو بطور تحفہ کے صندل بھیجا اور دونوں کو خلعت روانہ کئے، نیز بغداد میں اس واقعہ کی خوشی میں نوبت بجائی گئی۔ سلطان نورالدین زنگی نے بھی اس کے جواب میں جشن مسرت منایا اور خلیفہ کا شکریہ ادا کیا۔ خلیفہ مستضی بامر اللہ نے ساڑھے نو برس تخت خلافت پر متمکن رہنے کے بعد ماہ ذیقعدہ ۵۷۵ھ میں انتقال کیا۔ اس وقت اس کی عمر چالیس برس تھی۔

یہ خاتون اصلاً رومی نژاد تھیں، یعنی اس علاقے سے تعلق رکھتی تھیں جسے آج کل ترکی اور اس کے بعض علاقوں سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ ایک کنیز تھیں جنھیں خلیفہ مستضی بامر اللہ نے خرید لیا تھا اور نہایت اچھی طرح اس کی تربیت کی تھی۔ خلیفہ نے ان کی تعلیم کے لئے وقت کے مشہور اور بہترین علماء کی خدمات حاصل کیں اور بہتر انداز سے ان کو تعلیم دلائی۔ ان کے حالات سیوطی کی ''المستظرف فی اخبار الجواری''، ابن الساعی کی ''الجامع المختصر'' اور ابی شامہ کی ''الذیل علی الروضتین'' میں بیان کئے گئے ہیں۔

بنفشا بنت عبداللہ رومیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ یہ نہایت صالحہ اور کثیر الخیرات خاتون تھیں۔ لوگوں کو نیکی کا درس دیتیں اور برائیوں سے دامن کشاں رہنے کی تلقین فرماتیں۔ ان کا قول ہے کہ میٹھی زبان سے نیکی سکھاؤ، اگر سختی سے کام لوگے تو لوگ تم سے دور بھاگیں گے۔ لوگوں کو اپنے قریب لانے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ محبت اور نرمی کا برتاؤ کیا جائے۔ عورتیں انھیں اپنے گھروں میں لے جاتیں اور ان سے اچھی باتیں سنتیں جہاں یہ جاتیں خواتین کا بہت بڑا مجمع لگ جاتا جو انہماک اور توجہ سے ان کی نصیحت آموز باتیں سنتا۔

ایک مرتبہ فرمایا: نبوت کا زمانہ بہت دور جا چکا ہے۔ تابعین اور تبع تابعین کا دور بھی باقی نہیں رہا، ائمہ کرام کا زمانہ بھی گزر گیا۔ یہ دور خالص دنیاداروں کا ہے۔ دین دار حضرات رخصت ہو گئے ہیں۔ ان کا وجود تو باقی نہیں رہا مگر ان کی تعلیمات موجود

ہیں، ان سے مستفید ہونا ہمارا فرض ہے۔ ہم اسی صورت میں کامیاب زندگی بسر کر سکتے اور دین و دنیا میں کامران ہو سکتے ہیں، جب کہ ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل پیرا ہوں، ان کے فرامین کو مشعل راہ بنائیں اور ان کے اقوال وارشادات کو زیر مطالعہ رکھیں۔ اگر ہم ان کی تعلیمات وارشادات کو پیش نگاہ نہیں رکھیں گے تو صراط مستقیم پر قدم زن نہیں رہ سکیں گے۔ تقویٰ اختیار کرو کہ یہی تمھاری نجات کا ضامن ہے۔

یہ خاتون اپنے دور کے مروجہ علوم پر نظر رکھتی تھیں۔ صحابہ کے واقعات اور ائمہ عظام کے حالات سے باخبر تھیں، حافظہ تیز تھا، زبان صاف تھی اور ذکاوت وفطانت سے بہرہ ور تھیں۔ اللہ نے ان کو بہت ہی خوبیوں سے نوازا تھا۔ انھوں نے خود بھی مشہور اہل علم سے استفادہ کیا تھا اور ان سے بھی بہت سے لوگوں نے تحصیل علم کی۔ ان کے شاگردوں میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی۔

ہر نیک کام رغبت سے کرتیں اور خیر کی طرف سبقت لے جانے کی سعی فرماتیں۔ لوگوں کی ضروریات کا انھیں خیال رہتا اور ان کے فائدے کے لئے سرگرم عمل رہتیں۔ بغداد میں بہت سی سرائیں، مسجدیں اور پل تعمیر کرائے۔ کئی دینی مدارس ان کی کوشش سے قائم ہوئے۔ ان مدارس میں ایک بہت بڑا مدرسہ وہ ہے جو انھوں نے دریائے دجلہ کے کنارے قائم کرایا، یہ مدرسہ فقہاء حنابلہ کے لئے قائم کیا گیا تھا، جس میں فقہ حنبلی کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی۔ اس مدرسہ سے بے شمار لوگ فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ اس کے تمام اخراجات یہ خود اپنی گرہ سے ادا کرتی تھیں۔ اس میں کئی جید حنبلی استاد تعلیم دیتے تھے اور سیکڑوں طلباء علم حاصل کرتے تھے۔ اس مدرسے کے لئے ایک پرشکوہ عمارت تعمیر کی گئی تھی جس میں ہر فن کی تعلیم کے علیحدہ علیحدہ انتظام تھا۔ اس کے دارالاقامہ میں کئی سو طالب علم مقیم تھے اور ان کے روزانہ کے اکل وشرب اور دیگر ضروریات کی کفالت مدرسہ ہی کرتا تھا۔ معلمین کی تنخواہیں اور طلباء کے مصارف یہی

خاتون ادا کرتی تھیں۔

ابن النجار کا کہنا ہے کہ بنفشاہر سال عید الفطر کے موقع پر کھجوروں کا ایک صاع (تقریباً تین سیر) بطور صدقۃ الفطر ادا کرتیں اور فرماتیں یہ تو وہ صدقہ ہے جو شرعی اعتبار سے ہم پر فرض ٹھہرایا گیا ہے، لیکن میں اس پر بس نہیں کرتیں اور اسے کافی نہیں سمجھتیں، بلکہ وہ یہ کرتیں کہ خالص سونے کے دیناروں کا ایک صاع فقراء ومساکین میں تقسیم کرتیں اور کہتیں کہ جب تک مستحقین کی ضرورتیں پوری نہ کی جائیں شریعت کے تقاضوں کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ عید کے موقع پر مستحقین کو بے نیاز کردینا شریعت کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔

فقہی مسلک کے اعتبار سے حنبلی تھیں۔ فقہ حنبلی کی ترویج واشاعت اور اس پر عمل کے سلسلے میں بڑی سرگرم تھیں، اس کی اشاعت کے لئے انھوں نے بغداد اور اس کے قرب وجوار میں متعدد مدرسے قائم کر رکھے تھے، جن میں سے بعض مدرسے بہت بڑے تھے۔

ان کی وفات جمعہ کے روز ۱۹؍ربیع الاول ۵۹۸ھ کو ہوئی۔

☆☆☆

روشن آرا بیگم

اورنگ زیب عالمگیر کی بہن جو اپنی معاملہ فہمی اور روشن ضمیری کے باعث عالمگیر کے نزدیک بہت وقعت رکھتی تھی۔

مغلیہ خاندان میں روشن آرا بیگم کو بعض خصوصیات کی بنا پر نہایت عزت واکرام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ ہندوستان کے مشہور بادشاہ شاہ جہاں کی بیٹی اور اورنگ زیب عالم گیر کی بہن تھی۔ یکم رمضان المبارک ۱۰۲۶ھ (ستمبر۱۶۱۷ء) کو پیدا ہوئی۔ یہ خاتون خصائلِ حمیدہ اور شمائلِ پسندیدہ کی حامل تھی۔ اس کے باپ شاہ جہاں کا سلسلۂ نسب دس واسطوں سے امیر تیمور تک پہنچتا ہے۔ روشن آرا بیگم اپنی معاملہ فہمی اور روشن ضمیری کے باعث اورنگ زیب کے نزدیک بہت وقعت رکھتی تھی اور وہ تمام اعزہ واقارب پر اسے فوقیت دیتا تھا۔ سلطنت کے بہت سے بنیادی امور میں اس کے مشورے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ یہ حسن ظاہری سے بھی متصف تھی اور حسن باطنی سے بھی۔

شاہ جہاں ملکی وخاندانی معاملات میں اس سے مشورے لیتا تھا۔ اس سلسلے میں اورنگ زیب عالم گیر بھی باپ کے نقش قدم پر چلا۔ اس نے روشن آرا کو وہی مقام عطا کیا جو اسے باپ کے زمانے میں حاصل تھا۔

۱۰۷۰ھ (۱۶۶۰ء) کا زمانہ اورنگ زیب عالم گیر کے لئے پریشانی اور ذہنی کوفت کا زمانہ تھا۔ اس سال وہ راجہ کرن کی مہم پر روانہ ہونے کے لئے پر تول رہا تھا۔ اس مہم پر روانہ ہونے سے پہلے اس نے حسب معمول امراء ووزراء اور فوجی افسروں کا دل بڑھانے کے لئے بہت بڑی تقریب کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ مہم کی اہمیت کے پیش نظر

مدعوئین کی فہرست بڑی وسیع تھی اور اس میں تمام جاں نثارانِ سلطنت اور بہی خواہان مملکت کو دعوت شرکت دی گئی تھی۔ جب اس عظیم الشان تقریب کے انتظامات مکمل ہو گئے اور سامانِ جشن کلی طور پر فراہم کرلیا گیا تو اورنگ زیب تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوا اور تمام ارکانِ دولت، اصحاب منصب اور اہل دربار حسب مراتب اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ سب نے شاہانہ طریق سے بادشاہ کو ہدیۂ تبریک پیش کیا اور بادشاہ کی درازی عمر کے لئے دست بدعا ہوئے اور اللہ کے حضور فتح و کامرانی کی التجا کی۔ بادشاہ نے جواب میں حاضرین کو ان کے منصب کے مطابق خلعتِ خاص اور انعاماتِ گراں بہا سے نوازا۔ اس موقع پر اس کی یہ بہن بھی جو ظاہر ہے، بہن ہونے کی وجہ سے بادشاہ کی سب سے زیادہ خیر خواہ اور اس کی فتح کے لئے مخلص تھی، حاضر دربار ہوئی اور اللہ کے حضور دعاء خیر کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ بادشاہ بہن کی دعا اور دربار میں تشریف آوری سے نہایت خوش ہوا اور دو ہزار اشرفیاں نذر کیں جو اس سراپا سخاوت خاتون نے اسی وقت غرباء و مساکین میں تقسیم کر دیں اور ان غرباء سے بھی جو اپنی خستہ حالی اور غربت و مسکنت کی وجہ سے دربار میں نہیں جا سکتے تھے، اس مہم میں بھائی کی فتح کے لئے درخواستِ دعا کی۔ چنانچہ ان لوگوں نے نہایت عاجزی سے دعا کی اور اورنگ زیب کے لئے اللہ کی نصرت و اعانت کے لئے ملتجی ہوئے۔ اس موقع پر روشن آرا بیگم نے جو الفاظ ہندوستان کے رفیع المرتبت حکمراں سے کہے وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں فرمایا:

اے شہِ ہند، میں اس لئے آپ کی خیر خواہ اور ہمدرد ہوں کہ آپ میرے بھائی ہیں اور آپ کا اور میرا رشتہ نہایت گہرا اور قریب کا ہے۔ میں اپنے خونی رشتے کی بنا پر قدرتاً آپ کی حامی ہوں۔ آپ کی بدخواہی کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی۔ یہ لوگ جن کو آپ نے خلعت و انعامات سے نوازا ہے، آپ کے امراء، وزراء، منصب دار، اصحاب عز و جاہ، اہل حکومت اور ذی اقتدار لوگ ہیں۔ لیکن یہ لوگ جنھیں عوام کہا جاتا ہے، نہ

اربابِ عساکر میں شامل ہیں، نہ حکومت وفرماں روائی میں ان کا کوئی حصہ ہے اور نہ عہدہ ومنصب سے ان کا کوئی تعلق ہے۔آپ کے لئے ان کی دعا محض اخلاص پر مبنی ہے اور اس قسم کی دعا اللہ کے حضور درجۂ قبولیت حاصل کرتی ہے۔ اگر آپ اللہ سے حقیقی نصرت واعانت کے خواہاں ہیں تو غرباء ومساکین کی خبر گیری اور ان کی معاونت کو اپنی زندگی کا جزو بنالیجئے۔ یہ لوگ مستجاب الدعوات ہیں اور دنیا میں بے وسیلہ وناتواں ہونے کی وجہ سے اللہ کے نزدیک خاص قدر ومنزلت کے حامل ہیں۔

اورنگ زیب بہن کی اس نصیحت سے نہایت خوش ہوا اور عہد کیا کہ ہمیشہ غرباء اور مستحقین کا خیال رکھے گا اور کوئی ایسا اقدام نہیں کرے گا جو معاشرے کے کم زور اور ضعیف افراد کے خلاف جاتا ہو۔

بادشاہ شاہ جہاں جب مسند آرائے حکومت ہوا تو پورے ملک میں مسرت کا اظہار کیا گیا تھا اور ہندوستان کا گوشہ گوشہ بہجت وشادمانی کا مرقع بن گیا تھا۔شعراء نے اس قسم کے شعر کہہ کر اس کی تخت نشینی پر ہدیۂ تبریک پیش کیا تھا۔

شہ گیتی ستاں جمشید ثانی　　سر افرازی و تاج کیانی
خدا خواندا ازاں شاہ جہانش　　مسخر شد زمین و آسمانش

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شے فرطِ مسرت سے رقصاں اور ہر متنفس محوِ نشاط ہے۔

تاج پوشی کی ان ساعتوں میں سب لوگ خوش تھے۔

وزاں جشن فرح بخش وطرب خیز　　ہماناں شد زمین از عیش لبریز
نہ تنہا ساز عشرت شد طرب ساز　　کہ برگ عیش عالم شد خدا ساز
جہان امروز داد خور می داد　　زما در گوئے اندم خور می داد

خوشی کی ان گھڑیوں میں دربار سے فارغ ہوکر شاہ جہاں حرم سرائے میں آیا تو جن خواتین نے اسے مبارک باد دی، ان میں اس کی بیٹی روشن آرا بیگم بھی شامل تھی۔

بادشاہ نے اس موقع پر خواتینِ قصرِ شاہی کو کئی لاکھ اشرفیاں عطا کیں۔ روشن آرا بیگم کو ایک لاکھ اشرفی سے نوازا۔ لیکن اس مخیّر خاتون نے یہ تمام اشرفیاں اسی وقت حسب معمول غرباء و مساکین میں تقسیم کر دیں۔ اس نے مستحقین کی ایک فہرست بنا رکھی تھی۔ مہینے میں جو رقم اسے خرچ کے لئے باپ اور بھائی کی طرف سے ملتی، سب تقسیم کر دیتی۔ یہ فراخ حوصلہ اور وسیع القلب خاتون تھی۔ سب سے خندہ پیشانی سے ملتی اور ان کے کام آتی۔ خود بادشاہ کے لئے جیسا کہ عرض کیا گیا، بہت بڑا سہارا تھی۔ ہر مشکل موقع پر بادشاہ اس سے مشورہ لیتا اور اس کی رائے پر عمل کرتا۔

عبادت گزار اور عابدہ وزاہدہ خاتون تھی۔ غیبت اور بدگوئی سے متنفر تھی۔ اس کی انہی خوبیوں کی بنا پر شاہ جہاں اس پر اعتماد کرتا تھا اور اس کے بعد اورنگ زیب عالم گیر کی بھی یہ مشیر تھی اور وہ اس کی رائے کو صائب قرار دیتا تھا۔

روشن آرا بیگم نے جمعرات کے روز ۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۰۸۲ھ (ستمبر ۱۶۷۱ء) کو انتقال کیا۔ اس کی موت سے عالم گیر کو بے حد صدمہ ہوا۔ اس نے پہلے تو ضبط وصبر سے کام لینے کی کوشش کی، لیکن جب تجہیز و تکفین کا وقت آیا تو ضبط کے بند ٹوٹ گئے اور زار و قطار رونے لگا۔ آخر صبر کے سوا چارہ نہ تھا۔ دوبارہ دل پر قابو پایا اور بہن کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ اس کو زیادہ تکلیف اس بات کی تھی کہ روشن آرا بیگم زندگی میں اس کا عظیم سہارا تھی اور اس کے مشوروں کو وہ بہت اہمیت دیتا تھا۔ غریبوں اور ناداروں کو اس کی موت سے بالخصوص دکھ ہوا، کیونکہ یہ ان کی مددگار تھی اور اس طبقے سے اس کو خاص تعلق خاطر تھا۔

☆☆☆

ماجدہ قریشیہ

ایک بلند مرتبہ کی حامل خاتون جن کے عمل و کردار کا دامن بڑا وسیع تھا۔

افکار وخیالات کی پاکیزگی اور نظریات وتصورات کی صفائی کے اعتبار سے حضرت ماجدہ رحمۃ اللہ علیہا بڑی مشہور تھیں۔ خاندان قریش سے تعلق رکھتی تھیں اور عالی مرتبہ خاتون تھیں۔ قریش کے کچھ لوگ بحرین میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، یہ انہی میں سے تھیں۔

عادات واطوار کے باب میں سب سے فائق تھیں، حرص وطمع سے سخت نفرت کرتی تھیں اور دل ودماغ میں زہد واتقا کا خوب صورت گلستاں سجا رکھا تھا۔ ''صفوۃ الصفوۃ'' اور ''لواقع الانوار'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ طبیعت میں شرم وحیا کا جذبہ غالب تھا اور لوگوں سے بہت کم لگاؤ رکھتی تھیں۔ زبان کی بے حد نرم تھیں، ہر معاملے میں متوازن اور معتدل تھیں۔

طفولیت کا زمانہ اپنے والد محترم اور اپنے ماموں کی نگرانی اور تربیت میں گزرا۔ یہ دونوں بزرگ اس دور کے علماء وفضلاء میں سے تھے۔ پہلے قرآن مجید پڑھا اس کے بعد تفسیر قرآن پر عبور حاصل کیا۔ باقی علوم کی تحصیل بھی باقاعدہ کی۔ شعر وشاعری سے بھی شغف تھا کہ اس دور کی عرب خواتین اس موضوع کو خصوصیت سے مرکزِ توجہ ٹھہراتی تھیں۔ انساب سے گہرا لگاؤ تھا اور اس باب میں ان کے والد اور ماموں ہی ان کے نگراں ومعلم تھے اور انہی کے التفات خصوصی سے علوم گوناگوں کے حصول کی منزلیں طے کی تھیں۔ بچپن میں کھیل کود اور دوسری چیزوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ صرف تعلیم ہی ان

کا اصل مرکز تھا اور کتابوں کی رفاقت ہی میں شب وروز بسر ہوتے تھے۔

ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ والد اور ماموں کے علاوہ بحرین اور گردو نواح کے دیگر علماء سے بھی کسب فیض کیا، لیکن کن کن علما سے کیا، اس کی تفصیلات نہیں مل سکیں۔ پھر رجال وتراجم کی کتابوں میں یہ بھی مرقوم ہے کہ بے شمار لوگوں نے خود حضرت ماجدہ قریشیہ رحمۃ اللہ علیہا سے تحصیل کی اور دور دراز کا سفر کرکے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا اور اس زمانے کی بعض اہم ہستیوں نے اخذِ علم کے لئے ان کے باب عالی پر دستک دی، مگر افسوس ہے تفصیلات ان کے ناموں کی بھی نہیں مل سکیں۔

وہ سب سے پہلے طالب علم کی قابلیت کا اندازہ کرتیں اور اس بات کا جائزہ لیتیں کہ کس طالب علم کو کس مضمون سے دلچسپی ہے اور اس کی ذہنی سطح کس نوعیت کی ہے۔ پھر اس کے مطابق اس کی تعلیم کا انتظام کرتیں، اگر کسی کو تاریخ ورجال سے لگاؤ ہوتا تو اس طرف لگا دیتیں، اگر قرآن اور اس کے متعلقات سے رغبت ہوتی تو اس مضمون میں اس کی رہنمائی مہیا فرماتیں، اگر میلانِ طبعی انساب اور شعر کی طرف دیکھتیں تو اس انداز سے اس کو تکمیل کے مراحل طے کراتیں، اگر یہ محسوس کرتیں کہ طالب علم کو حصولِ حدیث کا شوق دامن گیر ہے تو اس کو ذخیرۂ احادیث سے روشناس کراتیں۔ کسی کی طبیعت اور رجحان کے خلاف کوئی موضوع اس میں ٹھونسنے کی قائل نہ تھیں۔

ان کا یہ طریقِ تعلیم ایسا فطری اور صحت مندانہ تھا کہ ہر شخص اس کی داد دیتا اور اپنے علم کے قافلے کو اسی نہج پر آگے بڑھانے کی کوشش کرتا۔

طالب علم کی ضروریات کا بھی پورا خیال رکھتیں۔ ان کے اکل وشرب کی کفالت بھی کرتیں، ان کے لباس کا بھی انتظام کرتیں اور کتابیں بھی مہیا فرماتیں، پھر انھیں زہد واتقا کی راہ پر بھی لگاتیں اور تلقین کرتیں کہ کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کیا

جائے اور اپنی ضروریات کے لئے دوسرے کے دست نگر ہونے سے حتی الامکان بچنے کی سعی کی جائے۔

ان کے اقوال بڑے حکیمانہ ہیں۔فرماتی ہیں:

جس شخص نے خواہشات کا دامن پھیلا لیا اس نے اعمال کو ضائع کرلیا۔

اگر دینی امور کو مطمحِ نظر ٹھہرایا جائے اور اس کے ساتھ تمناؤں کی چادر کو وسیع کردیا جائے تو اخلاق وکردار کا پلڑا خالی ہوجاتا ہے۔

مومن کی صفت یہ ہے کہ وہ آخرت کے اہتمام پر زیادہ غور کرے۔اگر زاہد کی آنکھیں یہ دیکھ پائیں کہ متاع دنیا سے اعراض کرنے والوں کے لئے اللہ نے کیا کیا بوقلموں نعمتیں تیار کررکھی ہیں تو وہ لازماً زندگی پر موت کو ترجیح دے۔

وہ فرمایا کرتیں:

پاؤں کی جو حرکت میرے پردۂ سماع سے ٹکراتی ہے اور جتنے قدم میں زمین پر چلتی ہوں، وہ یقیناً مجھے موت کی وادی کی طرف بڑھا رہے ہیں۔

بہرحال حضرت ماجدہ قریشیہ رحمۃ اللہ علیہا ہر اعتبار سے بلند مرتبے کی حامل تھیں اور ان کے عمل وکردار کا دامن بڑا وسیع تھا۔ان کی تربیت نہایت اچھے ماحول میں ہوئی،جس کے آثار ان کی زندگی کے ہر قدم پر نمایاں نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

حمیضہ بنت یاسر

ایک نیک دل خاتون جو خود محدثہ تھیں اور ان کے شوہر بھی محدث تھے۔

حافظ ابن حجرؒ نے ''تہذیب التہذیب'' میں اور مقدسی نے ''الکمال فی معرفۃ الرجال'' میں ان کا ذکر کیا ہے۔

حضرت حمیضہ بنت یاسر رحمۃ اللہ علیہا کم وبیش ۱۶۵ھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کی دادی کا نام یسیرہ تھا جو نہایت متقی اور پرہیز گار خاتون تھیں۔ ان کے والد یاسر بھی بڑے عبادت گزار تھے، ان کے شب وروز اللہ کی عبادت اور ذکر الٰہی میں گزرتے تھے۔ اذان کی آواز کانوں میں پڑتے ہی دنیا کے کام چھوڑ دیتے اور نماز کے لئے مسجد کو روانہ ہو جاتے۔ فرمایا کرتے جب اذان کی صورت میں اللہ کا بلاوا آ گیا تو اس کے مقابلے میں دنیا کے اہم سے اہم اور بڑے سے بڑے امور بھی ہیچ اور ناقابل اعتناء ہیں۔ یاسر کثیر المشاغل شخص تھے، لیکن اس کے باوجود تہجد التزام سے پڑھتے، روزے کثرت سے رکھتے اور نماز باجماعت ادا فرماتے۔ پھر ان میں صرف یہی بات نہ تھی کہ نیکی کے اس دائرے کو اپنی ذات تک محدود رکھتے تھے اور فقط نماز روزے پر اکتفا کرتے تھے۔ وہ نماز روزے کے ساتھ ساتھ بہت بڑی نیکی یہ کرتے تھے کہ غرباء کی مدد کرتے، بیواؤں کی دست گیری فرماتے، مستحقین کا خیال رکھتے اور ہر وہ کام سر انجام دیتے جو لوگوں کی بھلائی کا موجب ہوتا۔

حضرت حمیضہ نے اسی ماحول میں پرورش پائی تھی اور والد کے علاوہ انھوں نے دادی کو بھی انہی اوصاف سے متصف پایا تھا۔ ان کی دادی یسیرہ بھی نہایت عالی کردار اور لوگوں کی ہمدرد و بہی خواہ تھیں اور ان کی تکلیفوں اور دکھ درد میں شریک رہتی تھیں۔

یہ تمام خوبیاں حضرت حمیضہ کی ذات میں جمع ہوگئی تھیں اور وہ خیر کا پیکر بن گئی تھی۔ معاملات کی نہایت صاف تھیں، قرابت داروں اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے میں بہت تیز تھیں۔ کسی کو برائی کا ارتکاب کرتے دیکھتیں تو سخت نفرت کا اظہار کرتیں اور اس کے لئے دعا فرماتیں کہ اے اللہ! یہ شخص سیدھی راہ سے ہٹ گیا ہے، اسے صراطِ مستقیم پر قائم رکھ، اسے برائیوں سے پاک کر دے اور اس کی نیکیوں میں اضافہ فرما۔ یہ تیرا عاجز بندہ ہے، اس کی برائیاں دیکھ کر اس کے بارے میں دلوں میں نفرت وحقارت کے جذبات کروٹ لیتے ہیں، تو اسے برائیوں اور ان کے لوازم سے دور رکھ، اس کو اپنے مخلص بندوں میں شامل فرما۔ اس کے شب وروز کو بہتر بنا، اس کی عادات واطوار میں پاکیزگی پیدا کر، اسے توفیق دے کہ یہ غلطیوں سے تائب ہوکر لوگوں کے لئے اور خود اپنی ذات کے لئے نفع ونقصان کا فیصلہ کر سکے اور یہ تمیز کر سکے کہ کون سا عمل مضرت رساں ہے اور کون سا فائدہ مند۔

بچوں کے بارے میں کہا کرتی تھیں کہ بچے اس صورت میں بلند اخلاق اور صاف کردار کے مالک ہوسکتے ہیں، جب کہ شروع ہی سے ان کی بہتر تربیت کا اہتمام کیا جائے اور انھیں تعلیم دی جائے کہ کن چیزوں سے انھیں دامن کشاں رہنا چاہئے اور کن امور پر عمل کی دیواریں استوار کرنی چاہئیں۔ انھیں ابتداء ہی سے یہ بھی بتانا چاہئے کہ وہ بڑوں کا احترام کریں اور ان کی تکریم کو اپنے لئے ضروری قرار دیں۔ جب تک بچوں کو یوم اول ہی سے بہتر راہ پر نہیں لگایا جائے گا اور نیکی اور برائی کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ کر ان کی ذہنی سطح کے مطابق دونوں میں فرق کی نوعیت کو واضح نہیں کیا جائے گا، ان کی تربیت کا بہتر اہتمام نہیں ہوسکتا۔

عاقل وفہیم لوگوں کا کہنا ہے کہ بچوں کے سامنے کبھی غلط کام نہ کرو، کبھی کسی کے

ساتھ سختی سے بات نہ کرو، کسی سے ناشائستہ گفتگو نہ کرو، بچوں کی موجودگی میں باہم بے تکلفی کا مظاہرہ نہ کرو، کیونکہ بچے کا ذہن آئینے کی طرح صاف ہوتا ہے، وہ جیسی حرکتیں دوسرے کو کرتے دیکھتا ہے، اسی کی نقل اتارنی شروع کردیتا ہے، اس لئے بچے کے سامنے اچھی اور حسن اخلاق سے تعلق رکھنے والی باتیں کرو، تاکہ اس میں بھی یہی داعیہ پیدا ہو اور وہ اچھائی کو بچپن ہی سے اپنا نصب العین ٹھہرا لے۔

حضرت حمیضہ بنت یاسر روایتِ حدیث کے باب میں بھی ممتاز تھیں۔ انھوں نے اپنی دادی یسیرہ سے حدیث روایت کی جو ایک راویہ حدیث تھیں۔ حضرت حمیضہ نے بعض اور اصحابِ حدیث سے بھی احادیث رسول ﷺ روایت کیں اور اس ضمن میں احتیاط کا ثبوت بہم پہنچایا۔

ان سے مروی روایات احادیث کی متعدد کتابوں میں مذکور ہیں مثلاً صحاح ستہ میں سے سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی میں ان سے مروی حدیثیں مذکور ہیں۔ یہ ایک ثقہ اور روایت حدیث کے باب میں محتاط خاتون تھیں، چنانچہ ابن حبان نے ان کا ذکر ثقات میں کیا ہے۔

ان کی شادی بھی ایک محدث سے ہوئی تھی، جن کا نام عثمان تھا۔ یہ بھی نہایت پرہیزگار بزرگ تھے۔

ان کی وفات ۲۲۰ھ کے بعد ہوئی۔

☆☆☆

عائشہ بنت عثمانؒ

اس خلیفہ کی بیٹی کے حالات جن کے ساتھ ایسی وحشت ناک درندگی کا مظاہرہ کیا گیا تھا کہ زمین وآسمان کانپ اٹھے تھے۔

حضرت عائشہ رحمۃ اللہ علیہا خلیفۂ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی تھیں۔ حضرت عثمان، رسول اللہ ﷺ کے وہ صحابی تھے جنھوں نے ہر موقع پر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی۔ مختلف جنگوں میں دل کھول کر چندہ دیا اور مجاہدین کی امداد کی۔ انھیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد خلیفہ مقرر کیا گیا تھا۔ انھوں نے بارہ سال خلافت کے فرائض انجام دیئے۔ خلافت کے ابتدائی چھ سال بڑے آرام وسکون سے گزرے، لیکن آخری چھ سالوں میں ہنگامہ آرائی شروع ہوگئی جوان کی شہادت پر منتج ہوئی۔ بلوائیوں نے ان کے مکان کا محاصرہ کرلیا اور امداد واعانت کے تمام راستے بند کردیئے۔ صحابہ نے امداد کرنا اور بلوائیوں کا مقابلہ کرنا چاہا مگر حضرت عثمانؓ نے روک دیا اور فرمایا میں اپنی ذاتی حفاظت کے لئے مسلمانوں کی جانیں تلف نہیں کرنا چاہتا۔ مسلمانوں کا فرض اسلام کی حفاظت ہے، کسی خلیفہ یا امیر کا ذاتی تحفظ ودفاع ہرگز ان کے فرائض میں داخل نہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو بھیجا کہ ان کی امداد کی جائے، مگر حضرت عثمانؓ نے شکریے کے ساتھ دونوں بھائیوں کو واپس کردیا اور فرمایا اللہ ہی میرا حافظ وناصر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلوائی پورے مدینے پر قابض ہوگئے اور حضرت عثمان کے مکان کے اندر جا گھسے۔ حضرت عثمانؓ قرآن مجید کی

تلاوت کرر ہے تھے کہ انھیں شہید کر دیا گیا اور اس وقت ظلم وستم کی حد ہوگئی جب کہ رسول پاک کے اس داماد اور مسلمانوں کے خلیفۂ راشد کو قبرستان میں دفن کرنے سے بھی روک دیا گیا۔ ان کا جنازہ چند صحابہ نے رات کی تاریکی میں اٹھایا اور بڑی مشکل سے تدفین کے مراحل طے کئے۔

یہ حضرت عائشہ رحمۃ اللہ علیہا انہی کی لڑکی تھیں۔ ان کے بارے میں ابن قتیبہ کی ''الامامۃ والسیاسۃ''، جاحظ کی ''البیان والتبیین''، ابن عبداللہ کی ''العقد الفرید'' اور طیفور کی ''بلاغات النساء'' میں بعض باتیں بیان کی گئی ہیں، مگر تفصیلی حالات کہیں سے نہیں مل سکے، صرف ان کی ایک تقریر ملتی ہے جو انھوں نے اپنے جلیل القدر باپ کی شہادت کے موقع پر بلوائیوں اور دیگر مسلمانوں کے سامنے کی۔ اس تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قادر الکلام اور صاف گو خاتون تھیں اور ان کی زبان فصاحت و بلاغت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔

فرماتی ہیں:

''اے ماتم گسارانِ عثمان اور اے قاتلینِ خلیفۂ راشد! آج ہم پر غم وافسوس کی گھٹائیں چھا گئی ہیں، حزن وملال نے ہمیں گھیر رکھا ہے اور غم واندوہ کی کیفیتیں ہم پر طاری ہیں۔ عثمان اس دنیا سے رخصت ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بے دردی سے ان کا خون بہایا گیا اور حرم رسول میں ان پر عین اس وقت تلوار چلائی گئی جب وہ کلام پاک کی تلاوت میں مصروف تھے۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے سے بھی روک دیا گیا۔ وہ اس درجہ مسلمانوں کے جان ومال کے تحفظ کے خواہاں تھے کہ انھوں نے اپنی حفاظت ومدافعت کے لئے کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ چاہتے تو اللہ عزوجل کے حضور بلوائیوں کی تباہی کے لئے دعا کرتے۔ مسلمانوں سے اعانت ونصرت کے طالب ہوتے اور مہاجرین کو اپنی صداقت شعاری کے لئے بطور شاہد کے

پیش کرتے اور ان کی تلواروں کو اپنے لئے استعمال میں لاتے، مگر انھوں نے اس قسم کا کوئی قدم نہیں اٹھایا اور اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا۔

''اے درندہ صفت انسانو! تم نے ان کے خون کو ارزاں کیا اور اس وحشت ناک درندگی کا مظاہرہ کیا کہ زمین و آسمان کانپ اٹھے۔ جن لوگوں نے اس منظر کو دیکھا یا تمھاری ان ستم رانیوں کے بارے میں کچھ سنا، وہ انگشت بدنداں رہ گئے اور ان کے کلیجے منہ کو آنے لگے۔

''تم نے عثمان کے اہلِ خانہ کے سامنے ان کو قتل کیا، تم نے ان کی داڑھی نوچی، ان کو گالیاں دیں اور رسول اللہ ﷺ کے اس خلیفہ کے ساتھ تم نے وہ سلوک روا رکھا جو کسی بڑے سے بڑے دشمن کے ساتھ بھی نہیں روا رکھا جا سکتا''۔

''تم نے اللہ کی حدود سے تجاوز کیا، اس کی فرماں برداری کے تمام تقاضوں کو خیر باد کہا۔ اس کے رسول کے دائرۂ اطاعت سے باہر قدم رکھا اور انسانیت کے حقوق کو پامال کیا۔ تم کس منہ سے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو؟ تمھیں رسول کی محبت کا دم بھرتے ہوئے شرم نہیں آتی اور اپنے جذبۂ اطاعت کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے تمھاری گردنیں ندامت سے جھک نہیں جاتیں؟ تم ظلم کے مجسمے اور ستم کے پیکر ہو، تمھاری ہر حرکت حدودِ اسلام سے باہر اور ہر قدم ایمان کے تقاضوں کے منافی ہے''۔

''میرے باپ نے مسلمانوں کی سب سے زیادہ مدد کی۔ اللہ کے رسول کی اطاعت میں پیش پیش رہے، انھوں نے اپنی تمام مساعی خدمتِ اسلام کے لئے وقف کر دیں۔ جب مسلمانوں کی ضروریات نے ان کے دروازے پر دستک دی، وہ حاضر ہو گئے اور گھر کا سارا اثاثہ ان کی خدمت کے لئے آنحضرت فداہ ابی و امی کے حضور پیش کر دیا۔ کیا تم میں سے کوئی ایک شخص بھی ان خوبیوں سے بہرہ مندی اور ان اوصاف حسنہ سے متصف ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے؟

''وہ اس دنیا میں اللہ کی اطاعت کا نشان تھے۔ انھیں دیکھ کر سخت سے سخت دل بھی نرمی ولینت کی تصویریں بن جاتا تھا۔ وہ سختی سے نفور اور رفاقت سے قریب تر تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کو ہدف ستم نہیں ٹھہرایا، کبھی کسی ستم راں کی اعانت نہیں کی، کبھی کسی کو تنگ نہیں کیا، کبھی کسی کے درپے آزار نہیں ہوئے، کبھی اللہ کی نافرمانی کے مرتکب نہیں ہوئے، کبھی کسی کو سبّ وشتم نہیں کیا، کبھی کسی کو قتل نہیں کیا۔ جب ان کی کیفیت یہ تھی تو تم نے کیوں ان پر ظلم وستم کی ٹھانی؟ اور کیوں انھیں موت کا لقمہ بنایا؟ تمھارا یہ اتنا بڑا گناہ ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہوسکتی۔

''پھر تعجب وحیرت کی بات یہ ہے کہ اس ہولناک اقدام کی وجہ سے تمھارے چہروں پر ندامت کے آثار بھی نظر نہیں آتے، جس کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ تم اس پر خوش ہو اور خلیفۂ راشد کو نشانۂ ستم بنا کر بزعم خویش تم نے کوئی بہت اچھا کام کیا ہے۔

''حضرت عثمانؓ بے گناہ تھے، وہ یقیناً حق دار مغفرت ہیں اور اللہ نے اپنے رسول پاک کی زبانی دنیا ہی میں انھیں جنت کی خوش خبری سنادی تھی اور وہ عشرۂ مبشرہ میں سے تھے۔ لیکن تم بتاؤ تم نے اتنے بڑے انسان کو اس بے دردی کے ساتھ موت کی وادی میں ڈھکیل کر اسلام کی کیا خدمت انجام دی؟ کیا تم نے ہمیشہ کے لئے ملامت کو اپنے لئے ضروری نہیں قرار دے لیا اور اپنے دامن کو معصیت سے آلودہ نہیں کرلیا؟''

کتابوں میں مرقوم ہے کہ اس تقریر سے دشمن ودوست زار وقطار رونے لگے اور کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

۴۱ھ میں حضرت امیر معاویہ مدینہ منورہ تشریف لائے اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے مکان میں داخل ہوئے تو حضرت عائشہ بنت عثمان رحمۃ اللہ علیہا ان کے پاس آکر رونے لگیں اور اپنے باپ کی موت کا دردناک الفاظ میں تذکرہ کیا۔

امیر معاویہ نے جواب دیا:

لوگوں نے ہماری اطاعت قبول کر لی ہے، جس کے بدلے میں ہم نے ان کو امان وتحفظ کی ضمانت دے دی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اب ہم نرمی ورأفت کا ثبوت دیں اور عملاً یا قولاً ظلم وزیادتی سے بالکل باز رہیں۔ تلوار ہر شخص کے ہاتھ میں ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تلوار کا نشانہ کون بنتا ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ظالم اور مظلوم کے فرق کو ملحوظ رکھا جائے۔

''بھتیجی! تم صبر سے کام لو اور کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالو جو کسی موقع پر بھی کسی کے لئے نقصان کا باعث بن سکتی ہو''۔

☆☆☆

حضرت حبیبہ عدویہؒ

ایک مافوق الفطرت خاتون جن کے شب و روز کا ایک ایک ثانیہ اللہ کی عبادت میں صرف ہوتا تھا۔

بصرہ میں پہلی صدی ہجری میں متعدد ایسی خواتین پیدا ہوئیں جو بہ درجہ غایت پرہیزگار تھیں۔ پورے عالم اسلامی میں ان خواتین کی شہرت تھی اور انھیں نہایت ذی مرتبت گردانا جاتا تھا، مثلاً رابعہ عدویہ، رابعہ قیسیہ، رابعہ بنت اسماعیل وغیرہ وہ خواتین تھیں جو صالحیت اور پرہیزگاری کے اونچے مقام پر فائز تھیں۔ ان کی پوری زندگی اللہ کی عبادت میں گزری اور خوفِ خدا اور تقوے کو انھوں نے اپنا شعار بنائے رکھا۔ ان پاک باز خواتین میں سے ایک بلند مرتبت خاتون حبیبہ عدویہ تھی۔ ان کے حالات ابن جوزی نے صفوۃ الصفوہ میں بیان کئے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی مافوق الفطرت عورت تھیں اور ان کے شب و روز کا ایک ایک ثانیہ اللہ کی عبادت میں صرف ہوتا تھا۔ یہ بصرہ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔

اصل بات یہ ہے کہ خلفاء راشدین کے بعد چاروں طرف فتنہ وفساد پھیل گیا تھا اور ہر سو برائیاں نظر آنے لگیں تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض لوگوں میں اس کا شدید ردعمل ہوا اور ان میں انتہا درجے کا تقویٰ پیدا ہوگیا۔ وہ دنیا ہی سے متنفر ہوگئے اور مادیت کو خیرباد کہہ دیا۔ یہ کیفیت جہاں مردوں میں پیدا ہوئی وہاں بہت سی عورتوں میں بھی اس کے آثار نمودار ہوئے اور انھوں نے دنیوی امور سے قطع علائق کر کے اللہ کی عبادت کے لئے اپنے کو خاص کرلیا۔ ان میں نہ حب جاہ کا جذبہ باقی رہا اور نہ دنیا طلبی کی حرص کا کوئی شائبہ ان کے اندر ابھرا۔ وہ اللہ کے مخلص بندوں میں سے ہوگئیں اور ان کی زندگی کا دھارا یکسر بدل گیا۔

حبیبہ عدویہ کے زمانۂ ولادت کے بارے میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا کہ کون سا ہے، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس دور میں پیدا ہوئیں جب صحابۂ کرام ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، نیکیوں کی جگہ برائیاں لے رہی تھیں اور فتنے مختلف شکلوں اور نئی نئی صورتوں میں ابھر رہے تھے۔ یہ اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا، وہ لوگ ختم ہو گئے ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت ورفاقت کا شرف حاصل کیا تھا۔ وہ لوگ آسمان کے نیچے اور اس زمین کے اوپر نیک ترین اور اللہ کے برگزیدہ بندے تھے۔ اس فلک پیر نے اب تک ان جیسی بلند اخلاق اور عالی کردار نہ کوئی مخلوق دیکھی اور نہ قیامت تک دیکھے گا۔ وہ خدا کے عظیم المرتبت اور رفیع الشان بندے تھے۔ انھیں اللہ کے رسول کی رفاقت کا براہ راست شرف حاصل ہوا تھا۔ ان کے کانوں کے پردے سے بغیر کسی واسطے کے سرورِ کائنات کے ارشاداتِ گرامی ٹکرائے۔ وہ غرور سے پاک اور فخر ورعونت سے مبرا تھے۔

پھر وہ لوگ بھی کس درجہ سعادت مند تھے، جن کی آنکھیں ان حضرات کی زیارت سے متمتع ہوئیں، جنھوں نے ان کی باتیں سنیں، جو ان کے افکارِ عالیہ سے مستفید ہوئے اور جنھیں ان کے ساتھ رہنے کے مواقع میسر آئے۔ وہ دور انتہائی تقوی کا دور تھا۔ اب چاروں طرف برائیاں ہی برائیاں نظر آ رہی ہیں، نیکی تک پہنچنے کے تمام راستے یکے بعد دیگرے تیزی سے بند ہو رہے ہیں۔

ان کی دعا ہے: اے پروردگار عالم! ہم تیرے گناہ گار بندے ہیں، ہم برائیوں کا بھاری بوجھ اٹھا کر تیرے دربار میں آ رہے ہیں، اس دنیا کو ہم نے شر کی مختلف قسموں سے بھر دیا ہے۔ تو ہم پر رحم فرما اور ہمیں صراط مستقیم پر لگائے رکھ۔

ان کے اس قسم کے فرامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تابعین کے دور کے بعد پیدا ہوئیں۔

معلوم ہوتا ہے انھوں نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ ادبیت اور شعر و شاعری

سے بھی اتنا لگاؤ نہیں تھا، البتہ پرہیز گار بہت تھیں، ہر وقت اللہ سے خوف زدہ رہتیں۔ان کے اساتذہ کی فہرست میں کسی اہم شخصیت کا نام نہیں ملتا، صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ گھر ہی میں تعلیم حاصل کی، ان کے دادا، والد اور والدہ تمام لوگ از حد متقی تھے اور حدیث وفقہ سے شغف رکھتے تھے۔حبیبہ عدویہ نے انہیں سے تعلیم حاصل کی اور انہیں کے فیض سے دین داری کی راہوں پر گام فرسا ہوئیں۔

ابن جوزی نے لکھا ہے کہ ان کا طریقِ عبادت یہ تھا کہ رات کو نماز کے لئے کھڑی ہوتیں تو چادر اور دوپٹے کو اچی طرح جسم پر لپیٹ لیتیں اور کہتیں اے اللہ! ستارے اپنی منزل پوری کر کے واپس جا رہے ہیں، لوگوں کی آنکھوں پر نیند نے تسلط جما لیا ہے، بادشاہوں نے محلوں کے دروازے بند کر لئے ہیں، صرف ایک دروازہ کھلا ہے جس پر میں اپنے نحیف وکم زور ہاتھوں سے دستک دے رہی ہوں اور وہ تیرا دروازہ ہے۔تیرے سوا اب کوئی سننے والا نہیں، سب کے کان بند ہو گئے ہیں۔اے پروردگار عالم! مجھ عاجز وناتواں کی دعا سن لے اور میرے لئے اپنی رحمت کے باب کھول دے۔ تمام مخلوقِ محو استراحت ہے، مگر میں تیرے سامنے پورے عجز وانکسار کے ساتھ ہاتھ پھیلائے کھڑی ہوں۔تو ہی میرا مالک، تو ہی مغفرت فرمانے والا اور تو ہی فضل وکرم کی بارش کرنے والا ہے۔

جب رات ڈھل جاتی اور ردائے سیاہ چہرۂ شب سے سرک جاتی اور سحری کا وقت قریب آ جاتا تو ہاتھوں کو بارگاہِ خداوندی میں مزید پھیلا دیتیں اور کہتیں اے میرے مالک! رات کے اندھیرے چھٹ گئے ہیں اور دن کی روشنی نمودار ہو رہی ہے۔کاش کہ میں تیری بارگاہ میں کامیاب ہو جاؤں، کیا میری رات کی عبادت نے تیرے حضور درجۂ قبولیت حاصل کر لیا؟ کیا ایسا تو نہیں کہ تو نے میری اس عاجزانہ التجا کو مسترد کر دیا۔ میں راندۂ درگاہ قرار پاؤں گی اور تیری مہربانیوں سے تہی دامن ہو جاؤں گی۔اے اللہ! مجھے اپنے دربار میں عزت عطا فرمائیو اور خالی ہاتھ نہ لوٹائیو۔میرے دل میں تیرے جود وکرم

کی مسرتوں کے سوا اور کوئی شے نہیں ہے۔

یہ خاتون رات کو قیام کرتیں اور دن کو روزے رکھتیں۔ اللہ کے حضور قیام کرتے کرتے ان کے پاؤں سوج جاتے لیکن کسی وقت اللہ کی یاد سے ان کا دل خالی نہ ہوتا۔

ان کے اندر لوگوں کی خدمت کا جذبہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، کسی معذور کو دیکھتیں تو تڑپ اٹھتیں اور اس کی خدمت کے لئے دوڑتیں۔ عورتوں، بوڑھوں اور بے بس لوگوں کے کام آتیں۔ ان کے لئے کھانا تیار کرتیں اور ان کے گھر کے کام کاج کرتیں۔

اللہ نے ان کو قرآن فہمی کا پاکیزہ ذوق عطا فرمایا تھا۔ بے شمار بچوں اور عورتوں نے ان سے قرآن کی تعلیم حاصل کی، تعلیم اگرچہ زیادہ نہ تھی مگر قرآن کثرت سے پڑھتی تھیں اور اس کے مطالب و معانی پر نظر رکھتی تھیں۔

ان کی اولاد کو بھی اللہ نے اسی طرح تقوی وتدین سے نوازا تھا، جس طرح کہ خود ان کو نوازا تھا۔ ان کی ایک بیٹی نے گھر میں چھوٹا مدرسہ قائم کر رکھا تھا، جس میں وہ بصرہ کی عورتوں کو قرآن اور علوم دینیہ کی تعلیم سے آراستہ کرتی تھیں۔ ان کی شاگرد خواتین کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ان کی شاگردوں میں بصرہ کے حکام اور اونچے خاندانوں کی لڑکیاں شامل تھیں۔ جو عورت ایک مرتبہ ان کے درس میں شریک ہو جاتی، وہ دوسری مرتبہ آنے کے لئے بے تاب رہتی۔ یہ بھی اپنی والدہ حبیبہ عدویہ کی طرح متدین اور پرہیزگار تھیں۔ سوائے تلاوتِ قرآن اور اس کی تعلیم و تعلم کے کسی کام سے انھیں دلچسپی نہ تھی۔

حضرت حبیبہ عدویہ رحمۃ اللہ علیہا لوگوں کی سفارش بھی کرتیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی کی جائز سفارش ضرور کرنا چاہئے۔ کیونکہ جو شخص دوسرے کے کام آتا ہے، اللہ اس کے کام آتا ہے۔ جو دوسرے کی بدخواہی کرتا اور ایذاء رسانی کے درپے رہتا ہے، اللہ اسے ایذاء پہنچاتا ہے۔

ان کی وفات ۱۰۰ھ کے لگ بھگ ہوئی۔ تذکرہ نویسوں نے ان کی عمر ۶۵ برس لکھی ہے۔

☆☆☆

اسما بنت اسد

ایک عقلمند خاتون جس کا کہنا تھا کہ عورت جتنی زیادہ علم وفضل کی مالک ہوگی اس کے بچے اسی قدر علوم سے دلچسپی رکھیں گے۔

''ائمہ دین میں سے آپ کے نزدیک سب سے بڑا امام کون ہے''؟

''امام ابو حنیفہ''۔

''اللہ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے، وہ واقعی بہت بڑے امام تھے''؟

''ہاں! ان کی نظر بہت وسیع تھی اور فقاہت میں ان کا کوئی حریف نہ تھا''۔

''وہ فقہ پر عبور رکھتے تھے''؟

''عبور کا کیا مطلب؟ وہ فقہ کے ایک مستقل مکتب فکر کے بانی تھے''۔

''ان کا اندازِ فقاہت کیسا تھا؟''

''وہ مشکل سے مشکل مسائل کو نہایت آسانی سے حل کر دیتے اور مسائل کی چند الفاظ میں تشریح فرما دیتے تھے''۔

''ان کے مشہور شاگرد کون کون ہیں''؟

''امام ابو یوسف، امام محمد اور امام زفران کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں''۔

حضرت اسما بنت اسد بن فرات رحمۃ اللہ علیہا کے ایک مشہور شاگرد عبداللہ بن یحیٰی نے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی فقہ کے بارے میں چند سوال کیے جن کے انھوں نے آسان اور عام فہم انداز میں یہ جواب دیے۔

اسما بنت اسد قیروان کی رہنے والی تھیں اور علم وفضل کے اعتبار سے اپنے دور میں نہ صرف سب خواتین سے آگے تھیں بلکہ اکثر مرد علماء وفقہاء بھی ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ان کے حالات ''شہیرات التونسیات'' میں حسن حسنی عبدالوہاب نے بیان کئے ہیں۔

یہ جلیل القدر خاتون ۱۹۲ھ میں قیروان کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد اسد بن فرات بہت بڑے فقیہ، محدث اور رجال وسیر کے عالم تھے۔انھوں نے اپنی اس بیٹی کو بڑی محنت سے تعلیم دلائی اور بڑے بڑے علماء وفقہاء کی خدمت میں بھیجا۔انھوں نے ان کی تربیت کا خاص طور سے اہتمام کیا اور تمام علوم کے حصول کے مواقع فراہم کئے۔ یہ عالمِ طفولیت میں تھیں کہ ان کے والد جناب اسد بن فرات اِنھیں علمی مجلسوں میں اپنے ساتھ لے جاتے اور انھیں حدیث وفقہ کے نکات سمجھاتے۔فقہی مناظروں اور بحث وتمحیص کی مجلسوں میں بھی وہ انھیں اپنے ساتھ رکھتے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ علم وادراک کے تمام گوشوں پر حاوی ہوگئیں۔رجال وسیر پر عبور حاصل کرلیا اور حدیث وفقہ اور اس دور کے مروجہ علوم میں درجۂ کمال کو پہنچیں۔

اس زمانے میں قیروان ایک عظیم علمی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا اور علماء حدیث وفقہ کی بہت بڑی جماعت اس میں فروکش تھی۔ جابجا علمی محفلیں جمتی اور مختلف موضوعات پر آزادانہ گفتگو ہوتی۔اسما کے والد ان سب میں شرکت کرتے اور اپنی اس بیٹی کو ساتھ رکھتے۔قیروان میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے معتقد بھی خاصی تعداد میں تھے اور امام مالک اور امام شافعی (رحمہما اللہ) کے متبعین بھی۔اس زمانے میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی ان قربانیوں کی بڑی شہرت تھی جو انھوں نے خلقِ قرآن کے مسئلے سے متعلق دی تھیں اور جو عباسی حکمراں مامون الرشید کے افکار وخیالات کے خلاف ایک

زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتی تھیں۔ امام احمدؒ نے اپنی ان قربانیوں کی بدولت ہر طبقے کے علماء وزعماء کے دل جیت لئے تھے اور سب لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔

مامون الرشید کی کوششوں سے کلامی بحثوں کا بھی آغاز ہو چکا تھا اور فلسفہ وحکمت کی گرفت دلوں پر خاصی گہری ہوگئی تھی۔ اسما ان سب مباحث سے آشنا تھیں اور بسا اوقات ایک فریق کی حیثیت سے ان میں شریک ہوتی تھیں۔

یہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متبعین میں سے تھیں اور ان کی فقہ پر عبور رکھتی تھیں۔ اس مسلک کے فقہاء میں ان کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا کیونکہ اس باب میں یہ بے حد معلومات رکھتی تھیں۔ مختلف علوم کی تحصیل کے بارے میں یہ خاتون بہت وسیع القلب تھیں اور ان کا عقیدہ تھا کہ علوم میں حد بندی قلت معلومات اور کم عقلی کا نتیجہ ہے۔ ہر شخص کو اپنی معلومات بڑھانے کے لئے ہر قسم کے علوم سے متمتع ہونا چاہئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک مجلس میں فرمایا:

علم کی اپنی ایک تعریف ہے، علم کا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کو تنگ نظری اور تعصب کی بیماری سے نجات دلاتا ہے۔ جو شخص جتنا وسیع المطالعہ اور وسعت معلومات کا حامل ہوگا، اس کا دل اسی نسبت سے حسد وکینہ اور بغض وعداوت کے جراثیم سے پاک ہوگا۔ علم ایک عظیم ورثہ ہے، جسے ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل ہوتے رہنا چاہئے۔ علم ذہن کو جلا بخشتا ہے، دماغ کو نورِ بصیرت عطا کرتا اور دل کو خاص قسم کی پاکیزگی سے نوازتا ہے۔ جو لوگ علم تفسیر حاصل کرتے اور فقہ سے جی چراتے ہیں، وہ بھی علم کے دشمن ہیں اور جو فقہ کو حدیثِ رسول اللہ ﷺ پر ترجیح دیتے ہیں وہ بھی اپنی جہالت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، اور جو فقہ سے اغماض کرکے تاریخ اور امم سابقہ کے واقعات پر عبور حاصل کرتے ہیں، وہ بھی انصاف کے تقاضوں سے منحرف ہوتے ہیں، جب تک

قرأت، تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ کے تمام علوم حاصل نہیں کئے جائیں گے۔ ذہن سمٹے اور سکڑے رہیں گے، ان کے سامنے دلوں کی تازگی اور شگفتگی کے دریچے نہیں کھل سکیں گے۔ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی متبع ہوں، ان کی فقہ اور ان کے فقہی رجحانات وافکار کو صحیح سمجھتی ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کی فقہ انسانی ذہن کے مطابق ہے اور مسائل کے بارے میں ان کی تعبیر ووضاحت پر اعتماد کرنا چاہئے۔ لیکن میں علم کو اسی دائرے میں محصور نہیں سمجھتی۔ میرے نزدیک علم کے حدود بہت وسیع ہیں اور اس کا دائرہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر نیا سورج نئی ضرورتیں لے کر طلوع ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی غور وفکر کی سمتیں قدرتی طور پر بدل جاتی ہیں۔ بوقلموں ایجادات وضروریات کے ساتھ لازمی طور پر بوقلموں علوم معرضِ ظہور میں آئیں گے، جن کی وجہ سوچ بچار کی نئی سے نئی راہیں کھلیں گی۔

ان کا کہنا ہے کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی علوم وفنون سے بہرہ مند ہونا چاہئے اور اپنے فہم وفکر کے زاویوں کو بدلنے کے لئے کوشاں ہونا چاہئے۔ عورت جتنی زیادہ علم وفضل کی مالک ہوگی، اس کے بچے اسی قدر علوم سے دلچسپی رکھیں گے۔ اگر عورت اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم رہے گی تو بچوں کے دل میں علم کی محبت جاگزیں نہیں ہوسکے گی۔ وہ خوش قسمت ماں ہے جو اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے سازگار ماحول پیدا کرتی اور خود معلّمہ کے فرائض انجام دیتی ہے۔

اسما بنت اسد اگرچہ فقہ امام ابوحنیفہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن دیگر ائمہ محدثین وفقہاء کی بھی دل سے قدر کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک متبع سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

امام شافعیؒ کی فقہ بدرجہ غایت واضح اور منقح ہے۔ وہ بہت بڑے فقیہ تھے اور ان

کی نظر مسائل کے تمام گوشوں کو گھیرے ہوئے تھی۔ نیکی، تقوی، فقاہت، حدیث اور اسلوب بیان واظہار میں امام شافعی سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ان امور کو واضح کیا ہے جو وقت کے ساتھ پوری ہم آہنگی رکھتے ہیں اور جن کو لائق اعتناء قرار دینا ضروری تھا۔

اسی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرمایا:

امام مالک اصحاب مدینہ کو خوب سمجھتے ہیں اور ان کے متعلق ان کی رائے بڑی صائب ہے۔ وہ تعاملِ اہل مدینہ کو خاص حیثیت دیتے ہیں اور ان کی یہ رائے بالکل صحیح ہے، کیونکہ مدینہ منورہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کا مسکن تھا۔ درحقیقت اسی بابرکت شہر سے اسلام کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس میں مسلمانوں نے بڑے بڑے معاملات سرانجام دیئے اور یہیں سے اسلام کی تبلیغ وترویج کے لئے راہیں ہموار ہوئیں، لہٰذا اگر امام مالک یا کوئی اور بزرگ تعاملِ اہلِ مدینہ کو فوقیت دیتے ہیں تو ان کا یہ موقف بالکل صحیح ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کی یہ رائے ہے کہ وہ ایک جلیل القدر امام ہیں۔ ان کا تعلق براہ راست رسول اللہ ﷺ کے فرامین وارشادات سے ہے اور وہ اس سے شدید وابستگی رکھتے ہیں۔ خلقِ قرآن کے سلسلے میں انھوں نے جو قربانیاں دیں وہ اسلام کی عظیم خدمت ہے۔ اپنی جان اور مال کو کلیۃً اسلام کے حوالے کر دینا کوئی آسان کام نہیں۔

ایک شخص نے ان سے سوال کیا۔

آپ امام ابوحنیفہ کی تتبع ہیں؟

جی ہاں۔

لیکن آپ دوسرے علماء وفقہاء کی بھی تعریف کرتی ہیں۔

کیوں نہ کروں، کیا انھوں نے اسلام کی خدمت نہیں کی؟

یہ حضرات ایک دوسرے کے مخالف نہیں تھے؟

بالکل نہیں۔ یہ مسلمانوں کے سچے خادم۔ اسلام کے نہایت مخلص دوست اور اللہ کے برگزیدہ بندے تھے۔

سوال ہوا کیا ان کی تکریم سب پر فرض ہے؟

سب کے لئے ضروری ہے کہ ان کا اکرام کریں اور انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھیں۔

اسما اسلام کی ایک جلیل القدر بیٹی تھیں، بزرگان دین کی انتہائی تعظیم کرتی تھیں، اگر چہ ان کا شمار فقہاء اہل عراق میں ہوتا ہے، مگر تمام فقہی مسالک پر نظر رکھتی تھیں۔ ان کا انتقال ۲۵۰ھ میں ہوا۔

☆☆☆

حمیدہ بنت عبید

وہ خوش قسمت خاتون جنھیں جلیل القدر محدثین سے سماع حدیث کا شرف حاصل ہوا تھا۔

حمیدہ بنت عبیدہ بن رفاعہ انصاریہ کے حالات تاریخ و رجال کی مختلف کتابوں میں بیان ہوئے ہیں، مثلاً ''تہذیب التہذیب'' میں حافظ ابن حجرؒ نے، ''طبقات الاتقیاء'' میں ابن سحبان نے اور ''الکمال فی معرفۃ الرجال'' میں علامہ عبدالغنی مقدسی نے ان کے واقعات اور ان کی علمی و دینی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔

یہ ۷۰ھ یا ۷۲ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئیں۔ مدینہ اس زمانے میں فقہاء کا مرکز، محدثین کا گہوارہ اور علماء دین کا مرجع تھا۔ اہل مدینہ کی رائے کو دینی معاملات میں قطعی سمجھا جاتا تھا اور شرعی امور میں ان کے فیصلے اور فتوے اور رائے کو حرفِ آخر گردانا جاتا تھا۔ مدینہ منورہ میں اس وقت متعدد صحابہ کرام موجود تھے اور حصولِ علم کے لئے لوگ دور دراز سے سفر کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ حضرت حمیدہ بنت عبید رحمۃ اللہ علیہا جس خاندان میں پیدا ہوئیں وہ بھی علم اور صلاح و تقوی کے اعتبار سے اونچے درجے کا خاندان تھا۔ لوگ اس خاندان کے افراد کی قدر کرتے تھے اور فہم مسائل اور تحصیل علم کے لئے بعض اوقات طویل مسافت طے کر کے ان کے پاس آتے اور ان سے فیض یاب ہوتے تھے۔ اس خاندان کی علمی فیض رسانیوں کی وجہ سے ان کی ہم نشینی کو بڑی سعادت خیال کیا جاتا تھا۔

حضرت حمیدہ بنت عبید رحمۃ اللہ علیہا کی تربیت بھی اسی انداز سے ہوئی تھی اور

ان کی تعلیم کے لئے بڑا اہتمام کیا گیا تھا اور انھیں جلیل القدر محدثین سے سماع حدیث کا شرف حاصل ہوا تھا، حتی کہ متعدد صحابہ سے بھی انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی احادیث روایت کیں۔ اندازہ کیجئے یہ کس قدر خوش قسمت خاتون ہیں جنھیں ان حضرات کی زیارت اور ان سے حدیث روایت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی جنھوں نے براہ راست رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تھا، آپ سے گفتگو کی تھی، آپ کی خدمت میں رہے تھے اور آپ کی معیت میں سفر وحضر کی مبارک گھڑیاں گزاری تھیں۔ پھر ان کو ان بلند بخت لوگوں سے ملاقات اور ان کے تلمذ کا بھی موقع ملا، جنھیں صحابہ کرام کی شاگردی وہم نشینی کی سعادت میسر آئی اور وہ تابعین کہلائے۔ غرض یہ نہایت کریم النفس اور بلند اطوار خاتون تھیں اور روایتِ حدیث اور خاندانی علوم رتبت کی بنا پر انھیں مدینہ اور اس کے نواح میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ انھوں نے مشہور صحابیہ حضرت عائشہ بنت کعب بن مالک رضی اللہ عنہا سے احادیث روایت کیں اور کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہ کر علمِ حدیث حاصل کیا۔ ان کے علاوہ بھی بعض صحابیات سے انھیں احادیث سننے اور روایت کرنے کے مواقع میسر آئے۔

حضرت حمیدہ بلند اخلاق اور اونچے کردار کی خاتون تھیں۔ حدیث کی لوگوں کو تعلیم دیتیں اور گفتار میں نرمی وعذوبت اختیار کرتیں، اگر کسی کی آپس میں عداوت اور خصومت ہوتی تو دونوں فریقوں کے درمیان صلح کے لئے کوشاں ہوتیں۔ بڑوں کی تکریم اور چھوٹوں پر شفقت کے بارے میں ممتاز تھیں، کبھی کوئی ایسی بات نہ کرتیں جس سے دوسروں کو ذہنی تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ نازک سے نازک موقع پر بھی کسی سے جھگڑا نہ کرتیں۔ سخت سے سخت تکلیف کا بھی کسی کے سامنے اظہار نہ فرماتیں۔ اگر کوئی طبیعت کے خلاف بات کرتا تو صبر وتحمل سے کام لیتیں۔ بڑی قوتِ برداشت پائی تھی۔ کسی میں کوئی غلط بات دیکھتیں تو ٹوک دیتیں، کسی کی ناجائز حمایت نہ کرتیں، قریبی رشتہ دار بھی

بے راہ روی اختیار کرتے تو ان کی تائید سے ہاتھ کھینچ لیتیں۔

ان کا حلقہ تلامذہ بھی تھا، ان سے روایت کرنے والوں اور ان کے شاگردوں میں بعض اہم شخصیتیں شامل ہیں، جن میں اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحہ اور ان کے بیٹے یحییٰ بن اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحہ کے نام آتے ہیں۔

ان کی شادی اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحہ سے ہوئی جو ان کے شاگرد اور راوی بھی ہیں۔ یہ وہ عظیم المرتبت شخص تھے جو حدیث رسول اللہ ﷺ سے خاص شغف رکھتے تھے۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے روایت کی اور تابعی کہلائے۔

ان کی تمام اولاد کا تو علم نہیں، البتہ ان کے ایک بیٹے کا نام یحییٰ تھا جو اپنے والدین کی طرح بہت نیک اور حلیم الطبع تھے۔ ان کا پورا وقت یادِ خدا میں گزرتا، تلاوت قرآن کثرت سے کرتے اور ایک ایک آیت بار بار پڑھتے اور اس کے مطالب کو ذہن میں لاتے۔ اہل خانہ اور بچوں کو اس کا درس دیتے اور اس کے معانی سمجھاتے۔ رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے حصول کے لئے بڑے بڑے محدثین کی خدمت میں حاضری دیتے۔ والدہ اور والد سے صحابہ کے بارے میں دریافت کرتے اور اس ضمن میں پوری تفصیلات جاننے کی کوشش فرماتے۔

حضرت حمیدہ بنت عبید کی وفات ۱۳۲ھ میں ہوئی۔

☆☆☆

امۃ الجلیل بنت عمرو عدوی

بصرہ کی وہ قابل قدر خاتون جو بصرہ کے تمام خواتین سے زیادہ عبادت گزار اور پارسا تھیں۔

حضرت امۃ الجلیل بن عمرو عدوی بصرہ کی رہنے والی تھیں اور نہایت پرہیز گار خاتون تھیں، ان کے قبیلے میں پرہیز گاری میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔

کہتے ہیں وہ بصرہ کی تمام خواتین سے زیادہ عبادت گزار اور پارسا تھیں۔ حلیم الطبع اور منکسر المزاج تھیں۔ گفتگو میں محتاط اور میل جول میں بلند اوصاف کی حامل تھیں۔ سب کی خیر خواہ تھیں۔ کھانا بہت کم کھاتی تھیں۔ دن رات میں ایک روٹی پر گزر کرتی تھیں۔

لڑائی جھگڑے سے سخت متنفر تھیں، سب سے خوش اخلاقی سے پیش آتی تھیں، کسی کی مخالفت نہ کرتیں، کوئی نقصان بھی پہنچاتا تو خاموش رہتیں، کسی پر کوئی اعتراض نہ کرتیں۔ حلم وانکساری کا پیکر اور نرمی ورأفت کا مجسمہ تھیں۔ لوگوں کی امداد میں پیش پیش رہتیں، درہم ودینار کے ذریعے کوئی انھیں متاثر کرنا چاہتا تو مقابلے پر اتر آتیں اور اس کے سرمائے کو کوئی اہمیت نہ دیتیں۔ نرم گفتار اور بلند کردار تھیں۔ بوڑھی عورتوں اور نادار افراد کی خدمت ان کا شیوہ تھا۔ بچوں سے پیار اور محبت کا برتاؤ فرماتیں۔

عبادت گزاری کا یہ حال تھا کہ دن کو قرآن پڑھتیں اور لوگوں کی خدمت کے لئے وقف رہتیں اور شب کو اللہ کے حضور کھڑی ہو جاتیں۔ تہجد اور نوافل کی پابند تھیں۔ ان کا فرمان ہے کہ بہترین لوگ وہ ہیں جو شب کی تنہائیوں میں اللہ کی عبادت کرتے اور اس کے سامنے سربسجود ہوتے ہیں۔ کہا کرتی تھیں کہ جب سحری کا وقت آتا ہے تو میرے

قلب میں ایک نئی روح کروٹ لینے لگتی ہے اور میرا دل کچھ اور ہی کیفیتوں سے معمور ہو جاتا ہے۔

ان سے بہت سے اقوال مروی ہیں مثلاً ان سے روایت ہے کہ عبادت گزار لوگ عبادت کے سلسلے میں مختلف رجحانات رکھتے ہیں اور یہ کہ انسان درجۂ ولایت پر کب متمکن ہوتا ہے اور اس منزل پر پہنچنے کے کیا ذرائع ہیں۔ فرماتی ہیں اس ضمن میں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انسان اس وقت اس بلند منصب پر فائز ہوتا ہے جب اسے دنیا کی کسی مشکل کا کوئی احساس ہو اور دین کی خدمت کرتے ہوئے اسے جو تکلیفیں پہنچیں انھیں خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔

ان کا کہنا ہے کہ ولی وہ ہے جو یہ طے کرلے کہ دنیا میں جن آفات سے بھی وہ دوچار ہوگا، ان پر گھبرانے کے بجائے اطمینان کا اظہار کرے گا اور ناموافق حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گا، جب دنیا کی مشکلات اس کے دل کے دروازے پر دستک دیں گی تو وہ بے تابی سے ان کی طرف لپکے گا اور انھیں اس طرح برداشت کرے گا کہ گویا ان کے انتظار میں تھا۔

ان کے بقول ولایت کا استحقاق اس شخص کو پہنچتا ہے جو دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دیتا ہو اور اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو چکی ہو کہ دنیا عارضی شے ہے، اس کے ساز و سامان چند روزہ ہیں اور یہ مال و دولت آخر ختم ہونے والے ہیں۔ اس کے برعکس آخرت دائمی اور لازوال ہے، اس کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے ہزاروں گنا زیادہ ہیں، آخرت کو دنیا پر بہرحال ترجیح حاصل ہے۔

فرماتی ہیں: ایک گروہ کہتا ہے ولی کی تعریف یہ ہے کہ اللہ کو ہر چیز کا مالک سمجھے، اپنے مال و دولت کو زوال پذیر تصور کرے، غریب کی امداد کرے، مسکین سے تعاون

کرے، جو لوگ سرمایہ کے بل بوتے پر غرباء کو تنگ کرتے ہیں انھیں راہ راست پر لائے۔ کسی کو صرف اس بنا پر قابل احترام نہ گردانے کہ وہ سیم وزر کے ڈھیروں پر قابض ہے اور بے حد وحساب دولت کا مالک ہے۔

فرماتی ہیں: ولی وہ ہے جو دنیا کی ناز ونعمت سے کوئی تعلق نہ رکھے اور اس کے لیل ونہار کو عارضی اور ناپائیدار قرار دے۔

ان سے منقول ہے کہ کسی کے درپے آزار ہونا، انسانیت کے منافی اور اسلام کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ جو شخص دوسروں پر اپنے آپ کو ترجیح دیتا ہے، وہ اسلام کی تعلیمات سے روگردانی کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا: ولایت کا اندازہ دل وزبان اور ہاتھ سے ہوتا ہے۔ ولی وہ ہے جو کسی کے خلاف دل میں کسی قسم کی کدورت اور حسد وبغض کو جگہ نہ دے، زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ نکالے جو دوسروں کے لئے تکلیف کا باعث ہوسکتا ہو اور جس سے سننے والے کو ذہنی اور روحانی تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

ایک مرتبہ شاگردوں کے حلقے میں فرمایا: لوگوں کو فائدہ پہنچانا، ان کو مشکلات سے دور رکھنے کی کوشش کرنا، دوسروں کے لئے آرام وآسائش کا اہتمام کرنا، بنیادی نیکی اور بہترین خیر ہے۔

ایک مجمع میں فرمایا: دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دینا اور اپنے مفاد کے مقابلے میں دوسرے کے مفاد کا خیال رکھنا بہت بڑی نیکی ہے۔

حضرت لمۃ الجلیل بنت عمرو عدویہ کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ دور دور سے لوگ کثیر تعداد میں ان کے پاس آتے اور روحانی فوائد حاصل کرتے۔ ان کا مکان بصرہ میں نیک لوگوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ہر شخص سے اس کی ذہنی اور فکری سطح کے مطابق

بات کرتیں اور ہر ممکن طریقے سے اس کو سمجھانے کی کوشش فرماتیں۔ ان کے علوِ اخلاق، خلوصِ قلب، تقویٰ، جذبۂ ہمدردی خلائق اور نیکی سے لوگ انتہائی متاثر تھے اور یہ اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کو یہی تعلیم دیتی تھیں، فرمایا کرتیں کہ کتابی علم کا سلسلہ بہت وسیع ہے اور بے شمار حضرات یہ بنیادی خدمت سرانجام دے رہے ہیں، لیکن للّٰہیت اور خشیت الٰہی کی تعلیم کا سلسلہ روبہ زوال ہے۔ اسے دوبارہ اسی نہج پر جاری کرنا چاہئے جس نہج پر کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جاری تھا۔

ایک مرتبہ اپنے شاگردوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کا مفہوم کسی خاص دائرے تک محدود نہیں۔ یہ بہت ہی وسعت پذیر ہے۔ عبادات سے لے کر خدمتِ خلق تک کے تمام گوشے اس میں شامل ہیں، آنحضرت ﷺ کا اصل فرماں بردار وہ ہے جو لوگوں کی خدمت کو اپنا شعار بنالیتا ہے۔ عبادت صرف عابد کی ذات کو فائدہ پہنچاتی ہے، لیکن خدمتِ خلق ایسی شے ہے جس سے سب متمتع ہوتے ہیں اور یہ ایسی نیکی ہے جو اپنی ذات کی حدود سے نکل کر دوسروں تک ممتد ہوتی ہے۔ اگر تم اسلام کی صحیح روح کو سمجھنے اور آنحضرت ﷺ کی اطاعت کو اپنا نصب العین بنانا چاہتے ہو تو دنیا میں پھیل جاؤ اور لوگوں کی خدمت کرو۔ آنحضرت ﷺ کے خلفاء راشدین اور صحابہ کرام کا یہی معمول تھا۔ وہ اپنے کام کاج کا حرج کر کے اور اپنے مفاد کو نظر انداز کر کے دوسروں کے کام آتے اور انسانیت کی خدمت کو سب چیزوں پر مقدم ٹھہراتے تھے۔

حضرت امۃ الجلیل رحمۃ اللہ علیہا کی وفات کب ہوئی؟ اس کا صحیح طور سے پتا نہیں چل سکا۔

☆☆☆

حضرت ام حبان سلمیہ

وہ خداترس خاتون جن کے خوف کا یہ عالم تھا کہ جوں ہی نماز کی نیت باندھتیں دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو جائیں۔

حضرت ام حبان سلمیہ رحمۃ اللہ علیہا بصرہ کی رہنے والی تھیں اور عبادت گزاری و پرہیزگاری میں معروف تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بصرہ کی سرزمین علم وفضل کا مرکز اور نیکی ویادِ الٰہی کا سرچشمہ تھی۔ حدیث، فقہ، نحو، شعروشاعری، قرأت، تفسیر، عروض وغیرہ تمام اصنافِ علم میں اس خطۂ ارض کے لوگوں کو آگاہی حاصل تھی۔ یعنی ان امور میں باشندگانِ بصرہ بہت سے علاقوں کے لوگوں سے فائق تھے۔ اہل لغت کے نزدیک بصرہ کے معنی عربی زبان میں نرم پتھریلی زمین کے ہیں اور فی الواقع وہ اسی قسم کی زمین تھی، لیکن ''معجم البلدان'' میں اس ضمن میں ایک مجوسی فاضل کا جو قول نقل کیا گیا ہے وہ بھی قرین قیاس ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ لفظ ''بس راہ'' ہے جس کے فارسی معنی ہیں بہت سے راستے۔ یعنی چونکہ اس جگہ سے بہت سی راہیں نکلتی تھیں۔ اس لئے اہل عجم اس کو ''بس راہ'' کے نام سے موسوم کرتے تھے جسے عربوں نے ''بصرہ'' میں بدل دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ جس طرح یہاں سے مختلف مقامات کو جانے کے لئے بہت سی راہیں نکلتی تھیں، اسی طرح یہاں علم وفضل کی بھی بے شمار شاخوں نے جنم لیا اور پروان چڑھیں۔ علم اور تقویٰ کی وہ کون سی راہ ہے جو بصرہ سے نہیں نکلی۔ یہاں نیکی تھی تو بہت زیادہ، تقویٰ تھا تو انتہا کو پہنچا ہوا، علم حدیث تھا تو حد درجہ کا، ثقاہت تھی تو لاجواب، علم نحو تھا تو بے نظیر، عربی لغت کا آغاز بھی اسی شہر سے ہوا، یعنی عربی لغت کی پہلی کتاب جو ''کتاب العین'' کے نام سے مشہور ہے اور خلیل بصری کی تصنیف ہے، اسی شہر میں لکھی گئی گویا اس

کی تصنیف کا سہرا اسی بلدۂ عظیم کے اہل علم خلیل بصری کے سر ہے۔ پھر بے شمار ائمہ مجتہدین اس خاک سے پیدا ہوئے جنھوں نے علم واجتہاد کے میدان میں لازوال شہرت حاصل کی۔

فوج کی تعداد بھی اس شہر میں سب سے زیادہ تھی۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ زیاد بن ابی سفیان کے زمانۂ حکومت میں صرف ان لوگوں کی تعداد جن کے نام فوجی رجسٹر میں درج تھے اسی (۸۰) ہزار تھی اور ان کے آل اولاد ایک لاکھ بیس ہزار کی تعداد میں تھی۔

غرض بصرہ ہر اعتبار سے ایک عظیم شہر تھا اور اس کے باشندے علم وفن کے ہر گوشے میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ انہی خوش قسمت لوگوں میں حضرت ام حبان سلمیہ رحمۃ اللہ علیہا کا اسم گرامی شامل ہے۔ یہ خاتون انتہا درجے کی نیک اور نہایت عالمہ وفاضلہ تھیں۔ ان کے حالات ابن جوزی نے ''صفوۃ الصفوہ'' میں قلم بند کئے ہیں، جن سے ان کی عظمت اور انفرادیت کا پتا چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس دور کے بصرہ میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

ام حبان میں صبر وضبط کا بے حد جذبہ پایا جاتا تھا۔ وہ نماز میں اتنا طویل قیام فرماتیں کہ بقول ابن جوزی ہر شخص اس کی استطاعت نہیں رکھتا۔ وہ کم زور جسم کی خاتون تھیں، لیکن نماز میں بڑی قوی، حوصلہ مند اور طاقت ور معلوم ہوتی تھیں۔ اس ضمن میں ابن جوزی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

''ام حبان بصری جو دبلے پتلے جسم کی خاتون تھیں اور دیکھنے میں دھان پان معلوم ہوتی تھیں، نماز کے لئے کھڑی ہوتیں تو (روحانی اعتبار سے) ایک مضبوط جسم کے مالک اور طاقت ور آدمی کے قالب میں ڈھل جاتیں۔ ان کی نیکی اور خوفِ خدا کا یہ عالم تھا کہ جوں ہی نماز کی نیت باندھتیں، جسم قوی سے قوی تر ہو جاتا اور دنیا ومافیہا سے بے

خبر ہوجاتیں، انھیں یہ خیال بھی نہ رہتا کہ اللہ کے خوف اور عبادت کے سوا کوئی اور کام بھی ہوتا ہے، وہ کھجور کے درخت کی طرح سیدھی جائے نماز پر کھڑی ہوجاتیں اور اگر کبھی ہوا تیز ہوتی تو جسمانی کمزوری کی وجہ سے دائیں بائیں اور جنوب وشمال کو حرکت کرتی دکھائی دیتیں''۔

ابن جوزی مزید لکھتے ہیں۔

بصرہ کی خاک نے جن لوگوں کو پیدا کیا، ان میں ام حبان سلمیہ کا درجہ نہایت بلند اور منفرد ہے۔ یوں تو بصرہ کو ہمیشہ مردم خیز خطے کی حیثیت حاصل رہی اور بے شمار معاملات میں اس کو روئے زمین کا ممتاز مقام دیا گیا، مگر بعض امور میں تو اس کو انتہائی فوقیت حاصل ہوئی مثلاً نیکی اور تقوی کی جو کیفیت بصرہ میں نظر آئی، وہ کسی اور مقام کے حصے میں نہ آئی۔ اسی ام حبان کو دیکھئے کہ وہ نیکی کے جس مقام رفیع پر پہنچیں اور تقوی کی جن بلندیوں کو انھوں نے چھوا، اس کی مثال کہاں سے ملے گی۔ یہ لاغر جسم کی طویل قامت خاتون اپنے زمانے کی نرالی عورت تھیں۔ نہ نیکی میں ان کے پائے کو کوئی پہنچا اور نہ علم میں کسی نے ان کا مقابلہ کیا۔ یوں تو دنیا میں کسی شے کی کمی نہیں، لیکن بعض لوگوں کو اللہ جس اسلوب سے سامانِ رحمت فراہم کرتا ہے، اس پر تعجب بھی ہوتا ہے اور اپنی حالت دیکھ کر ایسے لوگوں پر رشک بھی آتا ہے۔

''صفوۃ الصفوہ'' میں ابن جوزی ہی کے الفاظ ہیں کہ ام حبان سلمیہ کو قرآن پاک سے انتہائی تعلق تھا اور وہ اس کثرت سے قرآن مجید کی تلاوت کرتیں کہ ایک ہی دن اور رات میں پورا قرآن ختم کرلیتیں۔ انھیں قرآن پر اس درجہ عبور تھا کہ بات بات میں قرآن کی آیات پڑھتیں اور لوگوں کو اس کے مطالب ومعانی کی گہرائیوں سے آگاہ کرتیں۔

آگے چل کر ابن جوزی تحریر فرماتے ہیں:

ام حبان زیادہ باتیں کرنے کی عادی نہ تھیں، وہ کم گو اور خاموش طبع خاتون

تھیں۔ انھوں نے ہر کام کے لئے کچھ اوقات مقرر کر رکھے تھے، یہاں تک گفتگو کے لئے بھی انھوں نے وقت مقرر کر رکھا تھا۔ وہ دن رات میں صرف تین مواقع پر کسی سے ہم کلام ہوتی تھیں۔ ایک نماز عصر کے بعد، دوسرے کسی اشد ضرورت کے وقت، تیسرے کسی ایسی چیز کے لئے جس کے بارے میں زبان کو حرکت دیئے بغیر چارہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ وہ کسی سے مخاطب نہ ہوتیں۔

غرض حضرت ام حبان سلمیہ رحمۃ اللہ علیہا بہت سی خوبیوں کی مالک تھیں۔ وہ کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالتیں جس سے کسی کو ذہنی، روحانی یا مالی تکلیف پہنچنے کا احتمال ہو۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا صحیح نمونہ تھیں کہ اگر بات کرنا ہو تو بہتر اور صحیح بات کرو، ورنہ خاموش رہو۔ بات کرنے پر وہ خاموشی کو ترجیح دیتیں۔

ان کے حالات میں لکھا ہے کہ انھوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے کسی کو نقصان اٹھانا پڑا ہو یا کسی کو کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ وہ ہر معاملے میں محتاط تھیں، نہ کسی سے کوئی چیز مانگتیں اور نہ کسی سلسلے میں کسی کو کسی نوع کی آزمائش میں ڈالتیں۔

حضرت ام حبان سلمیہ کو بے شمار حدیثیں زبانی یاد تھیں اور ان کے علم وادراک کا دامن بہت وسیع تھا۔

انھوں نے پچاس یا پچپن سال کی عمر پا کر انتقال کیا۔ منقول ہے کہ انھوں نے خندہ پیشانی سے موت کا استقبال کیا۔ جب ان کا وقتِ موت آیا تو ان کے متعدد عزیز ان کے قریب کھڑے تھے۔ انھوں نے ہر ایک کو پہچانا اور الگ الگ سب کو سلام کیا اور درخواست کی کہ وہ اللہ سے ان کے لئے مغفرت کی دعا کریں۔

☆☆☆

ام الحسن بنت ابی جعفر طنجانی

مناظرہ وخلافیات اور علمی مسائل میں مباحثہ ومجادلہ کے فن میں ماہر خاتون کا ذکر جمیل

اندلس کے مشہور شہر قرطبہ کی مغربی جانب ایک شہر آباد تھا جس کا نام لوشہ تھا۔ یہ شہر غرناطہ کی نہر سجل کے کنارے واقع تھا۔ اس کے اور قرطبہ کے درمیان ساٹھ میل کا فاصلہ تھا۔ آب وہوا کی بہتری کے اعتبار سے یہ شہر پورے اندلس میں مشہور تھا۔ تعمیر، صفائی اور عمدگی کے لحاظ سے اس دور کا یہ بے نظیر مقام تھا۔ اس کا محل وقوع ایسا تھا کہ یہ بہترین صحت افزا مقامات میں گھرا ہوا تھا۔ اسے ادیبوں، شاعروں، فقیہوں، محدثوں اور طبیبوں کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ اس میں متعدد تاریخی مقامات تھے جنھوں نے اس کی شہرت میں بہت اضافہ کر دیا تھا اور لوگ دور دراز علاقوں سے اس کی سیر کو آتے تھے۔ پھر یہ حسین تعمیر کا بھی اس وقت کے اندلس میں ایک نادر نمونہ تھا، جو سیاحوں کے لئے جاذبیت اور کشش کا باعث تھا۔

اس شہر کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے باشندے مختلف النوع علوم سے شغف اور تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ بلند اخلاق، ملنسار اور عمدہ ترین کردار کے حامل تھے۔ یہاں کے نہ صرف مرد علم وفضل کے رسیا تھے بلکہ عورتیں بھی اس ضمن میں بہرہ وافر رکھتی تھیں۔ انھیں ادب وشعر اور دیگر اصناف علم سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان ذی علم خواتین میں ام الحسن بنت ابی جعفر طنجانی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ خاتون قرآن کی تجوید

وقرأت کی بھی عالمہ تھیں، لغت عربی میں بھی درک رکھتی تھیں اور اس موضوع سے متعلق تمام مکاتبِ فکر سے باخبر تھیں۔ طب میں بھی یگانۂ روزگار تھیں۔ ادب وشعر میں بھی فرید العصر تھیں اور اس سلسلے میں غزل 'نظم' قطعات اور اشعارِ مدح وذم میں یکتا تھیں۔ بعض مشاعروں میں بھی شامل ہوتیں اور داد وتحسین حاصل کرتیں۔ ان کی آواز بہت عمدہ تھی اور صحتِ تلفظ میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔ مرثیے بھی کہتیں اور اس درد اور سوز سے پڑھتیں کہ حاضرین کے دل ہل جاتے۔ انھوں نے اپنے ایک جوان بھائی کی موت پر مرثیہ لکھا اور خاندان کے افراد کو پڑھ کر سنایا، کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو پرنم نہ ہو۔ اس دردناک مرثیے نے پورے شہر کو متاثر کیا اور سب لوگوں نے اس جوان موت پر آنسو بہائے۔

کہتے ہیں ان کے بھائی کی موت سے زیادہ لوگ ان کے پردرد مرثیے سے اثر پذیر تھے۔ ان کے حالات لسان الدین الخطیب نے ''الاحاطہ'' میں بیان کئے ہیں اور ان کا نمونۂ کلام بھی دیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کے میدان میں ان کا درجہ بڑا بلند تھا اور الفاظ کے انتخاب میں یدِ طولیٰ رکھتی تھیں۔

مناظرہ وخلافیات اور علمی مسائل میں مباحثہ ومجادلہ کے فن میں بھی خوب ماہر تھیں۔ اس دور کے بڑے بڑے لوگوں سے بحث کرتیں اور کامیاب رہتیں۔ نہایت شگفتہ مزاج تھیں اور گفتگو کا انداز بہت دھیما تھا، مگر گرفت بڑی مضبوط تھی۔ اگر کسی علمی معاملے میں ان کا پہلو کمزور ہوتا تو بلا تامل غلطی مان لیتیں اور اگر موقف میں استواری ہوتی تو خوب مقابلہ کرتیں اور مخاطب کو قائل معقول کرنے کی کوشش کرتیں۔

لسان الدین خطیب کہتے ہیں، اس زمانے کی تین عورتیں اندلس کے علمی حلقوں میں مشہور تھیں، جن میں ام الحسن کا نام نمایاں ہے۔ ان میں کمال یہ تھا کہ خشک سے خشک مباحث کو بھی ادبیت کے قالب میں ڈھال دیتیں اور اس نہج سے بات کرتیں

کہ مخاطب ان کی قابلیت کا لوہا ماننے پر مجبور ہو جاتا۔ جودت وسخاوت میں بھی پورے اندلس میں ممتاز تھیں۔ ان کے حالات میں مرقوم ہے کہ جب محفل جمتی اور علماء وفضلاء اور ادباء وشعراء جمع ہوتے تو ان کی دل کھول کر تواضع کرتیں۔ بہت سے محاسن ان کی ذات میں جمع ہو گئے تھے اور وہ مختلف اوصاف کا عمدہ ترین مجموعہ تھیں۔

اندلس میں ان کے دور میں جو دو اور عورتیں علم وادراک میں مشہور تھیں، ام الحسن کا درجہ ان میں بہت بلند تھا۔ ان میں ایک کا نام حمدہ تھا اور دوسری کا ولادہ۔ مگر ندرتِ افکار اور رفعتِ خیال میں جو حیثیت ام الحسن کو حاصل تھی وہ دوسری خواتین کو باوجود وسعتِ علم کے حاصل نہ ہو سکی۔ کہتے ہیں جب یہ زبان کو حرکت دیتیں اور مسئلہ زیر بحث کی وضاحت کرتیں تو یوں محسوس ہوتا کہ پیدائشی طور سے نابغۂ روزگار ہیں اور علوم کی تمام انواع سمٹ کر ان کے ذہن میں جمع ہو گئی ہیں۔

ان کے والد بھی بہت بڑے عالم تھے۔ انھوں نے اپنی اس بیٹی کو اونچے پیمانے پر تعلیم دلائی اور ہر شعبۂ علم میں ان کو آگے بڑھانے کی سعی کی۔ ام الحسن نے اپنے متعلق باپ کے بلند ارادوں کا اندازہ کر لیا تھا اور انھوں نے خود کو اسی سانچے میں ڈھال لیا تھا، جس میں باپ ڈھالنا چاہتے تھے۔

طب میں بھی انھوں نے بڑا نام پایا اور اس میں وقت کے نامور اطباء نے ان کے علم وفن کا لوہا مانا۔ کہتے ہیں یہ مریض کی نبض پر ہاتھ رکھے بغیر محض اس کی آنکھیں اور چہرہ دیکھ کر مرض کی تفصیلات بیان کر دیتیں اور وضاحت سے بتا دیتیں کہ اس کو کیا مرض لاحق ہے، کب سے لاحق ہے اور کیوں لاحق ہوا ہے؟ نیز اس کا علاج کیا ہے؟ علم تشریح الطب پر کامل عبور رکھتی تھیں۔ اس ضمن میں امراء ووزراء تک ان کے پاس آتے اور صحت یاب ہو کر واپس جاتے۔ بڑی بڑی پرانی بیماریوں میں مبتلا مایوس العلاج اور زندگی سے اکتا جانے

والے مریض چندروز میں ان کے علاج سے صحت وشفا کی نعمت سے بہرہ ور ہو جاتے۔

ان کی شہرت کا دائرہ صرف اندلس کی سرزمین تک محدود نہ تھا، بلکہ پورا مغرب اقصیٰ ان کے علم وفضل سے متاثر اور مرعوب تھا اور اس نواح کے بے شمار اہلِ علم محض زیارت کے لئے ان کے شہر لوشہ کا سفر اختیار کرتے اور ان کی مجالس علمی سے مستفید ہوتے۔

اس زمانے میں اندلس اسلامی علوم کا عظیم مرکز تھا اور اس کی آغوش میں بہت سے جلیل القدر اور عظیم الشان لوگوں نے پرورش پائی اور شہرت وناموری کے بلند فرازوں تک پہنچے۔ اس وقت میں نہ آمد ورفت کی آسانیاں حاصل تھیں، نہ سفر وسیاحت کی سہولتیں میسر تھیں اور نہ خط وکتابت کے سلسلے زیادہ وسعت پذیر تھے، لیکن اس کے باوجود علم میں کچھ ایسی کشش تھی اور علماء میں اس درجہ جاذبیت تھی کہ لوگ دور دراز سے کھنچے ہوئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے فیضِ صحبت سے اپنی علمی تشنگی بجھاتے۔ ام الحسن کا مسکن لوشہ اگرچہ بہت اچھا شہر تھا، لیکن وہاں آمدورفت کی سہولتیں مفقود تھیں، بایں ہمہ بے شمار لوگ وہاں آتے اور اس عالمہ کی وسعتِ علم سے استفادہ کرتے۔ ان کا دروازہ آنے جانے والوں کے لئے ہر وقت کھلا رہتا۔

اس خاتون کے جدتِ فکر اور ندرتِ خیال کا یہ عالم تھا کہ بات سے بات پیدا کرتی تھیں اور جدید اسالیبِ بیان کو اپنانے میں شہرت رکھتی تھیں۔

ایک مرتبہ ان کے والد ابوجعفر طنجانی جو مشہور اہل علم تھے، مغربی ممالک کی سیاحت پر گئے تو اپنی اس بیٹی کی قابلیت، وسعتِ علم اور جودتِ طبع کے متعلق مختلف علماء وفصحاء کو باخبر کیا اور ان کے بعض واقعات بیان کئے۔ واپس آئے تو متعدد سرکردہ لوگوں نے ان سے ملنے، ان کے تفصیلی حالات سے مطلع ہونے، ان کی دلچسپیوں کے محور کو جاننے اور اس کم سنی میں ان کے فہم وادراک کے حدود سے آگاہ ہونے کی خواہش ظاہر کی اور کہا کہ وہ ان سے بعض مسائل سمجھنے کے خواہاں ہیں۔

ام الحسن کا خط اچھا نہ تھا اوران کی تحریر پڑھنا بہت مشکل تھا۔کسی نے ازراہ تفنن کہا کہ آپ اپنی بدخطی کو حسن خط میں بدلنے کی کوشش کیجئے۔اس کے جواب میں پوری نظم کہہ ڈالی جس کا ایک شعر یہ ہے۔

الخط لیس له فی العلم فائدة　　　و الخط هو تزئین قرطاس

یعنی علم کے میدان میں تحریر وکتابت کی عمدگی کو کوئی حیثیت حاصل نہیں، یہ تو محض تزئین قرطاس کا ایک ذریعہ ہے۔

ایک اور شعر میں کہتی ہیں کہ میرا مقصد اصلی تو طلب علم ہے، میں اس کے بدلے میں کسی اور شے کی خواہش مند نہیں، کیونکہ علم ہی انسان کو لوگوں پر فوقیت عطا کرتا ہے۔

ایک شخص کی مدح کرتے ہوئے کہتی ہیں:

ان قیل من فی الناس رب فضیلة　　　حازا لعلا و المجد منه افضل

فاقول رضوان وحید زمانه　　　ان الزمان بمثله لبخیل

یعنی اگر یہ کہا جائے کہ لوگوں میں سب سے بڑھ کر صاحب فضل وکمال کون ہے، جس نے رفعتوں اور مجد کو گھیر لیا ہے تو میں جواب دوں گی رضوان ہے جو اپنے دور میں تنہا اس مرتبہ بلند پر فائز ہے۔زمانے نے اس کی مثل پیدا کرنے کے بارے میں بخل اختیار کر لیا ہے۔

غرض ام الحسن بے شمار اوصاف کی حامل اور تمام اصنافِ علم میں بے مثال تھیں۔دنیائے علم میں ان کی نظیر کم ہی ملے گی۔افسوس ہے ان کی تاریخِ ولادت ووفات کا علم نہیں ہو سکا۔

☆☆☆

حضرت ام الحریش

اس خاتون کا تذکرہ جس نے محض اس خوف سے شادی نہ کی تھی کہ کہیں وہ حقوق الزوج نہ ادا کرسکیں اور اللہ کے یہاں ان کی گرفت ہو۔

بصرہ فنون نوع بنوع کا مرکز اور علوم بوقلموں کا معدن ہونے کی وجہ سے مرجع خلائق تھا۔ اس سرزمین نے جن لوگوں کو جنم دیا اور اس خاک علم پرور نے جن افراد کی پرورش کی وہ آسمان علم ودانش کے درخشاں تارے بن کر چمکے اور ان کا طائرِ شہرت فضائے بسیط کی انتہائی رفعتوں پر پہنچا۔ ان میں سے جن ہستیوں نے علم وعرفان کی ہمہ گیریوں کے باعث زیادہ مقبولیت حاصل کی اور جو اپنی ذاتی اور علمی خصوصیات کی بنا پر لوگوں کی آماجگاہ بنے، ان میں بے شمار مرد بھی شامل ہیں اور لاتعداد عورتیں بھی۔ ان عورتوں میں حضرت ام الحریش رحمۃ اللہ علیہا کا اسم گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ یہ خاتون متعدد اوصاف سے متصف تھیں جو اپنے حالات بیان کرتی ہوئی خود کہتی ہیں۔

میں بچپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہوگئی تھی۔ میرا ایک بھائی تھا۔ باپ کی وفات کے بعد ہم گھر کے کل تین افراد تھے۔ والدہ، بھائی اور میں۔ والدہ جوان تھیں، بھائی تین سال کا معصوم بچہ تھا اور میں آٹھ برس کی تھی۔ میرے نانا جو بصرہ ہی میں فروکش تھے، اس علاقے کے مشہور تاجر تھے۔ ان کی مالی حالت بہت اچھی تھی اور وہ بصرہ میں ایک مخیرّ اور سخی کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں علم حدیث وفقہ میں ممتاز تھے۔ زہد وعبادت میں بھی ان کا مقام بڑا اونچا تھا۔ میرے والد بھی تجارت کرتے تھے اور ان کی وفات کے بعد ان کے کاروبار کی نگرانی میرے نانا کے ذمے تھی۔

اپنے والد کے کاروبار کے سلسلے میں ام الحریش کہتی ہیں:

وہ مختلف مقامات سے روغنِ زیتون منگواتے تھے اور بصرہ میں فروخت کرتے تھے۔ بصرہ کے بڑے بازار میں ان کی بہت بڑی دکان تھی، جہاں روغن زیتون بیچنے اور خریدنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ میرے والد بصرہ کی کھجوریں بھی اونٹوں کے ذریعے باہر بھیجتے تھے۔ ان کی دکان سے کچھ فاصلے پر ایک جامع مسجد تھی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ مسجد خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم سے اس وقت تعمیر کی گئی تھی جب بصرہ شہر بسایا گیا تھا۔ میرے والد دکان سے اٹھ کر نماز کے وقت اس مسجد میں نماز پڑھنے جایا کرتے تھے۔ یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب میں عہدِ طفولیت میں تھی۔ میرے والد نہایت شفیق تھے اور مجھ پر اور میرے بھائی پر انتہائی شفقت فرماتے تھے۔ ایسا مہربان شخص کم ہی پیدا ہوتا ہے۔

باپ کی وفات کے متعلق ام الحریش کا بیان ہے:

مجھے اچھی طرح یاد ہے، ان کی صحت بہت اچھی تھی اور وہ بالکل جوان تھے۔ ایک شام وہ دکان سے آئے تو ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کا بایاں ہاتھ پیٹ پر رکھا ہوا تھا۔ وہ اندر گئے اور خاموشی سے چارپائی پر لیٹ گئے۔ میری والدہ اس وقت کھانا تیار کر رہی تھیں۔ وہ دوڑ کر اندر گئیں۔ میں بھی بھاگتی ہوئی ان کے ساتھ گئی۔ انھوں نے والد سے خیریت پوچھی۔ انھوں نے اثبات میں سر ہلایا یعنی کہا کہ میں ٹھیک ہوں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ پیٹ کے شدید درد میں مبتلا تھے۔ انھوں نے لیٹے ہوئے عشاء کی نماز ادا کی۔ میں نے ان کو اس سے پہلے کبھی اس حالت میں نہیں دیکھا تھا، نہ چارپائی پر لیٹے ہوئے نماز پڑھتے دیکھا تھا۔

وہ مزید کہتی ہیں:

تھوڑی دیر کے بعد ان کی طبیعت اور خراب ہوگئی۔ والدہ دوڑ کر میرے نانا کو بلانے ان کے گھر گئیں۔ وہ گھبرائے ہوئے آئے۔ والد پر جھکے اور خیریت پوچھی۔ اس وقت میرے والد کی آنکھیں بند تھیں۔ انھوں نے اشارے سے کہا ٹھیک ہوں اور ساتھ ہی آسمان کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ میرے نانا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ ایک فہیم اور عقل مند شخص تھے۔ اتنے میں چند دیگر عزیز بھی آ گئے۔ چند ساعتیں گزری ہوں گی کہ میرے والد انتقال کر گئے۔ میرے نانا نے نہایت دردناک لہجے میں انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ میری والدہ، میرے بھائی اور میرے سر پر دست شفقتِ پھیرا اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ یہ سب چند ثانیوں میں ہوگیا اور وہ گھر جو چند ساعتیں قبل مسرتوں سے بھرپور تھا ماتم کدہ بن گیا اور حزن وملال میں ڈوب گیا۔

وہ کہتی ہیں:

اب ہماری کاروباری ذمہ داریاں بھی اور ہماری نگرانی کے فرائض بھی نانا کے سپرد تھے۔ انھوں نے بہتر طریقے سے ہماری پرورش کی۔ میری والدہ میرے نانا کی انتہائی فرماں بردار تھیں اور میرے والد کی وفات کے وقت جوان تھیں۔ انھوں نے تمام عمر دوسری شادی نہیں کی اور پوری توجہ میری اور میرے بھائی کی تعلیم وتربیت پر مرکوز کردی۔ میں نے پہلے قرآن مجید حفظ کیا، اس کے بعد دوسرے علوم حاصل کیے۔ والد کے انتقال کے بعد میری طبیعت دنیا اور اس کے معاملات سے متنفر ہوگئی اور میں نے یادِ الٰہی اور حصولِ علم کو اپنا مرکزِ توجہ قرار دے لیا۔ یہی وجہ ہے کہ میری تعلیم بہتر انداز سے ہوئی اور میں نے دنیا کی ناز ونعمت کے تصور کو دل سے نکال پھینکا۔ اب میری کیفیت یہ ہے کہ مجھے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے سوا اور کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں۔

یہ باتیں حضرت ام الحریش رحمۃ اللہ علیہا نے خود بیان کی ہیں۔

اس کے بعد آخر میں ابن جوزی لکھتے ہیں:

ام الحریش جس طرح ددھیال اور ننھیال کی طرف سے اونچے اور نیک خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، اسی طرح خود بھی نیک اور عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں، نیز مختلف علوم پر عبور رکھتی تھیں۔ بیس برس کی تھیں کہ والدہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اسی اثناء میں نانا بھی انتقال کر گئے۔ اب ان کے نگراں ان کے ماموں تھے۔ انھوں نے کوشش کی کہ کہیں اچھی جگہ ان کی شادی کردی جائے، مگر ام الحریش نے صاف انکار کردیا اور کہا کہ وہ دنیا کے امور سے دست کش ہوچکی ہیں اور شادی وغیرہ سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔ کہا کرتی تھیں شوہر کی ذمہ داریوں کو نباہنا بہت مشکل کام ہے۔ ممکن ہے شادی کے بعد حقوق الزوج پورے نہ ہوسکیں اور اللہ کے نزدیک قابلِ گرفت قرار پاجاؤں، اس لئے میں نہیں چاہتی کہ کوئی ایسا بوجھ سر پر رکھوں جس کا اٹھانا مشکل ہوجائے۔ میں نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کردیا ہے، اب اسی کی تحویل میں رہنا چاہتی ہوں۔ اگر حقوق اللہ پورے ہوجائیں تو یہ بہت بڑی بات ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ شادی کے بعد انسان عجیب عجیب قسم کی الجھنوں میں پڑجاتا اور نازک ذمہ داریوں میں گھر جاتا ہے۔ میں اپنے میں ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہیں پاتی۔ انسان کو وہی کام کرنا چاہئے جسے وہ آسانی سے نبھا سکے، ناقابلِ برداشت بوجھ اٹھانا عقل مندوں کا شیوا نہیں۔

کہتے ہیں باپ کی وفات کے بعد ان کا دل دنیوی معاملات اور لوگوں کے ساتھ میل جول سے اکتا گیا تھا اور یہ گھر میں بیٹھی اللہ کی عبادت اور پڑھنے پڑھانے میں مستغرق رہتی تھیں، تادم واپسیں کبھی گھر کے دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا، نہ کسی کے ساتھ سختی سے پیش آئیں اور نہ کبھی کسی کو برا بھلا کہا۔ کبھی کسی کا حق نہیں مارا اور نہ کبھی ایسی بات زبان سے نکالی جو دوسرے کے لئے تکلیف کا باعث ہوسکتی ہو۔

☆☆☆

امۃ الواحد بنت حسین

وہ فاضلہ خاتون جو مسند افتاء پر متمکن تھیں اور جن کے فتاوے قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

امۃ الواحد بنت حسین بن اسماعیل محاملی۔ ایک روایت کے مطابق ان کا نام آمنہ بنت حسین محاملی اور کنیت امۃ الواحد بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے حالات خطیب بغدادی کی ''تاریخ بغداد''، ابن جوزی کی ''صفوۃ الصفوہ''، ابن العماد کی ''شذرات الذہب'' یافعی کی ''مرأۃ الجنان''، جمال الدین سفوی کی ''طبقات الشافعیہ''، ابن تغری بردی کی ''النجوم الزاہرہ''، زبیدی کی ''تاج العروس'' اور ابن جوزی کی ''المنتظم'' میں مذکور ہیں۔

فقہی مسلک کے لحاظ سے یہ شافعی تھیں اور اس مکتبِ فکر کی بہت بڑی عالمہ اور فقیہہ تھیں، یعنی شافعی فقہیات پر گہری نظر رکھتی تھیں۔ بڑے بڑے جلیل القدر شافعی علماء وائمہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مشکل مسائل حل کراتے۔ فقہ شافعی کے علاوہ یہ دیگر ائمہ کی فقہیات پر بھی نظر رکھتی تھیں۔ وسیع القلب خاتون تھیں، اہل علم کی مجالس میں خود بھی جاتیں اور وہ بھی ان کے ہاں آتے۔ مردوں سے افادہ واستفادے کا سلسلہ پردے کی اوٹ میں چلتا تھا۔ علم کو کسی ایک ہی فقہ اور ایک ہی نقطۂ فکر میں محدود نہ قرار دیتی تھیں۔ ان کا کہنا ہے کہ علم کی حدود بہت وسیع ہیں اور فکر و دانش کی دنیا نہایت فراخ ہے۔ کوئی شخص اگر چہ کتنا بڑا عالم ہو، علم کی وسعتوں کا احاطہ نہیں کرسکتا اور نہیں کہہ سکتا کہ حق اسی کے مسلک میں منحصر ہے۔ حق کوئی جامد شے نہیں کہ ایک ہی شخص کے تسلط میں آ جانے کے بعد دوسری جگہ جانے اور حرکت کرنے سے عاجز آ جائے۔ حق کا میدان بڑا وسیع ہے اور اس کا دائرہ انسان کی ذہنی اور فکری گرفت سے باہر ہے۔ حق کا مخلص متلاشی وہی ہوسکتا ہے جو اس کی تلاش کے لئے ہر دروازے پر دستک دے اور ہر معقول آدمی سے اس کی بھیک مانگے۔ جو شخص تلاشِ حق کے لئے دامنِ طلب نہیں پھیلاتا اور چند

کتابوں اور اشخاص ہی میں اسے دائرۂ وسائر سمجھتا ہے وہ صحتِ فکر اور حقانیت وصداقت کی منزل کو پالینے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ بہر حال یہ ایک وسیع النظر خاتون تھیں، ان کا ذہن تعصب سے خالی اور دل فقہی مسلک کی کدورت سے پاک تھا۔ نہ خود اس ذہن کی مالک تھیں اور نہ دوسروں سے اس کی توقع رکھتی تھیں۔

علم کے ساتھ ساتھ زہد واتقا کے اوصاف سے بھی بہ درجہ کمال بہرہ ور تھیں۔ عورتوں میں عام طور سے جو علمی غرور پیدا ہوجاتا ہے اور اپنے سوا سب کو کم تر سمجھنے کی بیماری جوان کو لاحق ہوجاتی ہے، اس سے مبرا تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ علم غرور کا نہیں مسکنت اور تواضع کا درس دیتا ہے۔ جو علم تعلی پیدا کرتا ہے، وہ جہل کے مترادف ہے۔ اس سے انسان کی صلاحیتوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے اور ذہن سوچ بچار کی پونجی سے محروم ہوجاتا ہے۔ علمی میدان میں ترقی اسی صورت میں ممکن ہے کہ عالم اپنے ذہنی کواڑوں کو بند نہ کرے اور حصولِ علم کے لئے ہر شخص کی مجلس میں جانے کے لئے اپنے آپ کو ہر وقت تیار رکھے۔ جو شخص یہ خواہش رکھتا ہے کہ فہمِ مسائل کے لئے لوگ اس کے پاس آئیں اور وہ خود کسی کے پاس نہ جائے، وہ علم کی لذتوں اور لطافتوں سے ناآشنا ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا: علم زہد واتقا کی اولین سیڑھی ہے ”جو شخص عالم وفقیہ ہے تو ہے لیکن زہد اور اتقا کی دولت سے بے بہرہ ہے، اس پر عالم کے لفظ کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔

ایک دفعہ شاگردوں کو مخاطب ہوکر کہا: علم کے کچھ تقاضے ہیں جنھیں پورا کرنا ضروری ہے۔ ان میں ایک تقاضا تقوی ہے۔ تقوی اور خوفِ الٰہی سے صرف نظر کرکے حصول علم کے لئے کوشاں ہونا ایسا ہی ہے جیسا زہر کے پیالے کو لبوں سے لگالینا۔ تقوی کے بغیر علم انسان کے لئے ہلاکت کا باعث بنتا ہے۔

عالم وجاہل کا فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا: جو شخص علم کی وجہ سے تکبر اور نخوت کا اظہار کرتا ہے، اسے جاہل سمجھو اور جو عجز وانکساری سے پیش آتا ہے، اسے عالم قرار دو، کیونکہ جہالت تکبر کا سبق دیتی ہے اور علم انکسار کی راہیں ہموار کرتا ہے۔

یہ خاتون وسعتِ علم کے ساتھ قرآن کی حافظہ وقاریہ بھی تھیں اور حدیث، فرائض، حساب، نحو اور معانی وغیرہ علوم میں مہارت رکھتی تھیں۔ فقہ شافعی کے تمام پہلوؤں سے باخبر تھیں بلکہ مذہب شافعی کی اپنے دور کے بہت سے لوگوں سے زیادہ جاننے والی تھیں۔

حدیث اور رجال میں مہارت رکھتی تھیں۔ انھوں نے متعدد اصحاب الحدیث سے احادیث روایت کیں اور پھر آگے ان سے مشاہیر محدثین نے احادیث بیان کیں۔ حدیث کے بارے میں ان کی بیان کردہ سند کو لائق اعتناء سمجھا جاتا تھا اور ان کی ثقاہت کا درجہ مسلمہ تھا۔

مسند افتاء پر متمکن تھیں۔ لیکن اس سلسلے میں نہایت محتاط تھیں۔ ان کے فتاوے کو قابل اعتبار اور لائق عمل ٹھہرایا جاتا تھا، مشہور فقیہ ومفتی ابوعلی بن ابو ہریرہ کی معیت میں فتوی دیتیں، کیونکہ اس سے فتوی کی اہمیت بڑھ جاتی اور بات مسند ہو جاتی۔

قیام لیل اور تہجد کی پابند تھیں، صدقات وخیرات میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتیں اور ہر کار خیر میں پیش پیش رہتیں، حسن اخلاق کا صاف ستھرا نمونہ اور بلندئ اخلاق کی عمدہ ترین مثال تھیں۔ جو ہاتھ میں آتا خرچ کر دیتیں، کسی کو تکلیف پہنچتی تو تلملا اٹھتیں۔ دوسرے کی مشکل کو اپنی مشکل قرار دیتیں۔ ان کا بحرِ سخاوت ہر آن جاری رہتا اور کثیر تعداد میں مستحقین ان سے مستفیض ہوتے، غریبوں کا سہارا اور مسکینوں کا مرجع تھیں۔

علمِ حدیث اور علم فقہ اپنے دور کے معروف اساتذہ سے حاصل کیا، جن میں خود ان کے والد حسین بن اسماعیل محاملی شامل تھے۔ ان کے علاوہ اسماعیل بن عباس وراق، الفاخر بن سلامہ حمصی، ابوالحسن مصری اور حمزہ شافعی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

امۃ الواحد بنت حسین بن اسماعیل محاملی رحمۃ اللہ علیہا نے ۹۰ برس کی عمر میں رمضان ۳۷۷ھ کو وفات پائی۔

☆☆☆

عائشہ بنت محمد حرانی

اس عالمہ ومحدثہ کا ذکر جن کے حلقۂ تلامذہ میں مشہور سیاح ابن بطوطہ بھی شامل ہے۔

عائشہ بنت محمد بن مسلم ۶۴۰ھ میں حران میں پیدا ہوئیں، وہیں پلی بڑھیں اور اسی شہر کی آغوش میں تعلیم وتربیت کی ابتدائی منزلیں طے کیں۔

تعلیم کا آغاز حران ہی میں کیا اور وہاں کے مشہور اور ثقہ علماء حدیث وفقہ سے تحصیل کی۔ یہ ان خواتین میں سے تھیں، جنھوں نے پوری توجہ سے علم حاصل کیا اور ہر طرف سے قطع تعلق کر کے اس کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے رکھا۔ علم کا شوق بچپن ہی سے دامن گیر تھا۔ عام بچوں کی طرح کھیل کود میں کوئی دلچسپی نہ لیتیں۔ تمام وقت کتابوں کی رفاقت میں بسر کرتیں۔ کہتے ہیں علم سے محبت وانہماک کا یہ عالم تھا کہ جہاں جاتیں کتاب ساتھ رکھتیں اور اہل علم کی تلاش میں رہتیں۔ علمی استفادہ ان کی طبیعت کا لازمی جز بن گیا تھا۔

انھیں حدیث اور اس کے متعلقات سے گہری دلچسپی تھی اور ان کا شمار حران کے مشاہیر اصحاب حدیث میں ہوتا تھا۔ لوگ انھیں محدثۂ حران کے نام سے یاد کرتے تھے۔ انھوں نے اس دور کے معروف محدثین سے علم حدیث حاصل کیا، جن میں اسماعیل بن الواقعی، فرح القرطبی، محمد بن ابوبکر بلخی، محمد بن عبدالہادی، ابراہیم بن خلیل اور ابن عبدالدائم قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جن سے انھوں نے باقاعدہ حدیث پڑھی اور روایات بیان کرنے کا شرف حاصل کیا۔ یہ اس دور کے بلند مرتبت اصحاب الحدیث

تھے اور لوگ دور دراز سے سفر کر کے حصول حدیث کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

عائشہ بنت محمد نے حدیث کے سلسلے میں اپنے علم ومطالعہ کی مدد سے اس درجہ اہمیت اختیار کر لی تھی کہ بعض مسائل میں وہ دیگر محدثین سے منفرد تھیں اور ان کے تفردات کا بڑا شہرہ تھا۔ تفردات کے باب میں بعض اصحاب حدیث نے ان سے اختلاف بھی کیا اور معترض ہوئے، مگر یہ اپنے نقطۂ نظر کو صائب اور صحیح سمجھتی تھیں اور ان اعتراضات کو اہمیت نہ دیتی تھیں۔ فرمایا کرتیں کہ میں نے اپنی صواب دید کے مطابق تحقیق کی روشنی میں ایک موقف اختیار کیا ہے، اگر کسی کو اس سے اختلاف ہے اور وہ میرے موقف کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تو بڑے شوق سے ایسا کر سکتا ہے، بربنائے علم ہر شخص کو ہر شخص سے اختلاف واتفاق کا حق پہنچتا ہے، کسی معاملے میں اگر کسی سے اختلاف کیا جائے تو اسے کھلے دل سے برداشت کرنا اور فراخ حوصلگی سے اس کا مقابلہ کرنا چاہئے۔

ان کا کہنا ہے کہ جو لوگ اختلاف کو برداشت نہیں کر سکتے اور اپنے علم وتحقیق ہی کو حرف آخر سمجھتے ہیں، وہ درحقیقت لذت علم سے ناآشنا ہیں۔ فرمایا اختلاف کے بغیر علم جامد ہو کر رہ جاتا ہے اور آگے بڑھنے کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ مشتاقان علم کے لئے فراخ حوصلہ ہونا ضروری ہے۔

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ علماء کو اپنی تعریف سے خوش نہیں ہونا چاہئے، ان میں خود ستائی اور تعریف کرانے کا جذبہ پیدا ہو جائے تو علمی گہرائی ختم ہو جاتی ہے اور مزید تحقیق کا شوق رخصت ہو جاتا ہے۔ کم حوصلگی اور خود ستائی دونوں علم کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسرے کو کم پایہ سمجھنا اور خود مدعی علم ہونا علماء کا شیوہ نہیں۔ یہ غرور علم سخت نقصان دہ ہے۔ اس سے اہل علم کو ہر قیمت سے بچنا چاہئے۔

اصحاب سیر ورجال نے لکھا ہے کہ پندار علم اور دوسروں کی تحقیر وتجہیل سب سے بڑی بیماری ہے، جو علم کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے اور ترقی کے دروازوں کو بند کر دیتی ہے۔ عائشہ بنت محمد اس سے مبرا تھیں، حالانکہ تعلیم یافتہ عورتوں کو یہ مرض زیادہ لاحق ہوتا ہے اور معمولی پڑھی لکھی عورتیں بھی نخوت وغرور کا شکار ہو جاتی ہیں، مگر عائشہ بنت محمد کو دیکھئے کہ وہ اتنی بڑی عالمہ اور محدثہ ہونے کے باوجود اس مرض سے پاک ہیں اور انتہائی حوصلہ منداور وسعت قلب کی مالک ہیں۔ رحمہا اللہ تعالیٰ۔

حصول علم کے لئے دمشق بھی گئیں۔ اس زمانے میں دمشق بڑے بڑے علماء حدیث کا مرکز تھا۔ آخری دور حیات میں یہ دمشق ہی میں تھیں۔ وہاں کے بعض اہل علم سے خود بھی تحصیل کی اور پھر اپنی الگ مسند تدریس آراستہ کی۔ ان کے تلامذہ میں جلیل القدر علماء شامل ہیں اور یہ وہ علماء ہیں جن کا حلقۂ تلمذ بڑا وسیع اور سلسلۂ اسناد قابل اعتماد ہے۔ یہ اپنے دمشق کے زمانہ قیام میں جامع بنوامیہ کے ایک کونے میں درس حدیث کرتی تھیں۔

اس دور میں جو لوگ ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے ان میں مشہور سیاح ابن بطوطہ بھی شامل ہیں۔ ابن بطوطہ ۷۲۶ھ میں جامع دمشق میں آیا اور ان کے علمی مرتبے سے بہت متاثر ہوا، چنانچہ اس نے ان سے وہ احادیث سماعاً اور قراءۃً حاصل کرنے کا شرف حاصل کیا، جن کا انھوں نے دمشق میں ابن عبدالدائم کی سند سے ابن عرفہ عبدی سے سماع کیا تھا۔ علاوہ ازیں ان سے حدیث علی بن حرب کی عمدۃ الوافی سماعت کی اور یہ وہ جزء تھا جو عائشہ نے محمد بن ابی بکر بن محمد بلخی سے بطور سماع حاصل کیا تھا۔ پھر فوائد علی بن حرب کے بھی اس ایک جزء کی تحصیل کی جو عائشہ نے بلخی سے بصورت سماع حاصل کیا تھا۔

عائشہ بنت محمد حرانی جہاں اپنے دور کی عالمہ اور محدثہ تھیں، وہاں بہت بڑی قناعت پسند اور صبر وشکر کی مالک بھی تھیں۔ نہ غربت وتنگ دستی میں پریشانی واضطراب کا اظہار کرتیں اور نہ کشائش رزق اور فراوانی مال کے دور میں کبر ونخوت کا شکار ہوتیں۔

نہایت مرنجان مرنج طبیعت کی مالک تھیں۔ چہرے پر غربت کے آثار ظاہر نہ ہونے دیتیں۔ کبھی کسی امیر کے دروازے پر دستک نہ دیتیں اور کسی کے سامنے اپنی ضروریات وحوائج کا اظہار نہ کرتیں۔ تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا اوران میں بڑے بڑے امراء دولت اور ارکان حکومت شامل تھے، لیکن کسی سے ایک پائی وصول نہ کرتیں، سب کو مفت تعلیم دیتیں، جامع دمشق کے اصحاب انتظام سے بھی کوئی معاوضہ نہ لیتیں۔ اُن کا ذریعہ معاش یہ تھا کہ لوگوں کے کپڑے سیتی تھیں، اس سے جو آمدنی ہوتی اسی سے گزر بسر کرتیں۔ کپڑے سینے پر بہت کم وقت صرف کرتیں، صرف اتنا کہ جس سے قوت لا یموت حاصل ہو جائے، زیادہ تر وقت تعلیم وتعلم پر خرچ کرتیں۔ اس محدود آمدنی سے شاگردوں اور ضرورت مندوں کی بھی مدد کرتیں۔ دوسروں سے ہمدردی کے جذبے کا یہ عالم تھا کہ کسی کی تکلیف دیکھ کر اپنی تکلیف بھول جاتیں اور جہاں تک ہوسکتا اس کی امداد فرماتیں۔

حضرت عائشہ بنت محمد حرانی رحمۃ اللہ علیہا نے ۸۶ سال عمر پا کر ۷۲۶ھ میں داعی اجل کو لبیک کیا۔

بیرم بنت احمد

فن قرائت میں ماہر اس خاتون کے حالات جس کے علم کا چرچا اندلس کے علمی مراکز میں تھا

بیرم بنت احمد بن محمد دیروطیہ اندلس کی مشہور اور اہل علم خواتین میں سے تھیں جو سلطان محمد نہم کے زمانے میں ۸۳۲ھ کو غرناطہ کے ایک ذی علم خاندان میں پیدا ہوئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اندلس کی مضبوط سلطنت کی دیواریں متزلزل ہوگئی تھیں اور اسلامی حکومت کے خلاف عیسائیوں کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں زوروں پر تھیں۔ حکومت کے دروبست پر ایسے لوگ قابض ہوگئے تھے جو اسلامیت سے بھی بے بہرہ تھے اور سلطنت کے بنیادی مقاصد سے بھی نا آشنا تھے۔ لیکن اس شر میں خیر کا پہلو یہ پنہاں تھا کہ اس دور کے اندلس نے بہترین اہل علم اور عظیم دانش ور پیدا کئے اور اس ملک کی کوکھ نے ایسے لوگوں کو جنم دیا جو علم وتحقیق کے میدان میں بہت آگے نکل گئے تھے۔

بیرم کے والد احمد بن محمد، بہت بڑے صاحب علم تھے اور پورے علاقے میں قدر ومنزلت رکھتے تھے۔ دینی پیشوا اور مذہبی رہنما کی حیثیت سے مشہور تھے۔ انھوں نے اپنی اس بیٹی کی بہت اچھی تربیت کی اور اس کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی۔ ابتدائی تعلیم خود دی، اس کے بعد ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے اپنی نگرانی میں قابل اساتذہ کو مقرر کیا، جن سے انھوں نے تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ علوم کی تحصیل کی۔ علاوہ ازیں تاریخ اور اس کے متعلقات سے واقفیت بہم پہنچائی۔ کتابت اور اس کے مختلف اسالیب سے بھی یہ آگاہ تھیں۔ بعض علوم میں تو مجتہدانہ بصیرت رکھتی تھیں۔

اندلس کے بہت سے شہروں اور علمی مراکز میں ان کے علم کا چرچا تھا اور لوگ ان کے مقام ومرتبہ کی بلندیوں سے آگاہ تھے۔

انھوں نے فن قرأت میں بھی دست گاہ حاصل کی اور اس کی تحصیل کے لئے ان حضرات قراء سے رابطہ پیدا کیا جو اس موضوع پر عبور رکھتے تھے اور جنھیں اس باب میں یگانۂ روزگار مانا جاتا تھا۔

فن قرأت میں ان کے اساتذہ میں علامہ شمس بن صانع کا اسم گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہے۔علامہ موصوف کی بیٹی فاطمہ بھی علم قرأت کی ماہر تھیں۔اس فن کے حصول کے لئے ان کے سامنے بھی انھوں نے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔اس نواح میں علامہ موصوف اور ان کی صاحب زادی فاطمہ سے زیادہ اس فن کا شناور اور کوئی نہ تھا۔ان دونوں باپ بیٹی نے یہ فن ماہر اساتذہ سے نہایت محنت سے حاصل کیا تھا اور اس میں انھیں مستند مانا جاتا تھا۔

حضرت بیرم بنت احمد رحمۃ اللہ علیہا کا حلقۂ شاگردی بھی بڑا وسیع تھا۔جس طرح خود انھوں نے اپنے دور کی عظیم المرتبت شخصیتوں سے تحصیل کی،اسی طرح ان سے بھی جلیل القدر لوگوں نے اخذ علم کیا۔انھوں نے اپنے تلامذہ کو دیگر علوم کے علاوہ افتاء کے نہج واسلوب سے بھی آگاہ فرمایا اور انھیں اس مسند بلند کی نزاکتوں اور اہمیتوں سے باخبر کیا اور بتایا کہ مفتی کے فرائض نہایت اہم ہوتے ہیں۔اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کی پوری رعایت رکھے اور اپنی بنیادی ذمہ داریوں کو کسی آن نظر انداز نہ کرے۔ان کا فرمان ہے کہ جو شخص ناقص العلم،کم فہم،مغلوب الغضب، معاملات سے بے بہرہ، دوستوں اور عزیزوں کے مفاد کی رعایت رکھنے والا،فرائض کی ادائیگی میں کاہل،سنن کا تارک اور جائز و ناجائز کے بارے میں عدم احتیاط کا عادی ہو اسے اس مسند پر فائز نہیں ہونا چاہئے۔فتوے کے سلسلے میں بے احتیاطی انتہائی غلط نتائج پیدا کرتی ہے اور پھر اس کے اثرات ہمیشہ قائم رہتے ہیں اور مفتی کے بارے میں لوگ سوءظن میں مبتلا ہو جاتے ہیں،جس سے اہلِ علم و اصحاب افتاء کا وقار مجروح ہو جاتا ہے اور اس کی زد براہ راست اسلام اور اس کے نام لیواؤں پر پڑتی ہے،اس لئے وہ اپنے تلامذہ کو فتوے کے سلسلے میں خصوصیت سے محتاط رہنے کی تلقین کرتیں اور فرماتیں کہ اس مسند سے دور رہنا زیادہ

مناسب ہے۔

اپنے وطن اور قرب وجوار کے اساتذہ اور اہل فن سے تکمیل علم کے بعد مزید تعلیم کے لئے اپنے باپ احمد بن محمد دیروطیہ کے ساتھ بیت المقدس کا سفر اختیار کیا۔ وہاں خاصا عرصہ مقیم رہیں اور راس نواح کے علماء عظام سے تحصیل کی، بیت المقدس اور اس کے گرد وپیش کے اہل علم انھیں قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کی تحقیق وکاوش، تعمق وژرف نگاہی اور علم واتقا سے بہت متاثر تھے۔

وعظ ونصیحت اور پند وموعظت میں بھی انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ قیام بیت المقدس کے زمانے میں یہ عورتوں کے بڑے بڑے مجموں میں جاتیں اور ان میں وعظ کہتیں۔ ان کے وعظ نہایت اثر انگیز ہوتے۔ اپنے وعظ کو قرآن مجید کی آیات، احادیث رسول (ﷺ) آثار صحابہ، اقوال ائمہ اور بزرگان دین کے ارشادات وواقعات سے مزین فرماتیں۔ نہایت توجہ اور انہماک سے خواتین ان کا وعظ سنتیں۔

پند وموعظت اور حدیث وشروح احادیث کے سلسلے کی متعدد کتابیں انھوں نے حفظ کر رکھی تھیں مثلاً عمدۃ القاری، اربعین نووی، قصیدہ بردہ اور عقیدے وغیرہ سے متعلق امام غزالی اور ابن جوزی کی بعض کتابیں، تاریخی واقعات پر مشتمل اکثر کتب زبانی یاد تھیں اور ان میں منقول بے شمار واقعات وعظ میں پوری سند اور وثوق کے ساتھ بیان فرماتیں۔ حافظہ بہت تیز تھا اور ذہن بلا کا پایا تھا۔ اظہار وبیان کے انداز سے خوب آگاہ تھیں۔ مختلف شعراء کے بہت سے اشعار یاد تھے۔ پھر دل اخلاص کے جذبے سے بھرپور تھا۔ ان سب چیزوں نے مل کر انھیں بہترین مقرر اور واعظ بنا دیا تھا۔

ان کے مطالعہ میں زیادہ تر ریاض الصالحین، طہارۃ القلوب، رسالہ ابن ابی زیدون وغیرہ کتب رہتیں۔

اس نامور خاتون نے ۸۸۴ھ یا ۸۸۵ھ میں وفات پائی۔ عیسوی حساب سے ۱۴۸۰ یا ۱۴۸۱ بنتا ہے۔

☆☆☆

ام حکیم بنت یحییٰ اموی

وہ استاذ شاعرہ جس کے پاس اپنا کلام درست کرانے کے لئے قریش کے متعدد شعراء آتے تھے۔

ام حکیم بنت یحییٰ اموی، قریش کی خوب رو اور حسین خاتون تھیں۔ ان کا ذوق شعری بہت بلند تھا اور عرب کی بہترین شاعرات میں سے تھیں۔ ان کے بہت سے شعر لوگوں کی نوک زبان تھے اور قریش کے متعدد شاعر اپنا کلام درست کرانے کے لئے ان کے پاس آتے تھے۔ شعراء جاہلیت کے اشعار بھی انھیں یاد تھے اور وہ تمام اصناف شعر کے اچھے خاصے ذخیرے سے بہرہ ور تھیں۔

ام حکیم اموی دور کے انتہائی عروج کے زمانے کی عورت تھیں۔ بہت سلیقہ شعار، فہیم اور فکر و بصیرت کی مالک۔ ان کا زمانہ مشہور اموی خلیفہ عبدالملک کا زمانہ ہے جب کہ پرانی بہت سی قدریں نظر انداز ہو چکی تھیں اور نئی قدریں جنم لے رہی تھیں۔ پردے کی پابندی پہلے کی سی نہیں رہی تھی اور ایک جدید دنیا ابھر رہی تھی، جو اسلام کی ابتدائی تعلیمات سے آنکھیں پھیر رہی تھی اور نئے دور سے ناطہ جوڑ رہی تھی۔ اس دور میں کئی نئے علوم پیدا ہو گئے تھے، جن کی وجہ سے وقت تیزی کے ساتھ نئی سے نئی منزلیں طے کر رہا تھا۔ اسلام کی روایتی سادگی، عبادت میں دل جمعی، خدا ترسی، دوسروں سے ہمدردی اور للّٰہیت کے وہ جذبات باقی نہ رہے تھے جو اولین دور کے مسلمانوں کا خاصہ تھے اور جس کی وجہ سے مسلمان دوسروں سے ممتاز تھے۔ یہ خصوصیت نہ مردوں میں باقی رہی تھی اور نہ عورتوں میں۔ تاہم بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو اس ماحول میں رہتے

ہوئے ان اوصاف سے متصف تھے جن کا ایک سچے مسلمان میں پایا جانا ضروری ہے۔

ان لوگوں میں ایک حضرت ام حکیم بنت یحییٰ اموی تھیں جو دنیوی لحاظ سے ایک بلند مرتبت خاندان کی عورت تھیں، مگر بہت نرم طینت اور خوش طبیعت تھیں۔ مسکینوں اور غریبوں کی معاون تھیں اور یتیموں کی خیر خواہ۔ ان کا زیادہ وقت نچلے طبقے کے لوگوں میں گزرتا تھا اور مغرور و متکبر لوگوں سے نفرت کرتی تھیں۔ بے شک قادر الکلام شاعرہ تھیں لیکن حد درجہ متوازن اور نہایت منکسر المزاج۔

کہا کرتی تھیں کہ ایک بہتر ادیب اور عمدہ شاعر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ غریبوں کا مددگار اور مظلوموں کا خیر خواہ ہو۔ جو شخص ان اوصاف سے تہی ہے، وہ صحیح معنوں میں ادیب اور شاعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ ان کا قول ہے کہ جس ادیب یا شاعر کے دل میں کم زور اور مغلوب و مظلوم انسان کی ہمدردی کا جذبہ نہیں پایا جاتا، وہ اپنے کلام میں بھی صحیح معنوں میں اس جذبے کا اظہار نہیں کرسکتا۔ ظلم کو دیکھ کر اگر ادیب کا دل تڑپ نہیں اٹھتا اور شاعر اس کی مظلومیت کو الفاظ کے سانچے میں نہیں ڈھالتا تو وہ انسانیت کا دشمن ہے۔ ایسے شاعر اور ادیب سے دور بھاگنا چاہیے۔

ان کا کہنا ہے کہ شاعری انسان کو نرم دل بنا دیتی ہے اور اس کی یہ صفت ہے کہ کدورتوں کے تمام جال توڑ دیتی ہے اور شاعر الفت و مودت کا پیکر بن جاتا ہے۔ شاعر کا دل اگر محبت کی لطافتوں سے خالی ہے تو وہ شاعر نہیں بہروپیا ہے۔ شاعر جہاں الفاظ کو ایک خاص ترازو میں تول کر اور بنا سنوار کر پیش کرتا ہے، وہاں اسے اپنے قلب و ضمیر میں بھی اسی کیفیت کو پیدا کرنا چاہیے۔

ام حکیم کی شادی مشہور اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے صاحب زادے عبدالعزیز بن ولید سے ہوئی۔ عبدالعزیز خلافت بنو امیہ کی طرف سے ان دنوں مصر کے گورنر تھے اور بہت مستعد، معاملہ فہم، خوش اطوار، بلند ہمت اور کامیاب گورنر تھے۔ یہ وہی

عبدالعزیز ہیں جو معروف و نامور اموی خلیفہ جنھیں خلیفۂ راشد کہا جاتا ہے یعنی حضرت عمر کے والد تھے، جو تاریخ میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے نام سے موسوم ہیں، ان کی اس شادی کے موقعے پر ان کے دادا خلیفہ عبدالملک بن مروان نے بدرجہ غایت مسرت کا اظہار کیا تھا اور لوگوں کو انعام و عطایا سے نوازا تھا۔

اس شادی کے موقع پر متعدد شعراء نے تہنیتی اشعار کہے اور مجمع عام میں پڑھے تھے۔ علاوہ ازیں بہت سے شعراء نے عبدالملک کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے اس عظیم المرتبت پوتے کی شادی پر ہدیۂ تبریک پیش کیا اور جذبات کو اشعار کا جامہ پہنایا۔ ان شعراء میں جریر اور عدی بن رقاع خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ اس دور کے مشہور شعراء میں سے تھے اور فن شاعری میں اپنا حریف نہ رکھتے تھے۔ سب سے پہلے عدی بن رقاع، عبدالملک کے دربار میں آیا۔ اس نے مبارک باد پیش کرتے ہوئے جو شعر کہے ان میں سے چند اشعار کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

اس نے دولہا اور دولہن کی تعریف کرتے ہوئے انھیں سورج اور چاند سے تشبیہ دی اور کہا:

آج کا دن کس درجہ مسرت انگیز ہے کہ چاند اور سورج دونوں بہ یک وقت جمع ہو گئے ہیں۔ ان کا یہ التقا بے شمار سعادتوں کا پیش خیمہ ہے۔

اب پوشیدہ چیز مجسم ہو کر سامنے آ گئی ہے۔ وہ بہت ہی بلند بخت شخص ہے جسے ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔

یہ مسرف افزا گھڑیاں ہمیشہ رہیں اور خدا کرے ان میں زیادہ سے زیادہ سامانِ برکت پیدا ہو۔

اس سے زیادہ خوشی کیا ہو گی کہ اس شادی کی وجہ سے پوری دنیا پر بہجت و نشاط کا شامیانہ تن گیا ہے۔

اس کے بعد عرب کا نامور شاعر جریر آیا اور اس نے کہا:

آج امیر نے عزت وشرف کی فراوانیوں کو جمع کرلیا ہے۔ وہ بہر حالِ لائق تکریم ہے۔

خلیفہ کو مبارک ہو کہ اس نے حکمت ودانائی کو اپنے لئے پسند کرلیا ور فخر وتکریم کے عمامہ سے اپنے سر کو زینت بخشی۔

اگر عورت کو شوہر پر فخر کرنے کا حق حاصل ہے تو ام حکیم کو فی الواقع قابل فخر شوہر میسر آیا ہے۔

عبدالعزیز بلند مرتبہ انسان ہے اور اخلاق واعمال کے لحاظ سے بے مثال۔

میں اسے دل کی گہرائیوں سے اس شادی پر تہنیت پیش کرتا ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں بالکل صادق ہوں۔

اس شادی پر میں دونوں خاندانوں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ یہ جوڑا بہت بہتر اور مناسب ترین ہے۔

عبدالملک نے ان دونوں شاعروں کو دس دس ہزار درہم عطا کرنے کا حکم دیا اور ان کے تمام خاندان اور اہلِ خانہ کی سوسو ضرورتیں پوری کیں۔ علاوہ ازیں عام لوگوں اور محافظین کو دس دس دینار دیئے۔

بہر حال ام حکیم بنت یحییٰ اموی کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی گئی اور اس پر بے شمار درہم ودینار خرچ کئے گئے۔

ام حکیم بڑی خوش گوار زندگی گزار رہی تھیں کہ ان کی شادی سے کچھ عرصہ بعد عبدالعزیز بن ولید نے میمونہ بنت عبدالرحمٰن بن ابوبکر سے شادی کرلی اور وہ میمونہ کی محبت میں بری طرح گرفتار ہوگئے اور میمونہ کے کہنے سے ام حکیم کو طلاق دے دی۔ طلاق کے بعد ام حکیم نے ہشام بن عبدالملک سے شادی کرلی۔ اسی اثناء میں عبدالعزیز

کی وفات ہوگئی تو میمونہ بھی ہشام کے عقد میں آ گئی۔لیکن ہشام کو میمونہ کی نسبت ام حکیم سے زیادہ تعلق خاطر تھا۔اس لئے اس نے میمونہ کو طلاق دے دی۔یہ طلاق خود ام حکیم کی کوشش سے ہوئی، کیونکہ جب یہ دونوں عبدالعزیز کے عقد میں تھیں تو میمونہ نے عبدالعزیز سے ام حکیم کو طلاق دلا دی تھی۔اب یہی کچھ ام حکیم نے ہشام کے ذریعے میمونہ کے ساتھ کیا۔

دمشق میں ام حکیم کے نام سے اب بھی ایک بازار ہے جسے سوقِ ام حکیم کہا جاتا ہے۔کہتے ہیں یہ بڑا بارونق بازار ہے اور دمشق کی تجارت کا مرکزی مقام ہے۔

☆☆☆

خدیجہ بنت سحنون

وہ زیرک ودور اندیش خاتون جو بڑے بڑے ومشکل مسائل آن کی آن میں حل کر دیتی تھی۔

خدیجہ بنت سحون بن سعید تنوخی، تیونس کی رفیع المرتبت خواتین میں سے تھیں۔
حسن حسنی عبدالوہاب نے ''شہیرات التونسیات'' میں ان کا ذکر کیا ہے۔

وقائع نگاروں کے بیان کے مطابق ان کی ولادت ۲۰۱ سے ۲۱۵ھ تک کے درمیانی عرصے میں ہوئی۔ یہ عباسی خلیفہ مامون الرشید کی خلافت کا آخری دور تھا۔ مامون الرشید نے رجب ۲۱۸ھ میں وفات پائی اور اس کی وفات سے دوسرے دن یعنی ۱۹ رجب ۲۱۸ھ کو اس کے بھائی معتصم باللہ کی بیعتِ خلافت لی گئی۔ یہ دونوں عباسی خلفاء نہایت طاقت ور اور دور اندیش تھے۔ مامون الرشید خود بھی پڑھا لکھا تھا اور علماء کا بھی قدردان تھا۔ اس کے زمانے میں مختلف علوم وفنون نے بڑی ترقی کی۔ اس کا بھائی اور جانشین معتصم باللہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا، اس لئے جو علمی سرگرمیاں ہارون اور مامون کے زمانے میں عروج پر تھیں، اس کے زمانے میں روبزوال تھیں۔ معتصم ایک فوجی آدمی تھا اور اس کے زمانۂ خلافت میں روم، بلاد خزر، ماوراء النہر، کابل اور سیستان وغیرہ علاقوں کی طرف خوب فتوحات ہوئیں۔ قیصر روم پر بھی اس نے ایسی کاری ضرب لگائی کہ اب تک کسی مسلمان حکمران نے ایسی ضرب نہ لگائی تھی۔ جنگ روم اور فتح عموریہ میں معتصم نے تیس ہزار رومیوں کو قتل اور تیس ہزار کو گرفتار کیا، جس کی وجہ سے رومی اس سے بے حد خوف زدہ اور سراسیمہ تھے۔ یہ ایک مضبوط خلیفہ تھا، لیکن خلقِ قرآن کے بارے میں اس کے نظریات وہی تھے جو اس کے بھائی مامون الرشید کے تھے۔ اس مسئلے میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو مامون الرشید کی طرح اس نے بھی اذیتیں پہنچائیں۔ ہمیں دراصل کہنا یہ

ہے کہ جس دور میں خدیجہ بنت سحنون پیدا ہوئیں وہ مسلمانوں کی مادی ترقی کا دور تھا۔

خدیجہ بنت سحنون پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ اس دور کے مشہور اساتذہ سے انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی، شعر وشاعری کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتی تھیں، حدیث اور اس کے متعلقات پر ان کی نظر تھی۔ فہم وادراک کا اللہ نے انھیں خاص جوہر عطا فرمایا تھا۔

زیرک اور دور اندیش خاتون تھیں بڑے بڑے مشکل مسائل آن کی آن میں حل کر دیتی تھیں۔ ذہن رسا پایا تھا، جس کی کیفیت یہ تھی کہ ادھر ایک بات سامنے آئی ادھر اس کے نشیب وفراز پر قابو پالیا۔

نیکی اور تقوی شعاری میں بھی بے مثال تھیں۔ روزانہ دینی مسائل سمجھنے کے لئے لوگ ان کے پاس آتے۔ ہر وقت یاد خدا میں مشغول رہتیں۔ قرآن پر عبور تھا اور اس کا اکثر حصہ انھیں زبانی یاد تھا۔ بات بات پر قران کی آیات پڑھتیں اور اس کے مطالب کی وضاحت فرماتیں۔ فرائض کی پابند تو تھیں ہی، سنن ونوافل بھی اہتمام سے ادا کرتیں۔

فقہی لحاظ سے مالکی مکتبِ فکر کی حامل تھیں اور مسائل میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کو اہمیت دیتی تھیں۔ انھوں نے علم فقہ اپنے والد محترم سحنون بن سعید تنوخی سے حاصل کیا تھا جو مغرب میں مذہب امام مالک کے بہت بڑے حامی اور متبع تھے۔ مغرب یعنی الجزائر، تیونس اور مراکش وغیرہ میں اس زمانے میں امام مالک کی فقہ پر ہی عمل ہوتا تھا اور علماء مالکیہ اس نواح میں بڑی قدر ومنزلت کے حامل تھے۔ حضرت خدیجہ بنت سحنون بھی اس باب میں اپنے باپ سے متاثر تھیں۔ وہ فقہ مالکی کے مطابق عمل کرتی اور فہم مسائل میں اسی فقہ کو لائق اعتناء گردانتی تھیں۔ اس نواح کی تمام خواتین مسائل میں خدیجہ کی طرف رجوع کرتیں اور انہی کے فتوے کو حرفِ آخر قرار دیتی تھیں۔

خود حضرت خدیجہ رحمۃ اللہ علیہا کے والد جناب سحنون بن سعید تنوخی بیٹی کی بہت قدر کرتے تھے اور اہم معاملات میں وہ گھریلو ہوں یا علمی وفقہی، ان سے مشورہ طلب کرتے اور اسی بات پر عمل کرتے تھے جس کا یہ انھیں مشورہ دیتیں۔ والد کے نزدیک یہ

نہایت صاحب الرائے اور بہتر مشیر تھیں۔ وہ ان کی نیکی اور دین داری کو بھی بہت اہمیت دیتے اور ان کی زندگی کے اس پہلو سے متاثر تھے اور کہا کرتے تھے کہ میری یہ بیٹی پرہیزگار، ذی علم اور معاملہ فہم ہے، اور فکر و تدبیر میں سب سے آگے ہے۔ ان سے مشورہ لینے والا دھوکا نہیں کھائے گا۔

شخصیات کے بارے میں بھی خدیجہ خوب علم و آگاہی رکھتی تھیں۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ ایک شخص کا خط پڑھ کر بتادیا تھا کہ کس کردار کا مالک ہے اور اس کے رجحانات کیا ہیں۔ اس ضمن میں ان کے والد سحنون تنوخی انھیں قابلِ اعتماد سمجھتے تھے اور ان کی بات کو وزن دیتے تھے۔ ان کے والد اس نواح کے معززین میں سے تھے اور مالکی مکتب فکر میں ان کو اونچا مقام حاصل تھا۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ دار الخلافہ سے انھیں عہدۂ قضا پیش کیا گیا تو انھوں نے اس سلسلے میں اپنی اس بلند اطوار بیٹی سے مشورہ لیا۔ بیٹی نے عہدۂ قضا قبول کرنے کا مشورہ تو دیا لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ جو شخص خلیفہ کا یہ پیغام لے کر آپ کے پاس آیا ہے، اس کے تیور اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ اس سے میل جول سے احتراز کرنا چاہیے۔ سحنون بن سعید تنوخی نے یہ عہدہ تو بیٹی کے کہنے سے قبول کرلیا، لیکن اس پیغام رساں سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے۔ وہ شخص بظاہر بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا اور اس کے عام انداز گفتگو میں کوئی برائی نظر نہ آتی تھی، لیکن ایک عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے ارادے سحنون کے بارے میں اچھے نہ تھے۔

حضرت خدیجہ بنت سحنون بن سعید تنوخی کی وفات ۲۷۰ھ میں ہوئی اور انھوں نے پچپن اور ساٹھ برس کے درمیان عمر پائی۔ انھیں شہر قیروان کے باہر اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ قیروان ہی ان کا آبائی شہر تھا اور یہیں انھوں نے تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کی تھیں اور وہ اسی شہر کی خاک میں دفن کی گئیں۔

☆☆☆

بلارہ بنت تمیم

وہ معزز خاتون جس کی معاملہ فہمی اور عقل وفراست مشہور تھی اور اس سلسلے میں اس کے نواح میں اس کا کوئی حریف نہ تھا۔

بلارہ بنت تمیم بن معضر بن بادیس رحمۃ اللہ علیہا تونس کی رہنے والی تھیں اور وہاں کی مشہور اور ذی فہم خواتین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

بلارہ بنت تمیم ۴۵۰ھ کے لگ بھگ تونس کے ایک امیر اور صاحب اثر ونفوذ خاندان میں پیدا ہوئیں۔ جس مقام میں ان کی ولادت ہوئی اس کا نام مہدیہ تھا۔ ایک روایت کے مطابق یہ مقام مشہور عباسی حکمراں خلیفہ مہدی کی طرف منسوب تھا۔ ان کی ولادت کے موقع پر ان کے والد تمیم بن معضر بن بادیس نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور وفور مسرت سے بہ کثرت مال ودولت خرچ کیا۔

تمیم بڑا فیاض اور سخی تھا۔ جودت وغنایوں سمجھئے کہ اس کا پیشہ تھا۔ میل جول اور اخلاق وکردار میں بھی بے نظیر تھا۔ علم وعمل میں بھی پیش پیش تھا۔ اس دور کے تونس کے ہر حلقے میں اسے عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور سب لوگ اس کی تکریم کرتے تھے۔ معاملہ فہمی اور عقل وفراست اس نواح میں اس کا کوئی حریف نہ تھا۔ غریب سے لے کر بڑے بڑے امیر سب اس کے دروازے پر حاضری دیتے اور اس کی ہم نشینی کو بہت بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ یہ شخص بڑے متوازن اور معتدل مزاج کا مالک تھا، نہ کسی بات پر اضطراب وپریشانی کا اظہار کرتا اور نہ کسی سلسلے میں ناروا غم وغصے میں آتا۔ اعتدال اور میانہ روی اس کی وہ خصوصیت تھی جو بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

تمیم بن معز چونکہ خود بہت سے اوصاف سے متصف تھا اور عالم و فاضل تھا اس لئے اس نے اپنی لڑکی بلارہ بنت تمیم کی تعلیم و تربیت کا خاص طور سے اہتمام کیا اور اس کے لئے اس عصر کے ممتاز اور بہترین اساتذہ کو مقرر کیا۔ تمیم میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ خالص عرب تھا اور عربیت سے محبت اور لگاؤ اس کا سرمایۂ زندگی تھا، لہٰذا اس نے بلارہ کی تعلیم و تربیت بھی خالص عربوں کے انداز پر کی اور علم کے ساتھ ساتھ دین داری میں اسے پختہ تر کیا۔ تفسیر، حدیث، بلاغت، فصاحت، نحو، ادب اور شعر و شاعری وغیرہ تمام مروجہ علوم سے انھیں بہرہ ور کیا اور ہر فن کے علیحدہ علیحدہ استاذ مقرر کئے، تاکہ وہ علم کے تمام گوشوں اور ہر فن میں کامل مہارت حاصل کرلیں اور مہارت حاصل کرلی۔

علم و عمل کے علاوہ بلارہ عقل و فہم اور بصیرت و رائے میں بھی اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔ پھر علو ہمت اور شجاعت میں بھی یکتا تھیں۔ اخلاق و اتقا میں بھی انھیں اونچا مقام حاصل تھا۔ سخاوت اور غرباء پروری میں بھی شہرت رکھتی تھیں غرض یہ خاتون تمام خوبیوں کا مجموعہ اور تمام محاسن کا مرقع تھیں اور اسی وجہ سے انھیں سب حلقوں میں اکرام و اعزاز حاصل تھا۔ ان کی معاملہ فہمی کا یہ عالم تھا کہ ان کے والد اہم اور مشکل مسائل میں ان سے مشورہ لیتے اور ان کی رائے پر عمل کرتے۔

جب یہ جوانی کو پہنچیں تو بہت سے امراء اور مختلف قبائل کے سرداروں اور اہم مناصب پر فائز حکام نے ان سے شادی کی خواہش کی اور متعدد لوگوں نے اس کے لئے ان کے باپ تمیم بن معز سے درخواست کی، مگر بلارہ کا چچازاد ناصر بن علناس صنہاجی اس سلسلے میں سب سے آگے تھا اور وہ ان سے شادی کا شدید خواہش مند تھا۔ آخر اسی سے ان کی نسبت قرار پائی اور نسبت سے چند روز بعد شادی کے مراحل طے ہوگئے۔ ناصر بن علناس بہت بڑا سردار تھا اور قلعہ بنی حماد اور بجایہ کا مالک تھا۔ یہ شخص زیرک و فہیم بھی تھا اور شجاع و بہادر بھی، اور یہ شادی اس کے سیاسی مستقبل کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے

بھی ضروری تھی۔

نکاح کے وقت بلارہ کا مہر تیس ہزار طلائی دینار مقرر کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مہر فریقین کی مالی اور معاشرتی حیثیت کے مطابق مقرر کیا جاتا ہے اور یہ دونوں فریق مالی اعتبار سے خاص اہمیت رکھتے تھے، اس اعتبار سے یہ مہر بالکل موزوں تھا، لیکن مہر کی یہ پوری رقم اسی وقت ناصر نے ادا کر دی تو بلارہ کے والد نے اس خطیر رقم میں سے صرف ایک دینار اٹھایا اور باقی رقم ناصر بن علناس کو واپس کر دی۔

نکاح کے بعد ۴۷۰ھ میں بلارہ کی رخصتی عمل میں آئی اور اسے مہدیہ سے عسکر کثیف میں منتقل کیا گیا۔ باپ نے بیٹی کی رخصتی کس شان سے کی؟ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اسے بہت سے زیورات دیئے گئے اور بے حد سامان عطا کیا گیا جس میں چھوٹی موتی تمام چیزیں شامل تھیں۔ کہتے ہیں اس سے قبل اس نواح میں کوئی شادی اس شان سے نہیں ہوئی تھی جس شان سے بلارہ بنت تمیم کی شادی ہوئی۔

جس شان وشوکت سے باپ نے بیٹی کو رخصت کیا، سسرال کی طرف سے بھی اسی شان اور احترام کے ساتھ بلارہ کا استقبال کیا گیا۔ اس کے شوہر ناصر بن علناس صنہاجی نے اسے عظیم الشان محل میں ٹھہرایا اور اس کے قیام کے لئے بے حد اہتمام کیا۔ قلعہ بنی حماد اور بجایہ میں اس کے قیام کا انتظام کیا گیا اور ان کے باغات کے ایک ایک پتے کو معطر کیا گیا۔ بنی حماد کے قلعے میں ایک عمدہ ترین محل تعمیر کیا گیا جسے قصر بلارہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ افسوس کہ امتداد زمانہ اور وقت کی دست برد نے ان تمام محلات وقصور کو محو کر دیا ہے اور حالات کے ہاتھوں یہ سر بفلک عمارتیں زمین بوس ہوگئی ہیں۔

یہ واقعات مشہور مصنف حسن حسنی عبدالوہاب کی ''شہیرات التونسیات'' میں مذکور ہیں، اس کتاب میں تونس کی ان خواتین کے حالات درج کئے گئے ہیں جو کسی معاملے میں شہرت وفضیلت رکھتی تھیں، مثلاً تونس کی مفسرات، محدثات، شاعرات وغیرہ

کے واقعات حسن وخوبی کے ساتھ اس میں بیان کئے گئے ہیں۔علاوہ ازیں تونس کی ان عورتوں کے سوانح بھی اس میں درج ہیں جو فہم وفراست، عقل ودانش، فقہ واجتہاد، تصنیف وتالیف اور فصاحت وبلاغت میں ممتاز درجہ رکھتی تھیں۔

بلارہ اگر چہ اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کے سسرال بھی اس علاقے میں بہت مشہور تھے، تاہم اس خاتون کی عزت واحترام کی وجہ مال ودولت نہ تھی بلکہ اصل وجہ ان کا علم وفضل، زیرکی ودانائی وغرباء ومساکین سے تعلق تھا۔ایک خاص حلقے سے تعلق رکھنے کے باوجود یہ خاتون عوام سے براہ راست رابطہ رکھتی تھیں اور ان کے مسائل سے گہری دلچسپی کا اظہار کرتی تھیں۔

بلارہ نے ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ کر ۵۱۰ھ میں وفات پائی۔

☆☆☆

حجیتِ حدیث
تالیف
شیخ الحدیث مولانا محمد اسمٰعیل السلفی رحمہ اللہ
تخریج
محمد سرور عاصم
فتاویٰ علمیہ
المعروف
توضیح الاحکام
مکمل دو جلد
تالیف حافظ زبیر علی زئی

کتاب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر
امر بالمعروف
اور
نہی عن المنکر کا بیان
محمد اقبال کیلانی
اتباعِ سنت
اور
صحابہ وائمہ کے اصولِ فقہ
تالف: وصی اللہ محمد عباس
مدرس و مفتی مسجد الحرام، پروفیسر ام القریٰ یونیورسٹی
مکہ مکرمہ، سعودی عرب